سو تاریخی واقعات



مؤلفہ
غلام رسول مہر

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

سو تاریخی واقعات

تہذیب کے ابتدائی زمانے سے لے کر موجودہ عہد تک
انسان کی سرگزشت کی چند اہم ترین جھلکیاں

تحریر:- ولیم اے۔ ڈیوٹ
ترجمہ بہ اضافۂ ابواب: غلام رسول مہر

یونیسکو سے انعام یافتہ

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور پاکستان

Part of this book was originally written in Urdu but the rest is an authorized translation of selections from HISTORY'S 100 GREATEST EVENTS by Samuel Nisenson & William A. DeWitt. Copyright, 1954, by Grosset & Dunlap. Inc. Published by Grosset and Dunlap. Inc. New York.

بار چھٹی ۱۹۷۸ء
تعداد ۳۰۰۰
طابع .. .. .. عبدالسلام خان
مطبع .. .. .. فیروز سنز لمیٹڈ لاہور
قیمت .. .. .. ۱۲،۰۰

ناشر
فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور پاکستان

بہ اشتراک
موسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن
لاہور ، نیویارک

فہرستِ مضامین

(انگریزی سے منتخب اور مترجمہ حصّہ)

فہرستِ مضامین

(اُردُو میں خُود نوشتہ ابواب)

تمہید

انسانی تاریخ بہادری، اولوالعزمی اور ایثار کے عظیم الشّان کارناموں سے لبریز ہے۔ اس میں جوش اور ولولہ افروزی کے وہ تمام سامان موجود ہیں، جن کے لیے دُنیا طالع آزماؤں کے خیالی یا حقیقی افسانوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ تاہم ظاہر ہے کہ ان کارناموں سے آگہی کی غرض سے ہر شخص تاریخی دفتروں کی ورق گردانی کے لیے وقت نہیں نکال سکتا اور تاریخوں میں بڑے بڑے کارناموں کے علاوہ قوموں اور معاشروں کی زندگی کے عام پہلوؤں پر بھی مفصّل بحثیں آجاتی ہیں۔ اس انبار میں سے شوق انگیز اور سبق آموز واقعات کو نکالنا ایسا ہی دُشوار ہے جیسے موتی نکالنے کے لیے سمندر میں غوطہ لگانا۔

جن اصحاب کو تعلیم و تربیت دینے کے کاموں میں خاص بصیرت حاصل ہے، ان کے نزدیک تاریخ کا ذوق پیدا کرنے کی ایک صُورت یہ بھی ہے کہ ایسے واقعات چُن لیے جائیں جن سے نوعِ انسان کے چھوٹے یا بڑے طبقوں پر گہرا اثر پڑا ہو۔ ان کی تقدیریں بدلی ہوں، ان کے فکر و نظر میں تغیّر پیدا ہُوا ہو، ان کی زندگی کا دھارا نئے رُخ پر بہنے لگا ہو۔ پھر اُنھیں اختصار کے ساتھ پیش کر دیا جائے تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو زیادہ دِقّت اور محنت صرف کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور وہ ہر واقعے کی رُوح و معنویت کو اپنے اندر جذب کر لیں۔

اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ لوگوں میں تاریخ کے مطالعے کا شوق ترقّی کرے گا، اس مضمون سے دلچسپی بڑھے گی اور وہ مختصر کہانیوں سے رُوشناس ہو کر زیادہ مفصّل داستانوں کی طرف متوجّہ ہوں گے۔ اگر یہ نہ بھی ہو تو واقعات کے مختصر مرقّع کا مطالعہ اُنھیں اِتنا تو بتا دے گا کہ نوعِ انسان آغاز سے اب تک کس راستے پر چلتی رہی۔ اُسے کون کون سے بڑے مرحلے پیش آئے اور ترقّی و پیش قدمی کی عام رفتار کیا تھی۔ عوام کے لیے اتنا علم بھی ہر لحاظ سے حد درجہ قیمتی ہے۔

مسٹر ولیم اے ڈی وٹ نے تاریخِ عالم میں سے ایک سو اہم واقعات اسی غرض سے چُنے تھے اور پُورا اہتمام کیا تھا کہ انسانی سرگرمیوں کے تمام دائروں سے ضروری چیزیں لے لی جائیں، تاکہ کتاب ہر لحاظ سے جامع بن جائے۔ اگرچہ اُنھوں نے انتخاب میں متعدّد افراد اور اداروں سے بھی مدد لی، تاہم یہ انتخاب زیادہ تر مغربی اقوام کی سرگزشت تک محدُود رہا اور اس میں مشرق کی تاریخ کی طرف بہت کم توجّہ فرمائی گئی۔

پیشِ نظر کتاب میں پچاس واقعات مسٹر ڈی وٹ کی کتاب سے لیے گئے ہیں اور پچاس واقعات

مشرقی، خصوصاً مسلمانوں کی تاریخ سے منتخب کیے گئے ہیں۔ کوشش یہی رہی کہ جو واقعات لیے جائیں وہ کسی نہ کسی نقطۂ نگاہ سے خاص اہمیت رکھتے ہوں۔ ان سے انسانوں کے کسی طبقے پر گہرا اثر پڑا ہو یا پڑ سکتا ہو، نیز وہ سبق آموز ہوں اور ان کے مطالعے سے تاریخی ذوق میں بالیدگی پیدا ہو، لیکن جیسا کہ مسٹر ڈی وٹ اعتراف کر چکے ہیں، انتخاب کے سلسلے میں کوئی ایسا معیار پیش کرنا مشکل ہے، جو ہر نگاہ اور ہر مذاق کے لیے تشفی بخش ہو۔ تاہم ملاحظے سے واضح ہو جائے گا کہ انتخاب میں حتّی الامکان ان مقاصد کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے جو کتاب کی ترتیب و تالیف کے محرک ہوئے اور اپنی ناچیز بساط کے مطابق انداز بیان بھی ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ واقعات کی روح و معنویت کا ہر ضروری گوشہ روشن ہو جائے۔ یہ کتاب طلبہ کے لیے خصوصاً بے حد مفید ہے اور ترتیب و تحریر میں طلبہ ہی کا معیار قابلیت پیش نظر رہا ہے۔

اُمید ہے کہ ان تمہیدی الفاظ سے اس مرقعے کی حقیقی حیثیت بخوبی واضح ہو جائے گی۔ باقی رہا اصل مُرقع تو اس میں جو کچھ ہے وہ ایک ہی نگاہ میں ناظرین پر آشکارا ہو جائے گا۔

مجھے مسّرت ہے کہ مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن نے اپنی یہ کتاب اشاعت کے لیے میسرز فیروز سنز جیسے تجربہ کار اور خوش ذوق ناشرین کے حوالے کی جنھوں نے کاغذ، طباعت اور تصاویر کی عمدگی کا خاص اہتمام کر کے اردو کتاب کو انگریزی کتابوں کے درجے تک پہنچانے کی قابلِ تعریف کوشش کی ہے۔



بنی اسرائیل غلامی سے نجات پاتے ہیں

بنی اسرائیل مصر میں ایک لمبی مدت غلامی میں گزارنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رہنمائی میں وہاں سے نکلے اور ارضِ موعود (فلسطین) کی طرف وہ پُرآشوب سفر شروع کیا، جس میں دردناک واقعات پیش آئے اور اُنھوں نے دلیری کے کارنامے بھی انجام دیئے۔ یہ مصائبِ سفر بنی اسرائیل کی عام تاریخ کا ایک نمونہ تھے۔ آخرکار وہ ارضِ موعود میں پہنچ گئے۔ مصر سے نکلنے پر بنی اسرائیل کی قومی اور مذہبی روایات کا آغاز ہوا۔ توریت بتاتی ہے کہ اس سفر میں خدا نے حضرت موسیٰؑ کی قوم سے وہ عہد لیا تھا جسے مذہبی نوشتوں میں میثاق کہا گیا ہے۔ یہ واقعہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس سفر میں حضرت موسیٰؑ خدا کی طرف سے دس احکام لائے جن کے اخلاقی اثر کی لہریں روئے زمین کے ہر حصّے میں پہنچیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام جو مصر میں پیدا ہوئے حضرت اسرائیل (یعقوبؑ) کی اولاد میں سے تھے۔ اس زمانے میں فرعون یعنی مصر کے بادشاہ نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اُسے فوراً موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے، صرف لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ خدا جانے کتنی معصوم ہستیاں دُنیا میں قدم رکھتے ہی مُوت کی گود میں پہنچا دی گئیں۔ حضرت موسیٰؑ اس لیے بچ گئے کہ پیدا ہوتے ہی انھیں سرکنڈوں کی ایک ٹوکری میں رکھ کر دریائے نیل میں بہا دیا گیا تھا فرعون کی بیوی نے یہ ٹوکری دیکھی تو دریا سے نکلوائی اور بچّے کو اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ یُوں قُدرت نے حضرت مُوسیٰؑ کے لیے شاہی دربار کی شان و شوکت میں پروان چڑھنے کا موقع پیدا کر دیا۔

حضرت موسیٰؑ جوان ہوئے تو ایک دن آپ نے دیکھا کہ ایک مصری ایک اسرائیلی کو پیٹ رہا ہے۔ حضرت نے مصری کو ظلم سے روکنا چاہا، لیکن وہ باز نہ آیا۔ اس پر آپ نے اُسے ایک گھونسا رسید کیا اور وہ مصری وہیں گِر کر مر گیا۔ یہ ایک اتّفاقی حادثہ تھا، لیکن اس کا عام چرچا ہو گیا۔ اب حضرت مُوسیٰؑ نے یہی مناسب سمجھا کہ مصر سے نکل جائیں۔ چنانچہ آپ بحیرۂ احمر کے نزدیک ایک صحرائی علاقے

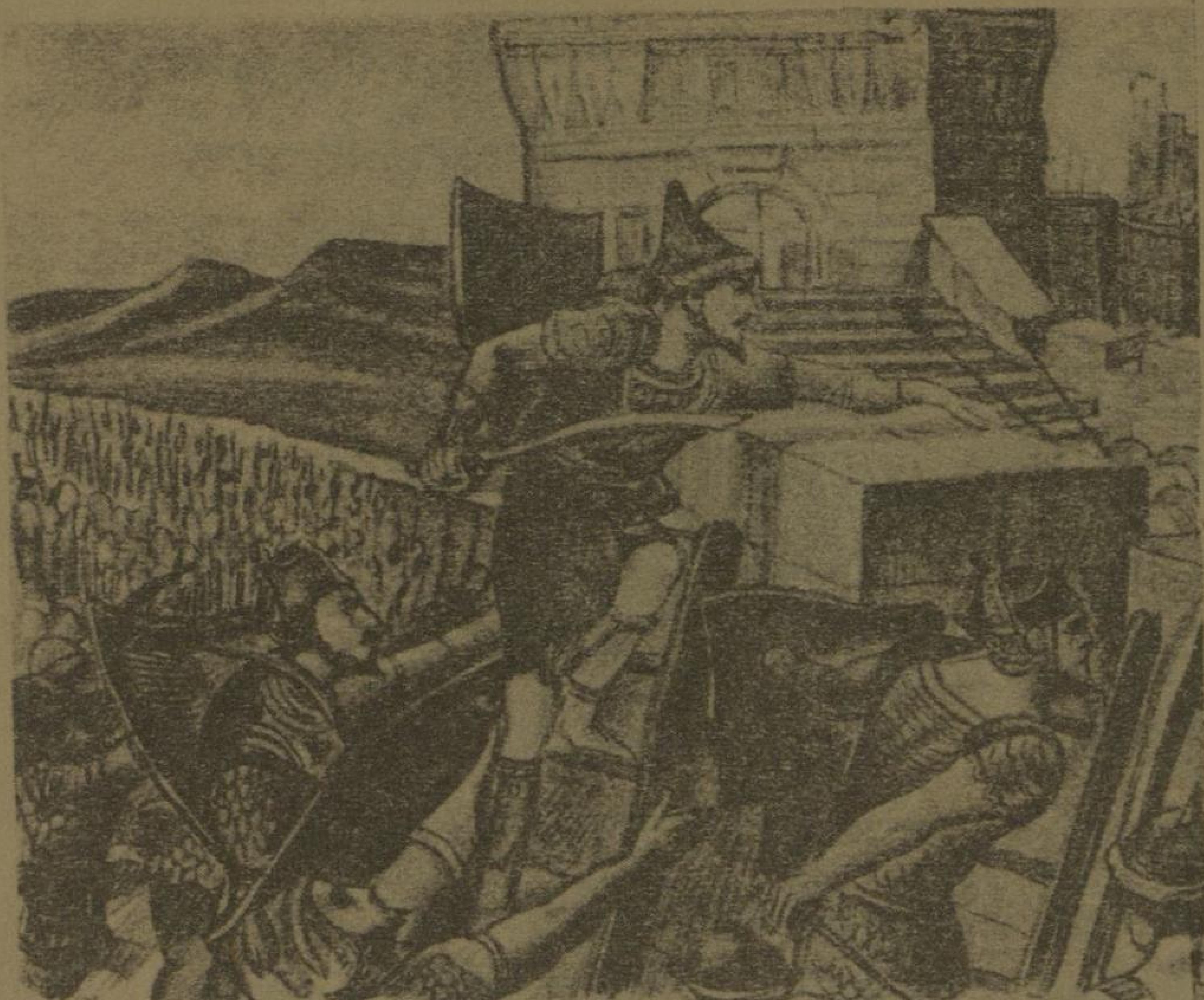
میں حضرت شعیبؑ کے پاس چلے گئے اور ایک مدت تک وہاں ریوڑ چراتے رہے۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی۔ پھر ایک "جھاڑی" سے آگ نکلنے کا واقعہ پیش آیا اور حضرت کو بشارت ملی کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلائیں گے۔ چنانچہ وہ اس غرض سے مصر واپس چلے گئے۔

مصر میں پہنچ کر اُنھوں نے اپنے بھائی ہارونؑ کی امداد سے بنی اسرائیل کو جمع کر لیا لیکن فرعون نہ تو بنی اسرائیل کو ذلّت کی زندگی سے نجات دینے کے لیے تیار تھا اور نہ اُنھیں مصر سے جانے کی اجازت دیتا تھا۔ جب خُدا کے حکم سے مصر میں یکے بعد دیگرے دس وبائیں نازل ہوئیں تو فرعون نے مجبور ہو کر اجازت دے دی۔ مگر بنی اسرائیل کا قافلہ روانہ ہوا تو فرعون کی نیت پھر بدل گئی۔ اس نے لاؤ لشکر لے کر بنی اسرائیل کا تعاقب کیا اور ان کے پیچھے پیچھے بحیرۂ قلزم کے کنارے پہنچ گیا، تاکہ اُنھیں روکے یکایک خُدا کی قدرت سے ایسی ہوائیں چلیں کہ پانی کے اُترنے سے سمندر میں راستہ پیدا ہو گیا اور بنی اسرائیل سلامتی کے ساتھ پار اُتر گئے، لیکن جب فرعون ان کے پیچھے پیچھے چلا تو پھر موجیں آگئیں اور وہ لاؤ لشکر سمیت ڈوب گیا۔

مصر سے باہر نکل آنے پر بھی بنی اسرائیل کی آزمائش کا دَور ختم نہ ہوا۔ وہ ایک نسل تک صحرا میں سرگرداں پھرتے رہے۔ ان کے درمیان اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ مگر خدا کے ساتھ جو عہد ہو چکا تھا، اس کی پابندی اور حضرت موسیٰؑ کے لائے ہوئے احکام کی پیروی نے بے خانماں بنی اسرائیلیوں کا شیرازہ بکھرنے نہ دیا۔

حضرت موسیٰؑ نے وادیٔ اُردن کے سامنے ایک پہاڑ پر وفات پائی۔ اس وقت تک بنی اسرائیل ارضِ موعود میں داخل نہ ہُوئے تھے، لیکن حضرت موسیٰؑ اس پر مطمئن تھے کہ ان کی قوم میں مصیبتوں اور آزمائشوں کو صبر سے برداشت کر لینے اور ایمان پر قائم و استوار رہنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ انھیں خصوصیتوں کو قومی زندگی کا جوہر سمجھا جاتا ہے۔

توریت (کتاب "الخروج") کی رُو سے مذکورہ بالا واقعات پندرھویں صدی قبل مسیح میں پیش آئے۔ جدید تحقیقات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔



سائرس بابل پر قابض ہوتا ہے

زمانۂ قدیم میں بحیرۂ رُوم کے آس پاس تین بڑی تہذیبوں نے نشوونما پائی: ایک مصری تہذیب، دُوسری ہتّی تہذیب اور تیسری وادیٔ دجلہ و فرات (عراق) کی تہذیب، جو سب سے زیادہ پُرانی تھی۔ اِس تہذیب کا آخری بڑا مرکز بابل تھا۔ بابل کے بہادر سپاہی بارہا حملہ آوروں کے سیلاب کا رُخ پلٹ چُکے تھے، لیکن اکتوبر ۵۳۹ ق م میں ان کی مرکزی حکومت کو جنگ کے بغیر سائرس کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

سائرس نے میڈیا اور پارس کو متحد کرکے جس سلطنت کی بُنیاد ڈالی، وہ اس تیزی سے اُبھری کہ بابل کے بادشاہ نابونی دس کو اس کا صحیح اندازہ ہی نہ ہوسکا۔ ابتدا میں وہ خوش تھا کہ میڈیا کی بادشاہی ختم ہوگئی جو مُدّت سے بابل کی دُشمن چلی آتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پارس کی نئی قوت کو زک دینا مشکل نہ ہوگا۔ اس نے مصر، لیڈیا، سپارٹا وغیرہ کو ملا کر مقابلے کے لیے ایک متّحدہ محاذ بھی قائم کرلیا تھا، لیکن متّحدہ ایرانی قبائل نے بابل کے تمام حلیفوں کو آناً فاناً تتر بتّر کر ڈالا۔ سائرس نے ۵۴۶ ق م میں پہلے لیڈیا کو فتح کیا۔ پھر بحیرۂ رُوم کے کنارے کی تمام یونانی نوآبادیاں لے لیں۔ نابونی دس نے بھی بابل کے شمال میں شکست فاش کھائی۔ اس کے بعد بابل والوں کے لیے مقابلے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ چنانچہ اُنھوں نے دب کر سیروس کی اطاعت قبول کرلی۔ بے شک قتل و آتش زنی کے وہ واقعات پیش نہ آئے، جو ڈیڑھ سو سال قبل نینوا کے بادشاہ سناشرب کے ہاتھوں پیش آ چُکے تھے۔ شہر تباہی سے محفوظ رہا، مگر اس کی عظمت ماضی کا افسانہ بن کر رہ گئی۔

اہلِ بابل بڑے ہوشیار اور ذہین لوگ تھے۔ ان کے فنونِ لطیفہ کا اثر مصر تک پہنچا۔ علمِ ہندسہ میں ان کے کمالات اعلیٰ درجہ کی قلعہ بندیوں اور آبپاشی کے وسیع

سلسلوں میں نمایاں تھے۔ فنِ تعمیر میں ان کی برتری کی شہادت عالی شان مندروں سے ملتی ہے۔ انھیں کاروبار کا بھی بڑا ملکہ تھا۔ ان کے بعض تجارت پیشہ خاندان قصبوں اور شہروں میں اقتدار کے مالک بن گئے تھے۔ بابل میں علم کی بہت قدر ہوتی تھی۔ وہاں حضرت مسیح علیہ السلام سے ایک ہزار سال پیشتر کتب خانوں کی بُنیاد رکھی گئی۔ سن عیسوی سے دو ہزار سال پہلے بادشاہ حمورابی نے بابل میں ایک عظیمُ الشّان سلطنت قائم کی اور وہ مجموعۂ قوانین جاری کیا جس نے عالمگیر شہرت پائی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس مجموعۂ قوانین میں مختلف جُرموں کے لیے جُرمانے، جلاوطنی، بلکہ دردناک موت تک کی سزائیں درج تھیں، لیکن سزائے قید کے لیے کوئی دفعہ نہیں رکھی گئی تھی۔

دوآبہ دجلہ و فرات کے سپاہی بھی بڑے دلیر اور ہُنرمند تھے۔ ان کے پاس قلعہ شکن آلات تھے۔ وہ قلعہ بندیوں کو سُرنگیں لگا کر اُڑا دیتے تھے۔ سڑکیں اور پُل بنانا جانتے تھے اور نویں صدی قبل مسیح میں اُنھوں نے رسالہ بھی تیار کر لیا تھا، لیکن سائرس کے سوار تیر اندازوں کا مقابلہ کوئی نہ کر سکتا تھا۔ بابل کے رسالے بے کار ہو کر رہ گئے اور پیادہ فوج لڑائی میں سرگرم حصّہ لینے سے پیشتر ہی تباہ ہو گئی۔

بابل کے علاوہ سائرس نے شام، فلسطین، مشرقی ایران، قبرص اور ایشیائے کوچک کے آس پاس کے تمام یونانی جزیرے مسخّر کر لیے۔ چنانچہ ۵۱۹ ق م تک دُنیا کے تمام مہذب ممالک اس کے باجگزار بن چکے تھے۔ اولوں کی طرح تیر برسانے اور آندھی کے مانند تیز چلنے والے سواروں نے ایک روشن دماغ سپہ سالار کی ماتحتی میں اس سلطنت کی طرح ڈالی، جو اس دُنیا میں غالباً پہلی شہنشاہی تھی۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اہلِ ایران لڑائیوں میں بھی بڑے ضبط سے کام لیتے تھے اور مفتوحین کے ساتھ ان کا برتاؤ بھی اچھا تھا۔ وہ دُوسرے مذاہب سے رواداری برتتے اور مفتوحہ ملکوں کے باشندوں کو اُونچے عہدے دیتے۔ عوام کی مادی بہبود کا خاص خیال رکھتے اور ظالمانہ ٹیکس نہ لگاتے۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ دُنیا کو ایک مرکز پر جمع کر دیا جائے اور سب کے ساتھ اچھّا سلوک کیا جائے۔ اس وسیع سلطنت کے باشندوں میں ایرانی قومیّت کے ذریعے سے یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ ایک عالمگیر سلطنت کے افراد ہیں۔ ان سے پیشتر بابل، مصر اور ہتّیوں کی فتوحات کا مقصد لُوٹ مار کے سوا کچھ نہ تھا۔ بابل کی اس فتح کے بعد بنی اسرائیل کو جو قید کر کے فلسطین سے لائے گئے تھے، دوبارہ اپنے وطن جانے کی اجازت ملی۔





مہاتما بدھ کو نروان حاصل ہوتا ہے

اہلِ سیلون کا دعویٰ ہے کہ ان کے ملک میں دنیا کا سب سے زیادہ پرانا درخت موجود ہے۔ یہ اسی درخت کی شاخ کاٹ کر لگایا گیا تھا جس کے نیچے سدھارتھ گوتم کو عرفان کی روشنی ملی تھی اور اس نے بدھ یعنی بہت بڑے عارف کا لقب حاصل کیا تھا۔ وہی روشنی بدھ مت کی محرک بن گئی۔

سدھارتھ گوتم (غالباً چھٹی صدی قبل مسیح میں) اس گھرانے میں پیدا ہوا جس میں دولت کی ریل پیل تھی اور عیش و عشرت کے تمام سامان موجود تھے۔ شادی کو نو سال گزر چکے تھے اور ایک بچّہ بھی پیدا ہو چکا تھا، جب اس کے دل میں دکھیا انسانیت کے لیے دردمندی کا جذبہ بیدار ہوا اور زندگی کی گہری حقیقتیں دریافت کرنے کی طلب پیدا ہوئی۔ وہ گھر بار چھوڑ کر ان رشیوں اور منیوں کے پاس پہنچا جو دنیا سے الگ تھلگ پہاڑوں کی تنہائی میں زندگی گزار رہے تھے۔ یہ رشی اور منی علم اور نجات کی تلاش میں برت رکھتے، کڑی ریاضتیں کرتے اور اپنے جسموں کو زیادہ سے زیادہ مشقتوں میں ڈالتے۔ گوتم نے ان کے تمام طور طریقے آزما دیکھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ لوگ بھی سچائی کا راستہ گم کیے بیٹھے ہیں۔

انھیں چھوڑ کر وہ جگہ جگہ سرگرداں پھرتا رہا۔ آخر دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہیں زندگی کی حقیقت ایک روشنی کی شکل میں اس کے سامنے نمودار ہوئی۔ بنارس میں اسے چیلوں کی ایک جماعت مل گئی، جن کی مدد سے اس نے ہندوستان کے طول و عرض میں اپنی تعلیمات پھیلائیں۔

اگرچہ بدھ دھرم پورے ہندوستان کو ہندومت کے اثر سے نہ نکال سکا۔ تاہم برما، سیلون، کمبوڈیا، تھائی لینڈ، چین اور جاپان میں بے شمار لوگ گوتم کے پیرو موجود ہیں اور اس کے حلم نیز زندگی اور عقائد کی پاکیزگی نے کروڑوں انسانوں کو متاثر کیا ہے۔

مہاتما بدھ نے جو اعتدال کا راستہ دکھلایا، اس کا منشا یہ تھا کہ نہ تو انسان کو نفسانی خواہشات کا غلام بن جانا چاہیے اور نہ یہ کہ خواہشوں کو بالکل مار دینا چاہیے، بلکہ ان پر قابو پانا چاہیے۔ اس نے چار سچائیوں کی تعلیم دی۔ وہ کہتا ہے کہ اوّل تسکینِ نفس کی خواہش، دوم مادّی فائدوں کی خواہش اور سوم بقائے دوام کی خواہش سے رنج و الم پیدا ہوتا ہے۔ چوتھی سچائی یہ ہے کہ انسان رنج سے پاک ہو کر روح کی تسکین کے لیے صحیح اصول اور صحیح اعمال کو اختیار کرے۔ روح کی اسی کامل تسکین کو اہلِ ہند "نروان" کہتے ہیں۔



دُنیا میں پہلی جمہوریت قائم ہوتی ہے

حضرت مسیح علیہ السلام سے پانسو دس سال پہلے یُونان کی مشہور ریاست ایتھنز کا مطلق العنان حاکم ہپیاسؔ[1] وطن چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا اور دُنیا میں پہلی بڑی جمہوری حکومت نے جنم لیا۔

حکیم سولن نے ۵۹۴ ق م میں ایتھنز کے لیے جو دستورِ حکومت بنایا تھا، وہ کھیتی باڑی اور کاروبار کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہُوا لیکن سیاسی اختیارات پُرانے اُمراء ہی کے قبضے میں رہے۔ اس سے ان کے درمیان کھینچ تان اور کشاکش نے ایسی صُورت اختیار کر لی کہ لوگ تنگ آ گئے۔ جب ۵۶۰ ق م میں تمام معاملات کی باگ ڈور ہپیاس کے باپ کو سونپی گئی تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس انتظام سے ایتھنز خوشحال ہو گیا۔ اس کی مالی حالت بہتر ہو گئی۔ لیکن اہلِ ایتھنز جلد ہی مطلق العنان شخصی حکومت سے تنگ آ گئے۔ اُمراء میں سے کلیس تھینز[2] نام ایک شخص نے انقلاب کا پرچم بلند کیا اور مطلق العنانی کا دور ختم کر دیا۔ اب کلیس تھینز ہی کو نئی حکومت کا نظام تیار کرنے کا ذمّہ دار بنایا گیا۔ اس کے سامنے دو ضروری کام تھے: اوّل یہ کہ امراء کے خاندانوں پر قابو پانے کا بندوبست کرے، دُوسرے یہ کہ آیندہ مطلق العنانی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑے۔

اُمراء کی قوّت تو پہلے ہی شخصی حاکموں نے گھٹا دی تھی، اُدھر ان کے دور میں تجارت اور علم و فن کی ترقّی نے قومیت کا احساس اس درجے پر پہنچا دیا کہ خاندان اور قبیلے کے رشتے خاصے کمزور ہو گئے۔ کلیس تھینز نے شہری حقوق کا دائرہ وسیع کر دیا۔ تجارتی طبقے اور آزاد کیے ہوئے غلام بھی ان حقوق سے شاد کام ہوئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ رائے دہی کے لیے قصبوں اور ضلعوں کے حلقے بنا دیئے گئے۔ اس طرح پُرانی قبائلی تقسیم کی پہلی حیثیت جاتی رہی اور اس کی جگہ نئی آبادیوں نے لے لی جنھیں یُونانی میں "ڈیمی" کہتے تھے۔ اسی سے "ڈیماکریسی" یعنی حکومتِ عوام کا لفظ نکلا ہے۔

اور بھی کئی نئے انتظامات وجود میں آئے۔ بہرحال کلیس تھینز نے درمیانی طبقے کے لوگوں کو

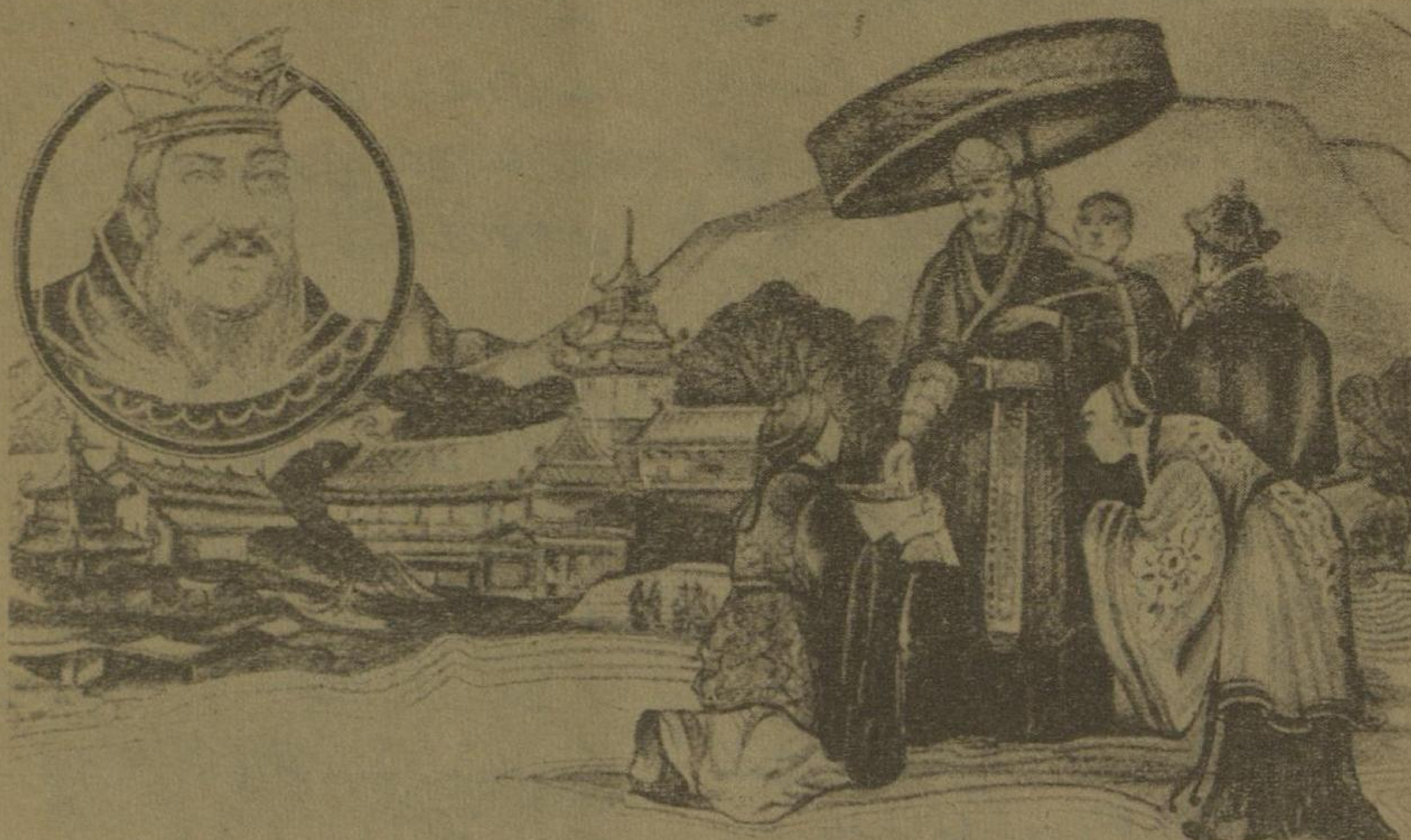
---

[1] Hippias -۱ [2] Cleisthenes -۲

رائے دہی کا زیادہ حق دار قرار دیا اور ایتھنز کے نظم ونسق میں ایسی تبدیلی کر دی کہ رائے دہی نے قابل توجہ حیثیت اختیار کر لی۔ اس کے باوجود غلامی باقی رہی اور غلاموں کو نئے جمہوری نظام میں شامل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔

مطلق العنانی کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے ایک عجیب طریقہ تجویز کیا گیا، یعنی وقتاً فوقتاً شہریوں سے رائے لی جاتی کہ آیا کوئی شخص اتنے اثر ورسوخ کا مالک تو نہیں بن گیا جو ریاست کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا ہو! جس شخص کو کم از کم دس ہزار شہری خطرناک قرار دیتے، اسے دس سال کے لیے جلاوطن کر دیا جاتا، لیکن نہ اُسے غدار سمجھا جاتا، نہ مجرم۔ جب وہ مقررہ مدت پوری کر کے لوٹتا تو اسے جائداد اور تمام شہری حقوق واپس مل جاتے۔ ابتدا میں اس قاعدے کو بڑی احتیاط سے استعمال کیا جاتا تھا، مگر بعد میں یہ بگڑتے بگڑتے سیاسی گروہ بندی کا انتقامی حربہ بن گیا اور بالآخر پانچویں صدی عیسوی میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ جمہوری حکومت کا بالکل ابتدائی خاکہ تھا اور اس میں خامیاں تھیں پھر بھی تاریخ میں یہ نئے دور کا سنگِ میل ثابت ہوا اور ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک قائم رہا۔ اگرچہ ایتھنز کی نوآبادیاں چھن گئیں، اس کی تجارت اور دولت ختم ہو گئی، بحیرۂ رُوم کی دُوسری طاقتیں اثر واقتدار میں منزلوں آگے نکل گئیں، لیکن جمہوریہ ایتھنز کی عظمت کا احترام سب کے دلوں میں قائم رہا اور آج بھی مہذب دنیا اسی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے، جس کا تصوّر اڑھائی ہزار سال پیشتر ایتھنز والوں کے ذہن میں آیا تھا۔

یونان سے دُنیا نے علوم وفنون سیکھے اور ہم اب تک جتنی تاریخی معلومات حاصل کر سکے ہیں۔ ان سے یہی پتا چلتا ہے کہ پہلا جمہوری نظام، یُونان ہی میں قائم ہوا تھا، مگر وہ بالکل ابتدائی خاکہ تھا اور اس لحاظ سے صحیح جمہوری نظام نہیں کہا جا سکتا کہ یونان میں بسنے والے تمام لوگوں کو یکساں حقوق حاصل نہ تھے۔ صحیح اور حقیقی جمہوریت وہی ہو سکتی ہے جس میں سب لوگوں کا درجہ یکساں ہو۔ دیکھیں دُنیا اس نصبُ العین تک کب پہنچتی ہے اور بڑی طاقتوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے جو تسلّط قائم کر رکھا ہے، وہ کب ختم ہوتا ہے۔



کنفیوشس مثالی حکمران کی تلاش میں نکلتا ہے

مشہور چینی حکیم کنفیوشس دُنیا کے بہت بڑے داناؤں اور بزرگوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ پانچویں صدی قبل مسیح کے آغاز میں ایک ایسے شخص کی تلاش میں اپنے وطن (لو' صوبہ شانتنگ) سے نکلا جو اس کے بتائے ہُوئے اصُول کے مطابق حکمرانی کے لیے تیار ہو۔ اُس وقت کنفیوشس کی عمر پچپن سال کی تھی۔ وہ تیرہ برس اپنے دیس سے باہر رہا۔ دُنیا کی سیاسی تاریخ میں جلا وطنی اختیار کرنے کا یہ ایک نہایت ہی عجیب اور حددرجہ نتیجہ خیز واقعہ

کنفیوشس ان تیرہ برس میں جن جن حکمرانوں سے ملا، ان سب نے آؤبھگت میں تو کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، لیکن حکمرانی کے جو طور طریقے اس زمانے میں رواج پا چکے تھے، اُنھیں چھوڑنے کی حامی کسی نے بھی نہ بھری۔ گویا کنفیوشس کی تلاش بالکل ناکام رہی، لیکن حقیقت پر نظر رکھی جائے تو یہ ناکامی نوع انسان کے لیے عموماً اور اہل چین کے لیے خصوصاً بہت بڑی برکت کا باعث ہوئی۔ اس کی وجہ سے سیاسیات کی طرف سے کنفیوشس کے دل میں بیزاری پیدا ہوگئی اور اس نے زندگی کے آخری دور اس کام کے لیے وقف کر دیئے جس سے ان گنت انسانوں کو فائدہ پہنچا اور خود اسے بھی شہرت عام، بلکہ بقائے دوام حاصل ہوگئی۔

کنفیوشس کے والدین اتنے غریب تھے کہ اس کے لیے تعلیم کا کوئی انتظام نہ کر سکتے تھے، مگر اس کا شوقِ علم ہر مشکل سے عہدہ برآ ہوتا رہا۔ بائیس سال کی عمر تک وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ ایک درسگاہ جاری کرے، جس کی طرف قوم کے اکثر ممتاز نوجوان

کھنچے چلے آتے تھے۔

عمر کی پختگی کے ساتھ اس کے سیاسی نظریات بھی نشوونما پاتے رہے۔ آخر اس نے معلوم کر لیا کہ حکمرانی کے اختیارات کیونکر استعمال کرنے چاہئیں اور عوام کے ساتھ تعاون کے صحیح طریقے کیا ہیں۔

اس کی عمر باون سال کی تھی جب اسے چنگتو کا صدرِ عدالت بنا دیا گیا۔ کنفیوشس کے لیے اپنے اصول کے عملی تجربے کا یہ نہایت اچھا موقع تھا۔ چنانچہ نتیجہ حیرت انگیز نکلا۔ عوام کے طور طریقے تھوڑی ہی مدت میں بہت بہتر ہو گئے۔ بعد ازاں ریاست ریاست میں محکمہ جرائم کا وزیر بنا تو جرائم کا نام و نشان تک مٹ گیا اور عام لوگ اس کی انتہائی عزت کرنے لگے۔

ہمسایہ ریاستوں کو خوف پیدا ہوا کہ اگر کنفیوشس کا اصلاحی نظام اسی طرح کامیاب رہا تو وہ سارے ملک کا حاکم بن جائے گا، لہٰذا انھوں نے 'لو' کے بادشاہ کو اصلاح کے راستے سے ہٹانے اور کنفیوشس سے برگشتہ کرنے کے لیے انھیں عیش و عشرت کی ترغیب دی۔ یہ کوششیں بار آور ہوئیں۔ لوگ اپنے مایۂ ناز حکیم اور اس کی تعلیمات سے غفلت برتنے لگے۔ تب کنفیوشس نے دیس کو چھوڑ کر جلاوطنی اختیار کی۔

تیرہ سال باہر گزار کر لوٹا تو اس کی خدمت میں بڑے بڑے عہدے پیش کیے گئے، لیکن اس نے ہر پیشکش ٹھکرا دی اور الگ تھلگ بیٹھ کر تعلیم دینے یا کتابیں لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ریاست 'لو' ان برکتوں سے محروم ہو گئی جو کنفیوشس کی حکمرانی میں اسے حاصل تھیں، لیکن اس نقصان کے بدلے میں چین ہی کو نہیں، بلکہ ساری دنیا کو فلسفہ و حکمت اور تاریخ و ادب کی بیش بہا دولت مل گئی۔ چین میں ڈیڑھ ہزار سال پیشتر سے جو کچھ لکھا گیا اور ہوتا رہا، کنفیوشس نے اسے مرتب کر دیا۔ اگر یہ کام انجام نہ پاتا تو دنیا ان حالات سے بالکل بے خبر رہتی۔

کنفیوشس نے آسمانی الہام کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ وہ افراد اور قوم کو اچھے اخلاق سکھاتا تھا۔ اس کی حکیمانہ باتیں کروڑوں چینیوں کی نوکِ زبان ہیں اور انھیں چین کی بہت قیمتی علمی میراث سمجھا جاتا ہے۔





میراتھان میں یونان شاندار فتح حاصل کرتا ہے

میراتھان یونان میں ایک چھوٹا سا میدان ہے جو صرف پانچ میل لمبا اور دو میل چوڑا ہے۔ اس کے ایک طرف سمندر ہے اور باقی تین پہلوؤں کو پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ ۴۹۰ ق م کے موسم بہار میں اسی مقام پر ایرانیوں اور یونانیوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں ایرانیوں نے تعداد میں چھ گنا ہونے کے باوجود شکست کھائی۔

جب ایران کے شہنشاہ دارا گشتاسپ کی فتوحات کا سکہ ایشیا میں رواں ہو چکا تو اس نے یونان کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا جو اس زمانے میں اوج شہرت پر پہنچا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ایک سپہ سالار کو چھ سو جہازوں کا بیڑا، چالیس ہزار سے ساٹھ ہزار تک سوار اور بے شمار پیادہ فوج دے کر یونان بھیجا۔ ایرانی جہاز میراتھان میں لنگر انداز ہوئے، جہاں سے ایتھنز تک دو راستے جاتے تھے اور فاصلہ چوبیس میل سے زیادہ نہ تھا۔

جو یونانی فوج مقابلے میں آئی، وہ دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ایرانی میراتھان کے میدان میں خیمہ زن ہوئے اور یونانی پہاڑوں پر راستہ روکے بیٹھے تھے۔ ایرانی سپہ سالار نے چند روز تک کوئی حرکت نہ کی لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کی سوار فوج کو پہاڑی راستے طے کر کے ایتھنز پہنچنا مشکل ہوگا تو بیس ہزار سپاہ کو میراتھان میں چھوڑا اور باقی کو جہازوں پر سوار کرا کے ایک اور بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا جو ایتھنز سے بہت قریب تھی۔

اب یونانیوں نے فیصلہ کر لیا کہ ایرانیوں پر ہلہ بول دینا چاہیئے۔ یونانی سپہ سالار ملٹیاڈیز نے لڑائی کا جو منصوبہ تیار کیا اس سے بعد ازاں بڑے بڑے سپہ سالار کام لیتے رہے۔ یونانیوں کے پاس بڑی بڑی ڈھالیں اور لمبے لمبے نیزے تھے۔ ملٹیاڈیز نے دائیں اور بائیں بازو کو خوب مضبوط کر لیا اور قلب

Miltiades

کو کمزور رکھا۔ لڑائی شروع ہوئی تو ایرانیوں نے قلب ہی پر حملہ کیا، جو پیچھے ہٹا اور ایرانی آگے بڑھے۔ اس اثنا میں یُونانی فوج کے بازوؤں نے پُوری ایرانی فوج کو نرغے میں لے لیا اور قتلِ عام شروع کر دیا۔ چھ ہزار چار سو ایرانی کھیت رہے، باقی بھاگ کر جہازوں پر سوار ہو گئے۔ اب یُونانی تیزی سے کوچ کرتے ہُوئے ایتھنز کے سامنے پہنچ گئے، تاکہ ایرانیوں کے نئے حملے کی روک تھام کر سکیں۔ ایرانی سپہ سالار نے یہ مستعدی دیکھی تو لنگر اُٹھائے اور واپس چلا گیا۔ دس سال میں مزید تیاری کر کے پھر ایک بڑا یونان آیا جس نے سلامس کی جنگ میں یونانیوں سے شکست کھائی۔

ایک چھوٹے سے ملک کا بہت بڑی سلطنت کے مقابلے میں یُوں کامیابی حاصل کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا واقعہ ہے، لیکن میراتھان کے ساتھ بعض نہایت ولولہ خیز یادیں وابستہ ہیں۔ جنگِ میراتھان میں ایرانیوں کی شکست کے بعد ایک یونانی بہادُر ایتھنز کی طرف دوڑا اور کسی مقام پر دم لیے بغیر شہر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ وہ بے چارا لڑائی میں حصّہ لینے کے باعث تکان سے چور ہو رہا تھا۔ اس پر چوبیس میل کا پہاڑی راستہ دوڑ کر طے کیا۔ آخر طاقت جواب دے گئی۔ اپنے اہلِ وطن کو صرف یہ پیغام پہنچا سکا کہ "جشن مناؤ، ہمیں فتح حاصل ہوئی" اس کے بعد گرا اور دم توڑ دیا۔

یونانیوں نے اولمپیائی کھیلوں میں اس بہادُر یونانی کی دوڑ کو بھی شامل کر لیا۔ چنانچہ جب اِن کھیلوں کا انتظام ہوتا تو لمبی دَوڑ کا مقابلہ بھی کیا جاتا تھا، جسے "میراتھان" کی دَوڑ کہا کرتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں اولمپیائی کھیل از سرِ نو شروع ہوئے تو اس دَوڑ کا بھی انتظام کیا گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس دوڑ میں ایک یُونانی کسان ہی سب سے اوّل رہا۔ اُس نے یہ لمبی دَوڑ دو گھنٹے پچپن منٹ اور بیس سکینڈ میں پُوری کی۔





سکندر دُنیا فتح کرنے کے لیے نکلتا ہے

ایرانی ایک مُدّت تک تنخواہ دار یُونانی سپہ سالاروں کی عقل و دانش اور یُونانی سپاہیوں کی قوّتِ بازو سے فائدہ اُٹھاتے رہے لیکن اربیلہ (اربل) کے میدان جنگ میں پانسا پلٹ گیا۔ یُونانی عقل و دانش کی برتری سکندر کی شکل میں اور یُونانی قوّتِ بازو کی برتری مقدونیہ کے سپاہیوں کی شکل میں بروئے کار آئی۔ اب یُونانی یہ مقصد لے کر اُٹھے تھے کہ ایرانی سلطنت کو پاش پاش کر کے دم لیں گے اور وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔

اس جنگ کی کہانی ۳۳۱ ق م کے اس دن سے بہت پہلے شروع ہوتی ہے جب فریقین کے درمیان آخری فیصلے کے لیے تصادم کی نوبت آئی تھی۔ سکندر (ولادت ۳۵۶ ق۔م) کی پرورش ہی اس آرزو کی آغوش میں ہوئی تھی کہ ایرانی قوت کو درہم برہم کیے بغیر چین نہ لے گا۔ سولہ سال کی عمر میں جب اسے پہلے پہل ایک لشکر کا سالار بنایا گیا تو یہ گویا ایرانیوں کو شکست دینے کی راہ میں اس کا اوّلین قدم تھا۔ وہ بیس سال کا تھا کہ اس کے باپ نے وفات پائی اور مقدونیہ کے تاج و تخت کے لیے جنگ چھڑ گئی۔ یہ ایرانیوں کو شکست دینے کی راہ میں دُوسرا قدم تھا۔ غرض اس نے سپارٹا کے سوا یُونان کی تمام شہری ریاستوں کو اپنا حلیف بنایا اور ۳۳۴ ق۔م میں تیس چالیس ہزار جنگجوؤں کے ساتھ ہیلس پانٹ کو عبُور کر کے ایشیا میں داخل ہو گیا۔

ایرانی بیڑا بحیرۂ ایجہ میں موجُود تھا۔

تاجدار دارا کے لیے مناسب یہ تھا کہ پیچھے ہٹ جاتا، تاکہ سکندر کا راستہ لمبا ہو جاتا اور اسے ضروری چیزیں بہم پہنچانے میں مشکلات پیش آتیں، لیکن قدیم زمانے میں جوانمردی کا تقاضا یہی سمجھا جاتا تھا کہ اپنی جگہ قائم رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے اور دست بدست لڑائی میں بھی تامل نہ کیا جائے۔ سکندر کی یہ انتہائی خوش نصیبی سمجھنی چاہیئے کہ ایشیا میں

پہنچتے ہی ایرانی رسالے سے مقابلہ پیش آیا اور اس رسالے نے دریائے گرینی کس کے کنارے شکست کھائی۔

اس کامیابی کے بعد سکندر نے بحیرۂ روم کا ساحلی علاقہ مسخّر کر کے ایرانی بیڑے کو بالکل بیکار کر دیا۔ یہ ہو چکا تو ایرانیوں نے شام کے شمالی علاقے میں اسوس کے مقام پر سکندر سے جنگ کی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے ایرانی رسالے کی نقل و حرکت میں مشکلات پیش آئیں۔ ایرانی سوار سکندر کی پیادہ فوج سے عہدہ برآ نہ ہو سکے اور انھیں پھر شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

سکندر نے شکست خوردہ ایرانیوں کا تعاقب نہیں کیا، بلکہ اپنے تیار کئے ہُوئے نقشۂ جنگ کے مطابق پیش قدمی کرتا رہا اور شام، فونیقیہ، فلسطین اور مصر کی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح پُورے ساحل پر تسلّط کر کے ۳۳۱ ق۔م کے موسم بہار میں اس نے آخری فیصلہ کن لڑائی کے لیے قدم اٹھایا۔ دارا نصف سلطنت دے کر صلح کرنے کے لیے تیار تھا۔ سکندر نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ دراصل وہ بابل کی قدیم سلطنت کے زرخیز خطّے کا خواہاں تھا جو دو سو سال سے ایرانیوں کے قبضے میں چلا آتا تھا۔ دارا اس خطّے کے شمال میں اربیل کے قریب ٹھہرا ہُوا تھا۔ اس کے سواروں اور پیادوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے کم نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں یونانی سپاہی صرف سینتالیس ہزار تھے۔

میدان ویسے بھی ہموار تھا، مگر دارا نے اسے اور ہموار کرا لیا، تاکہ ایرانی رسالے اور جنگی رتھوں کو نقل و حرکت میں آسانی رہے۔ سکندر نے صف بندی کرتے وقت اپنے سواروں کو میمنہ پر رکھا۔ جب ایران کے جنگی رتھوں نے یونانی رسالے پر حملہ کیا تو یونانی تیر اندازوں نے تاک تاک کر رتھ چلانے والوں کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا۔ اس طرح جب ایران کے جنگی رتھوں میں افراتفری پھیل گئی تو سکندر کا جو رسالہ اور پیادہ دستے میمنہ پر موجود تھے انھوں نے ترچھے ہو کر میسرے کی طرف پیش قدمی کی اور اس جیش پر پیچھے سے دھاوا بول دیا جو دارا کی حفاظت کر رہا تھا۔ دارا بھاگ نکلا اور ایران کی جس فوج کو شکست دینا غیر ممکن سمجھا جاتا تھا، وہ تباہ ہو گئی۔

ایران کی فتح کے بعد سکندر ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور جہلم کے قریب راجہ پورس کو شکست دی۔ وہ دریائے بیاس سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ مگر فوج نے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ سندھ اور بلوچستان کے راستے عراق کے شہر بابل میں واپس آیا، جسے اپنا مرکز حکومت بنانا چاہتا تھا۔ یہیں تینتیس برس کی عمر (۳۲۳ ق۔م) میں اس نے وفات پائی اور اس کے ساتھ ہی تمام دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ درہم برہم ہو گیا۔ لیکن اربیل کے میدان میں اس کی فوج نے یُونان کا جو نقش قائم کیا تھا، وہ صدیوں تک ایشیا پر اثر انداز رہا۔



قرطاجنہ سرنگوں اور رومہ سربلند ہوتا ہے

جب رُومی لشکروں نے قرطاجنہ (کارتھیج) کی شہر پناہ کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا تو انھوں نے دُنیا کی ایک ایسی حکومت کا خاتمہ کر دیا جس نے تاریخ میں سب سے اوّل زیادہ تر تجارت کے بل پر ہمہ گیر اقتدار حاصل کیا تھا۔ اس افریقی سلطنت کا آغاز کاروبار میں ہنرمندی کی بنا پر ہُوا تھا۔ اس کی بے اندازہ دولت و ثروت نے رُومہ کے دل میں رقابت کی آگ بھڑکا دی اور یہی جذبۂ رقابت افریقی سلطنت کی تباہی کا باعث بنا۔

فونیقی ملّاحوں نے حضرت مسیح علیہ السلام سے ہزاروں سال پہلے لیبیا کے باشندوں سے تجارتی تعلقات پیدا کر لیے تھے اور ان کا تجارتی مرکز شمالی افریقہ کے ساحل پر موجودہ ٹیونس کے قریب واقع تھا۔ خود قرطاجنہ (کارتھیج) کی بنیاد صور کی ملکہ دیدو نے ۸۵۰ ق م میں رکھی۔ مشہور ہے کہ ملکہ نے اتنی زمین خریدی جتنی ایک بیل کی کھال کے اندر آ جائے۔ سودا ہو چکا تو کھال کے باریک اور لمبے ٹکڑے کاٹ کر بہت بڑا علاقہ گھیر لیا۔ اس میں وہ پہاڑی بھی شامل تھی جس پر قلعہ تعمیر ہُوا۔ اہل قرطاجنہ کی تجارت تیزی سے پھیلتی گئی اور اُسے اتنا فروغ حاصل ہُوا کہ چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں قرطاجنہ بحیرۂ رُوم کی ملکہ بن گیا۔ اس نئی کاروباری سلطنت نے یونانیوں کی مخالفت کے باوجود سسلی اور ساحل ہسپانیہ پر نوآبادیاں قائم کر لیں، بلکہ آبنائے جبلِ طارق سے آگے بڑھ کر اوقیانوس کے افریقی ساحل پر بھی تجارتی مرکز بنا لیے۔

قرطاجنہ کو سسلی کے مقبوضات پر رُومہ کی اُبھرتی ہوئی قوّت سے جنگ پیش آئی (۲۶۸ ق م۔ ۲۴۱ ق م) جسے تاریخ میں قرطاجنہ کی پہلی جنگ قرار دیا جاتا ہے۔ جزائر ایجہ کی لڑائی میں فیصلہ کُن شکست کے باوجود قرطاجنہ کی نفع آور تجارت میں کمی نہ آئی۔ اس نے ہسپانیہ کی کانوں سے دھاتیں نکالیں۔ وسطی افریقہ سے اسے حبشی غلام، ہاتھی دانت، مختلف معدنیات اور جواہرات ملتے تھے جنھیں یونان، اٹلی اور سسلی کی منڈیوں میں فروخت کیا جاتا تھا۔ شہر کے اردگرد کی زرخیز

زمین میں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ اس طرح قرطاجنہ کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی اور اس کی اقبال مندی کا پرچم ابھی لہرا رہا تھا کہ رُومہ سے دوسری جنگ پیش آئی (۲۱۸ ق م – ۲۰۱ ق م)۔

اہل قرطاجنہ کے سامان جنگ میں ہاتھی نمایاں تھے، لیکن ان کی اصلی فوقیت سپہ سالار ہنی بال کی جنگی ہنرمندی میں مضمر تھی۔ اگرچہ سمندر رومیوں کے زیرِ اقتدار تھا اور خشکی پر ان کی برتری مسلم تھی، بایں ہمہ ہنی بال نے ۲۱۸ ق م میں کوہستان ایلپس کو عبور کر کے شمالی اٹلی پر قبضہ جما لیا اور دس سال تک یہ قبضہ قائم رکھا۔ رُومی مقابلے میں بڑی بڑی فوجیں لائے، لیکن ہنی بال نے اُنھیں جھیل تھراسی مین[1]، کنائے[2] اور کاپوا[3] میں پے در پے شکستیں دیں۔ اس کی رسد رسانی کا راستہ قابلِ اعتماد نہ تھا لہٰذا وہ مجبور تھا کہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں مقبوضہ علاقے سے حاصل کرے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود وہ رومیوں کی چالوں کو ناکام بناتا اور اُنھیں نیچا دکھاتا رہا، یہاں تک کہ شہر رُومہ کا راستہ صاف ہوگیا۔ اگر ہنی بال کے ہم وطن حکمران اس موقع پر امداد سے ہاتھ نہ کھینچ لیتے تو اغلب تھا کہ وہ رومہ کو فتح کر لیتا۔

اس اثنا میں دو اور مصیبتیں آئیں۔ اوّل جو فوج ہنی بال کی امداد کے لیے آ رہی تھی وہ راستے میں تباہ ہوگئی، دُوسرے ہنی بال کا رومی حریف فیصلہ کن جنگ کو بہت دن ٹالتا رہا جس کی وجہ سے انجام کار ہنی بال کو ناکامی ہوئی۔ بایں ہمہ اس دُوسری جنگ میں ہنی بال نے جو کارنامے انجام دیئے ان کی وجہ سے وہ ممتاز سپہ سالاروں کے اس گروہ میں شامل ہوگیا جنھیں بقائے دوام کا خلعت ملا۔

قرطاجنہ نے ۲۰۱ ق م میں ہتھیار ڈال دیئے۔ رُومہ نے اس کا انتظام ہنی بال کے ہاتھ میں رہنے دیا تھا مگر وہ خفیہ خفیہ قرطاجنہ کی پہلی عظمت بحال کرنے میں لگا رہا۔ جب رُومیوں کو اس کے ارادوں کا علم ہوگیا تو ہنی بال شہر چھوڑ کر بھاگ نکلا لیکن آخر میں گھر گیا تو خودکشی کر لی۔

اپنی شان و شوکت سے بہت کچھ محروم ہو جانے کے باوجود قرطاجنہ والوں نے دوبارہ سنبھالا لیا اور تجارت میں فروغ حاصل کرنا شروع کیا، جس سے رُومی حکّام کے دلوں میں پھر حسد اور خوف پیدا ہوگیا۔ چنانچہ ۱۴۹ ق م میں رومی لشکر نے بہانہ تلاش کر کے قرطاجنہ پر دھاوا کر دیا۔ شہر کی آبادی پانچ لاکھ سے زیادہ تھی۔ اس میں سے صرف پچاس ہزار لوگ زندہ بچے جنھیں غلام بنا کر بیچا گیا۔ شہر کو آگ لگا دی گئی اور اس کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔

۱- Thrasimene ۲- Cannae ۳- Capua



سیزر کو موت کے گھاٹ اُتارا جاتا ہے

۱۵ مارچ ۴۴ ق م کو رومہ کے ایوان اعلیٰ میں جولیئس سیزر جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ قاتلوں میں سیزر کا دوست بروٹس بھی شامل تھا۔ جب بروٹس نے اُسے خنجر مارا تو سیزر نے اپنے آخری سانس کے ساتھ اُسے یہ کہہ کر ملامت کی کہ "اے بروٹس تو بھی"! شکیسپیر کے قلم نے اس منظر کو بقائے دوام کا لباس پہنا دیا ہے۔ دراصل یہ منظر ماضی کی تاریکی میں ایک ممتاز نشان ہے اور یہ اس کشمکش کی ایک ڈراماتی تمثیل ہے، جو دُنیا میں اب تک جاری ہے، رومہ کی تاریخ میں اس کا آخری فیصلہ نہیں ہُوا۔

سیزر کے خلاف قتل کی سازش کرنے والے لوگ رومہ کے جمہوری نصب العین پر کامل یقین رکھتے تھے اور اس امر کے ہرگز روادار نہ تھے کہ تمام اختیارات سمٹ کر سیزر کی ذات میں جمع ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیزر کے قتل کو وہ اہمیت حاصل ہوئی جو عام سیاسی جرائم کو نصیب نہیں ہوتی۔ سازشیوں کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ سیزر محض شہنشاہ ہی نہیں، بلکہ دیوتا بن جانا چاہتا ہے۔ اور یہ خطرہ خالی از حقیقت نہ تھا، لیکن رومہ شاہنشاہی کے راستے پر گامزن ہو چکا تھا۔ چنانچہ سیزر کی موت بھی اس کا رُخ نہ پلٹ سکی۔ آگسٹس اور بعد کے رومی شاہنشاہ اس انداز میں تاج و تخت کے مالک بنتے رہے، گویا سیزر قتل نہ ہُوا تھا، بلکہ زندہ چلا آتا تھا۔

سپہ سالار کی حیثیت سے جولیئس سیزر کی شُہرت تاریخ عسکریت کے اوراق پر ثبت ہو چکی ہے۔ اس شہرت کا ایک سبب وہ تحریریں ہیں، جن میں اس نے گال (فرانس) کی مہمات تفصیل سے بیان کی ہیں۔ یہ تحریریں حُسنِ بیان کا ایسا نمونہ پیش کر رہی ہیں جس سے بہتر نمونہ اب تک دُنیا کے سامنے نہیں آسکا۔ سیزر نے وحشی جرمن قبیلوں کو مسخر کیا، ہسپانیہ اور ایشیا میں اپنی

ماہرانہ سپہ سالاری کا ثبوت دیا۔ پھر وہ برطانیہ پر حملہ آور ہوا۔ اس کی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کا زمانہ صرف چار سال رہا۔ اس مدّت میں روما جو سالہا سال سے سیاسی کشمکش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سیزر نے اسے نظم و امن کی دولت بخشی۔ بیشتر صوبوں کے حکمران اپنے سوا کسی کے رُوبرُو جواب دہ نہ تھے۔ سیزر نے صوبائی حکومتوں کا نظام درست کر کے روما کو تمام اختیارات کا مرکز بنایا۔ اس نے کاروبار اور زراعت کی ترقی کے لیے مفید اقتصادی تدبیریں اختیار کیں۔ سیاسیات میں وہ برابر "حزب عوام" سے وابستہ رہا۔

قدرت نے اسے نظم و نسق کی غیر معمولی صلاحیت عطا کی تھی۔ اس کا عزم یقیناً یہی تھا کہ دنیا کا زیادہ سے زیادہ حصّہ سلطنت رُوما میں شامل کرے۔ لیکن یہ کام وہ جمہوری طریقوں سے نہیں کرتا تھا۔

قتل کی سازش کرنے والے لوگ سیزر کی جنگی یا انتظامی قابلیت کے منکر تھے نہ اس کی خدمات کے، جو سیزر نے اپنے دورِ اقتدار میں انجام دی تھیں اور ان کے اعلیٰ نتیجے ہر طرف سب کو نظر آرہے تھے۔ انھیں یہ بھی خیال تھا کہ سیزر کو مزید مہلت مل گئی تو اس سے ملک اور قوم کو بڑا فائدہ پہنچے گا، لیکن جمہوری حقُوق ان کی نگاہوں میں تمام مذکورہ بالا چیزوں سے زیادہ قیمتی تھے۔ لہذا انھیں یہ خطرہ پریشان کر رہا تھا کہ اگر آج یہ حقوق سیزر کی وجہ سے پامال ہو گئے تو پھر ان کے بحال ہونے کی کوئی صُورت باقی نہ رہے گی۔





یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجتی ہے

۱۳۵ء میں شاہ ہیڈرینؒ[1] کے رُومی لشکر نے یروشلم کو بالکل تباہ و تاراج کر ڈالا۔ اس سے پیشتر بہت سے دشمنوں نے ایسی کوششیں کیں، مگر انھیں پُوری کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس مرتبہ شہر کا ملاً برباد کر دیا گیا۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی عمارت بھی سلامت نہ رہی اور یہودیوں کے نام حکم جاری ہو گیا کہ وہ آئندہ کبھی اس شہر میں واپس نہ آئیں۔

یروشلم کی تاریخ پتھر کے دَور سے شروع ہوتی ہے۔ دُنیا کا کوئی دُوسرا شہر پیش نہیں کیا جا سکتا، جس کی سرگزشت اس درجہ ہنگامہ خیز اور دردناک ہو۔ ہمارے پاس تینتیس صدیوں کا تاریخی سرمایہ موجود ہے اس اثنا میں یہ شہر بارہ زلزلوں کا نشانہ بھی بنا، جنھیں قدرت کے تھپیڑے قرار دینا چاہیے۔ ان کے علاوہ کم و بیش بیس مرتبہ اسے ناکہ بندیوں اور محاصروں سے سابقہ پڑا۔ دو مرتبہ ایسی بُری طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بجی کہ مدّتِ دراز تک یہاں کے حالات کا کوئی سُراغ ہی نہ ملا۔ اٹھارہ مرتبہ اسے تقریباً نئے سرے سے تعمیر کرنا پڑا۔ چھ مرتبہ اس کے باشندوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا۔

اس کی ہنگامہ خیز تباہی کا ایک واقعہ ۷۰ء میں پیش آیا۔ ۴ ق م میں شاہ ہیرود اعظم مرا۔ اس کے بعد مختصر وقفوں کو چھوڑ کر یہودیہ پر رومی گماشتے ہی حکومت کرتے رہے۔ نظم قائم رکھنے میں ان کی مشکلات بڑھتی گئیں۔ دیہاتی علاقے کا چپہ چپہ ڈاکوؤں سے معمور تھا۔ مذہبی اختلافات کی بنا پر قتل اور خونریزی کا سلسلہ روز افزوں تھا۔ ایک بار جب یہودیوں نے رومی سپاہیوں کے ایک دستے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تو رومی شاہنشاہ نیرو کو سخت تادیبی کارروائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ویسپیسینؔ[2] اور ٹائٹسؔ[3] رومی لشکر لے کر آئے اور ملک میں سَیل کی طرح پھیل گئے۔ تین

۱- Hadrian ۲- Vespasian ۳- Titus

سال کے دوران میں بڑے ہولناک واقعات پیش آئے اور بالآخر یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ مقدس ہیکل کو بھی آگ لگا دی گئی۔ یہ یہودیوں کی سلطنت کے خاتمے کا رسمی اعلان تھا۔

یروشلم کا محاصرہ جاری تھا کہ یوحنان بن زکائی نام ایک یہودی نے رومی جرنیل سے اجازت لے کر یبنہ[1] میں ایک ربی درسگاہ قائم کی۔ اسے یقین تھا کہ خواہ مقدس ہیکل آگ کی نذر ہو جائے، لیکن جب تک یہودیت کی تعلیم کا سلسلہ باقی ہے، اسے کوئی قوت مٹا نہیں سکتی اور مقدس توریت بدستور یہودیوں کے وطن کا نام زندہ رکھے گی خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں منتقل ہو جائیں۔

جو یہودی گروہ، یہودیہ مصر یا طرابلس میں لڑ رہے تھے، ان کی بیخ کنی کر دی گئی فلسطینی یہودیوں کی تقدیر پر آخری مہر اس وقت لگی جب شاہنشاہ ہیڈرین نے ۱۳۲ء میں یہودیت کو خلاف قانون قرار دے دیا یہودیوں نے برکوکبا کو مسیح قرار دے کر تین سال بہادرانہ جنگ جاری رکھی، لیکن ان کی کامیابی کی کوئی اُمید نہ تھی۔ یروشلم ۱۳۵ء میں مسخر ہوا تو حکم دے دیا گیا کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ جس جگہ شہر آباد تھا، وہاں کھیتی باڑی شروع کر دی گئی۔ اس وقت سے بیسویں صدی تک یہودی روئے زمین پر آوارہ وطن ہو کر ٹھوکریں کھاتے رہے۔

یروشلم کی عظمت اور شان کا پہلا دور وہ تھا جب یہ شہر حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کا مرکز تھا۔ اس دور کی ہر قابل ذکر عمارت بخت نصر شاہ بابل نے تباہ کر ڈالی، یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا بنایا ہوا مقدس ہیکل بھی باقی نہ چھوڑا۔ اس کی مغربی دیوار کے پتھر عام روایت کے مطابق ملبے کے نیچے باقی رہ گئے تھے، جن سے رلپٹ کر رونا یہودیوں کے نزدیک ایک خاص عبادت بن گیا تھا۔ کورش شہنشاہ ایران نے شہر اور ہیکل کو ازسر نو تعمیر کرنے کا حکم دیا مگر یہ شہر دوبارہ سنہء میں تباہ ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ تعمیر ہوا تو شاہنشاہ ہیڈرین نے حکم دے دیا کہ یہودیوں کو نکال دیا جائے اور شہر کو رومیوں کا ایک مرکز بنا دیا۔ آگے چل کر رومی شہنشاہوں نے مسیحیت قبول کر لی تو یہودیوں پر اس وقت بھی پابندیاں باقی رہیں، بلکہ ان پر زیادہ سختیاں ہونے لگیں۔ جب فلسطین کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ آئی تو ہیکل کی جگہ مسجد تعمیر ہوئی۔ مگر یہودیوں اور عیسائیوں کو زیارتوں کی عام اجازت مل گئی۔

امن اور خیر سگالی کی اس فضا میں خلل اس وقت پیدا ہوا جب یورپ نے صلیبی جنگیں شروع کیں۔ اس دور کے خاتمے پر صدیاں گزر گئیں تو پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کا دروازہ کھول دیا۔ اس وقت سے جو فتنہ پیدا ہوا اس کی وجہ سے پورے مشرق قریب کا امن خطرے میں پڑا ہوا ہے۔

۱۔ اس مقام کو حضرت یوشع کی کتاب میں "یبنی ایل" کہا گیا ہے یعنی خدا کا بنایا ہوا۔ یہ یافا سے گیارہ میل جنوب میں تھا۔ رومیوں کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی کے زمانے میں یبنہ یا یبنی ایل یہودیہ کا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا۔



مشرق میں نئے رومہ کی بُنیاد پڑتی ہے

رومی سلطنت کا مرکز ابتدا سے رومہ چلا آتا تھا۔ ۱۱ رمئی ۳۳۰ء کو برّاعظم یورپ کے جنوب مشرقی کونے میں اسی سلطنت کا ایک نیا مرکز قائم ہوُا جس نے قسطنطنیہ کے نام سے شہرت پائی اور ایک ہزار سال تک اسے دُنیا کا اوّلین شہر ہونے کا فخر حاصل رہا۔ اس کا سرکاری نام "نیا رومہ" رکھا گیا تھا، قسطنطنیہ اس کا دُوسرا نام ہے۔

مرکز کی اس تبدیلی کے کئی اسباب تھے، مثلاً:

۱۔ اس کا محلِ وقوع بہت اچھّا تھا۔

۲۔ شاہ قسطنطین نے مسیحی کلیسا سے اتحّاد کا جو رشتہ جوڑا تھا اُسے استوار رکھنے کے لیے نئی فضا ہی سازگار تھی۔

۳۔ اگرچہ یورپ کی وحشی اقوام کے اندر بھی بے چینی کی لہریں دَوڑ رہی تھیں، لیکن رُومی سلطنت کو اصل خطرہ ایران کی طرف سے تھا، جو مشرق کی طرف واحد عظیم الشّان مہذّب سلطنت تھی اور رومی شاہنشاہوں کو آئے دن اس سے مقابلے پیش آتے رہتے تھے۔

۴۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ سلطنت کی دولت اور آبادی کا سب سے بڑا مرکز مشرق ہی تھا۔

۵۔ ۳۳۰ء سے سلطنت میں مزید توسیع کی کوئی ضرورت نہ رہی تھی اور اصل کام یہ رہ گیا تھا کہ جو علاقے قبضے میں تھے، ان کی حفاظت اور تنظیم کی جائے۔

۶۔ مرکز کی حیثیت میں رومہ کی اہمیت بہت پہلے سے رُو بہ زوال تھی۔ اس لیے کہ وہاں کی مجلسِ اعیان یا عوام کو اب کوئی اختیار حاصل نہ رہا تھا۔ قسطنطین سے پہلے شہنشاہ ڈائیوکلیشین[1] نے بھی بہتر انتظام کے خیال سے سلطنت کو دو

۱۔ Diocletian

حصّوں میں تقسیم کرنا چاہا تھا۔ اب قسطنطین نے تقسیم کے ساتھ ہی مسیحیت کو سرکاری مذہب بھی بنا دیا۔

آبنائے باسفورس کے جنوبی گوشے میں جہاں قسطنطنیہ آباد ہوا، ایک ہزار سال، بلکہ اس سے بھی پیشتر بیزنطیم آباد تھا اور یہ جگہ جنگی نقطۂ نگاہ سے اتنی اہم تھی کہ یونان کی شہری ریاستیں اسے قبضے میں لانے کے لیے مدت تک لڑتی رہیں۔ بلاشبہ اس کا موقع اور محل نہایت اہم تھا۔ اس کے جنوب میں بحیرۂ مارمورا اور شمال میں باسفورس کی ایک شاخ چار میل تک چلی گئی ہے، جسے اب شاخِ زرّیں کہتے ہیں۔ بحیرۂ اسود سے بحیرۂ روم تک جا بجا تنگنائیں ہیں جن سے کسی دشمن کا سلامت گزرنا بہت مشکل ہے۔ روما کی طرح اس جگہ بھی سات پہاڑیاں تھیں جن پر شہر آباد ہوا۔ پہاڑیوں اور سمندر نے مل کر شہر کی طبعی حفاظت کے ایسے انتظامات کر دیئے تھے جنھیں توڑنا آسان نہ تھا۔

مغربی رومی سلطنت آہستہ آہستہ وحشی اقوام کے قبضے میں جاتی رہی اور مشرقی رومی سلطنت کے مرکز کی اہمیت بڑھتی گئی۔ ۴۷۶ء میں مغربی سلطنت بالکل ختم ہو گئی۔ اس کے بعد قسطنطنیہ ہی یونانی و رومی تہذیب کی روایات کا حامل رہ گیا۔ اس نے یورپ کے وحشیوں اور ایرانیوں کے حملے روکے، پرانے فنون کی سرپرستی کی، تجارت کو ترقی دی اور مسیحیت کی اس شاخ کے لیے نشوونما کا سامان بہم پہنچایا جو "کلیسائے مشرقی قدیم" کہلاتی ہے۔

حکومت کے دونوں مرکزوں کے درمیان سیاسی اختلافات کی طرح مذہبی اختلافات بھی بڑھتے گئے۔ آخر مسیحیت دو بڑی شاخوں میں بٹ گئی۔ ایک مشرقی شاخ، دوسری مغربی شاخ۔ گیارھویں صدی کے وسط تک قسطنطنیہ بڑی بڑی ایشائی قوتوں کے مقابلے میں یورپ کا پشتیبان بنا رہا۔ تجارت میں اسے سب پر برتری حاصل تھی۔ اس کے اثر و رسوخ کا اصل راز یہ تھا کہ وہ ایک پرانی میراث کا محافظ تھا۔ اس میں رومی قانون نہ صرف محفوظ رہا، بلکہ جسٹینین کے مجموعہ قوانین نے اس قانون کو تکمیل کی آخری منزل پر پہنچا دیا۔ قسطنطنیہ سے یونانی علوم مغربی یورپ میں پہنچے اور احیائے علوم کی روشنی کے لیے ابتدائی سروسامان فراہم ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی رومی سلطنت میں یونانیت زیادہ سے زیادہ فروغ پاتی رہی اور جسٹینین کے بعد یونانی یہاں کی سرکاری زبان بن گئی۔

قسطنطنیہ ساتویں صدی سے پندرھویں صدی کے وسط تک مختلف یورشوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح عثمانی نے اسے فتح کر لیا اور سلطنت روما کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔



رومہ وحشیوں کے قبضے میں جاتا ہے

رومہ نہ ایک دن میں تعمیر ہُوا تھا اور نہ ایک دن میں فنا کے گھاٹ اُترا، لیکن یورپ سے رومی شہنشاہی کا ناپید ہونا اتنا عظیم سانحہ تھا کہ "سقوطِ رومہ" کا جملہ سُنتے ہی چشمِ تصور کے سامنے ایک نہایت خوفناک نقشہ اُبھر آتا ہے۔ گویا بے درد وحشی اس شہر کی دولت و حشمت کے انبار سمیٹ کر اسے آگ اور خون کی جولانگاہ بنا رہے ہیں، حالانکہ دراصل رومہ کی عظمت آہستہ آہستہ زائل ہوئی تھی۔ مؤرخوں نے سہولت کے خیال سے اس کی تسخیر کا آخری سال ۴۷۶ء قرار دیا ہے، کیونکہ اسی سال مغربی رومی سلطنت کے شہنشاہ نے اپنا تاج و تخت وحشی سردار اوڈوآسر[1] کے حوالے کیا جس نے شہنشاہ نہیں، بلکہ صرف اٹلی کی فرمانروائی پر اکتفا کیا۔

یہ مت سمجھیے کہ جنگلی قبیلے کسی بیرونی سردار کے زیرِ قیادت اچانک رومہ پر چڑھ آئے تھے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رومی سلطنت کے پہلے شہنشاہ آگسٹس کے زمانے ہی میں ان قبائل کو اٹلی میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ عرصے تک سلطنت کے لیے جنگجو سپاہی بھی مہیا کرتے رہے اور اُونچے درجے کے سرکاری عہدے بھی حاصل کرتے رہے۔ آڈوآسر نے ان قبائلی سپاہیوں سے اٹلی کے ایک تہائی علاقے کا وعدہ کر کے سرداری کا منصب حاصل کر لیا۔ رومی شہنشاہ کو جب یقین ہو گیا کہ وہ اس کے مقابلے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو عافیت اسی میں سمجھی کہ تخت چھوڑ کر الگ ہو جائے۔ ادھر قسطنطنیہ کے شہنشاہ زینو[2] نے اگرچہ آڈوآسر کی حکومت تسلیم نہ کی، تاہم اسے معزول کرنے کے لیے بھی کوئی قدم نہ اٹھایا اور اس کے لیے وہی خطاب استعمال کرتا رہا جو مغربی رُومی سلطنت میں خاندانی امیروں کا عام لقب تھا۔

مشرقی گاتھوں کے سردار تھیوڈورک[3] نے آڈوآسر کو میدانِ جنگ میں شکست فاش دی اور صلح اس شرط پر ہوئی کہ دونوں مشترکہ طور پر حکومت کا کاروبار جاری رکھیں۔ پھر تھیوڈورک نے آڈوآسر کو دعوت میں بُلا کر اپنے ہاتھ سے اس کا سر قلم کر دیا۔

مغربی رومی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ یورپ قسطنطنیہ کے اثر سے نکل کر وحشی اقوام کے تسلط میں آ گیا، تاہم آگے چل کر اُسے موقع مل گیا کہ اپنی مخصوص تہذیب کو نشو ونما دے۔

۱- Odoacer ۲- Zeno ۳- Theodoric



شارلمین رومی سلطنت کا تاج پہنتا ہے

بعض مؤرخوں کا خیال ہے کہ شارلمین[1] (چارلس اعظم۔ ولادت ۷۴۲ء وفات ۸۱۳ء) مغربی رومی سلطنت کا تاج پہننے کا خواہاں نہ تھا اور نہ اس تاج پوشی پر خوش ہوا۔ شاہ فرانس کی حیثیت میں اس نے ایک وسیع اور پائدار سلطنت کی بنیادیں استوار کر لی تھیں۔ رومی شاہنشاہی نے اس کی قوت میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہ کیا، بلکہ نظری اعتبار سے دیکھا جائے تو اس نے زوال پذیر شاہنشاہی نظام کے اندر بہ حیثیت مجموعی مشرقی شاہنشاہ کے مقابلے میں کمتر حیثیت قبول کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مغربی شہنشاہی کا لقب مدت سے کارکنانِ سلطنت کے بجائے کلیسائے رومہ کے لیے زیادہ مفید مطلب ہو گیا تھا۔

بہر حال شارلمین ۸۰۰ء میں رومہ پہنچا۔ بظاہر اس کی غرض یہ تھی کہ پوپ لیو[2] سوم کے طرزِ عمل کی چھان بین کے لیے بشپوں کا جو کمیشن مقرر ہوا تھا، اس کے کام کا جائزہ لے۔ شارلمین تین ہفتے رومہ میں ٹھہرا رہا۔ کمیشن نے لیو کو تمام الزامات سے بری قرار دیا اور شارلمین نے اس فیصلے کی تصدیق کر دی۔

دو روز بعد اسی پوپ کے ہاتھوں شہنشاہی کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا۔ اس کے بعد مشرقی سلطنت کے ساتھ شرطیں طے کرنے کا مسئلہ چھڑ گیا۔ شارلمین نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ مشرقی سلطنت کی ملکہ آئرین[3] اس سے شادی کر لے اور اس طرح دونوں سلطنتیں متحد ہو جائیں مگر اس اثنا میں ملکہ آئرین کو تخت سے اُتار دیا گیا اور نیسی فورس[4] مشرقی سلطنت کا شاہنشاہ بن گیا۔ اب دونوں سلطنتوں کی سرحدوں کے بارے میں لڑائی چھڑ گئی۔ ایڈریاٹک میں ایک بحری جنگ بھی پیش آئی۔ آخر شارلمین کو جھکنا پڑا اور ۸۱۲ء میں دونوں سلطنتوں کی مساوی تقسیم عمل میں آ گئی۔

اطالوی قبیلوں میں سے لمبارڈ[5] پاپایت کے سب سے بڑے دشمن تھے اور وہ مشرقی شاہنشاہی کے حامی سمجھے جاتے تھے۔ شارلمین شاہنشاہ بننے سے پچیس برس پہلے لمبارڈوں کی قوت کو توڑ چکا تھا۔ یورپ کے بڑے حصے کا مالک بن جانے کے بعد اُس نے آخن (جرمانیہ) کو دارالحکومت بنایا۔

۱- Charlemagne ۔ ۲- Leo III ۔ ۳- Irene ۔ ۴- Nicephorus ۔ ۵- Lombards



انگریز فرانس کے نارمنوں سے شکست کھاتے ہیں

اگرچہ لڑائی صرف دوپہر سے رات ہونے تک جاری رہی، تاہم یہ جنگ سخت خونریز، فیصلہ کن اور نتائج کے اعتبار سے بڑی اہم تھی۔ کوئی انگریز یا امریکی طالب علم نہ تاریخ فراموش کرسکتا ہے ——— ۱۰۶۶ء ——— اور نہ میدان جنگ ——— ہیسٹنگز۔

انگلستان کا بادشاہ ایڈورڈ ۱۰۵۱ء میں فرانس گیا تو غالباً اس نے نارمنڈی کے ڈیوک ولیم سے انگلستان کے تاج و تخت کا وعدہ کرلیا۔ ۱۰۶۴ء میں ویکس کے امیر ہیرلڈ کا جہاز ساحل فرانس کے قریب تباہ ہوگیا اور اسے نارمنڈی میں اترنا پڑا۔ ولیم نے اسے قید کرلیا اور تاج کا وعدہ لیے بغیر رہا نہ کیا۔ لیکن ۱۰۶۶ء میں ہیرلڈ خود انگلستان کا بادشاہ بن گیا تو ولیم ۲۸ ستمبر ۱۰۶۶ئہ کو فوج کے ساتھ ساحل انگلستان پر لنگر انداز ہوا، تاکہ جو وعدے توڑے گئے تھے انھیں بزورِ شمشیر پورا کرائے۔

ہیرلڈ نے جلدی میں سپاہی فراہم کیے اور حملہ آور کے مقابلے کے لیے اس پہاڑی پر پہنچ گیا جو قصبہ ہیسٹنگز سے تقریباً چھ میل پر ہے۔ اس کی فوج زیادہ تر پیادہ تھی۔ اگرچہ تعداد میں وہ ولیم کے آدمیوں سے یقیناً زیادہ تھی، لیکن سپاہیوں میں سے اکثر کے پاس نہ تو اچھے ہتھیار تھے اور نہ نارمنوں جیسا جنگی تجربہ تھا۔

ایک دوسرے کے بالمقابل صف بندی ہوچکی تو پہلے ولیم کے تیر اندازوں نے تیروں کا مینہ برسایا۔ پھر اس کی پیادہ فوج نے حملہ کیا۔ ہیرلڈ کے سپاہی ڈھالیں جوڑ کر ایک مضبوط دیوار کی شکل میں جم گئے۔ وہ لمبے دستے والے تبر اس چابک دستی سے چلاتے تھے کہ ولیم کے مسلح سوار بھی ان پر غلبہ نہ پاسکے۔

اب ولیم نے ایک عجیب چال چلی۔ اس نے اپنی سپاہ کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ جونہی وہ پیچھے ہٹی، ہیرلڈ کی فوج اس کے تعاقب میں آگے بڑھی اور اس طرح وہ مضبوط دیوار ٹوٹ گئی جسے ولیم کی جنگی قوت نہ توڑ سکی تھی۔ عین اس وقت ولیم کے سواروں نے پلٹ کر شدید حملہ کیا اور ہیرلڈ کی سپاہ کو سخت نقصان پہنچایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ولیم دوبارہ اسی چال پر کاربند ہوا۔ ہیرلڈ کی محافظ فوج آخری دم تک مقابلے پر جمی رہی، لیکن ولیم کے تیر اندازوں نے اس کے پرخچے اڑا دیے۔ اس طرح نارمن انگلستان پر قابض ہوگئے۔ رومیوں اور ڈینوں سے کہیں زیادہ اثر نارمنوں کی فتوحات سے پڑا۔ اور برطانیہ میں تہذیب و تمدن کا آغاز انھی فرانسیسی فاتحین کے طفیل ہوا۔



برطانیہ میں آزادی کے منشور پر دستخط ہوتے ہیں

۱۲۱۵ء اس وجہ سے ایک ناقابلِ فراموش تاریخی سال بن گیا ہے کہ اس سال انگلستان کے بادشاہ جان[1] نے اس فرمان پر دستخط کیے جو "منشورِ اعظم[2]" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ منشور امریکہ اور برطانیہ کی شہری آزادی کا بنیادی پتھر بن گیا۔

جان عالی ظرف بادشاہ نہ تھا کہ اپنے کسی قیمتی حق کو خوش دلی سے چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن بہت سے لوگ اس کے مخالف تھے۔ وہ امیروں اور عوام کو عجیب و غریب منصوبوں سے پریشان کرتا۔ اُس نے بھاری ٹیکس لگائے۔ صلیبی لڑائیوں اور جنگ فرانس کا خرچ عوام کے ذمے ڈال دیا۔ عدالتی نظام بگڑ گیا۔ کلیسا کو بھی شکایتیں پیدا ہوئیں۔ علاوہ ازیں جان کی نجی زندگی بھی رسوائی کے دھبوں سے آلودہ تھی۔

آخر کار امیروں نے اس کے سامنے نپے تلے مطالبے پیش کر دیئے، ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر ان کے مطالبات مانے نہ گئے تو بغاوت ہو جائے گی۔ جان نے کھلی شکست سے بچنے کے لیے کلیسا کو کچھ رعایتیں دے دیں۔ ان کے لیے آزاد انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا اور باشندگانِ لندن کو خاص حقوق عطا کیے۔ تاہم جو مطالبات امیر پیش کر چکے تھے، ان پر وہ مضبوطی سے جمے رہے۔ آخر کار ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو خفیف ردّ و بدل کے بعد منشورِ اعظم پر دستخط ہو گئے۔ بعد ازاں تمام بادشاہ اس کی تصدیق کرتے رہے۔

یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ اس نام نہاد منشورِ اعظم میں صرف بادشاہ اور کلیسا، نیز بادشاہ اور اُمراء کے باہمی تعلقات کی وضاحت کی گئی تھی، لیکن ان میں سے کسی کو عوام کی بہتری اور بہبود مقصود نہ تھی۔ جو لوگ آزاد تھے اُنھیں یہ حق مل گیا کہ اپنے مقدمات کا فیصلہ حلقے کے امیروں سے کرائیں۔ انگلستان کے زیادہ تر باشندے زرعی غلام تھے۔ اُنھیں چار سو سال اور اسی حالت میں گزارنے پڑے۔ بایں ہمہ منشورِ اعظم حقیقی جمہوریت کی شاہراہ پر بلا ارادہ ایک اہم سنگِ میل بن گیا۔

۱- John ۲- Magna Carta



بارُود ایجاد ہوتی ہے

قصے کہانیوں میں بتایا جاتا ہے کہ سب سے پہلے چنگیز خاں نے جنگ میں بارود سے کام لیا۔ یہ بات درست ہو یا نہ ہو، لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ چنگیز خاں کے زمانے سے بہت پہلے، یعنی نویں صدی میں اہل چین بارود بناتے اور اسے آتشیں پٹاخوں میں استعمال کرتے تھے۔ یورپ میں بارود کی ایجاد کا سہرا تیرھویں صدی کے دو راہبوں میں سے کسی ایک کے سر پر ہے: انگریز راجر بیکن[1] یا جرمن برتھولڈ شوارٹز[2]۔ بارُود ہی کے بل پر یورپی سپاہیوں نے روئے زمین پر حکمرانی کے جال بچھائے۔

بارُود کے لیے تین چیزیں درکار تھیں: اول قلمی شورہ، دوسرے گندھک، تیسرے کوئلہ۔ بیکن نے شورے کو صاف کر کے قلمی شورہ بنانے کا طریقہ دریافت کیا اور بارود کا نسخہ تیار کر دیا۔ شوارٹز نے اس سے کام لینے کے لیے آتش بار ہتھیار بنائے۔

بہرحال بارود سازی کا بندوبست ہو گیا تو یورپ کی فوجیں تلوار، نیزے اور تیروں کی جگہ لڑائی میں گولیاں استعمال کرنے لگیں۔ بینک برن[3] کی لڑائی میں رابرٹ بروس نے انگریزوں کو مغلوب کر لیا (۱۳۱۴ء)۔ کریسی[4] میں انگریزوں نے فرانسیسی امیروں کو تباہ کر ڈالا (۱۳۴۶ء)۔ ان دونوں لڑائیوں میں بارود استعمال ہوئی۔ تاہم اس کی اہمیت کا پُورا اندازہ نہ ہو سکا۔ لہٰذا تجربات جاری رہے۔ یہاں تک کہ پندرھویں صدی میں بندوق ایجاد ہوئی اور مدِمقابل کو دُور ہی سے موت کے گھاٹ اُتارا جانے لگا۔

حقیقت یہ ہے کہ بارُود کی ایجاد کے بعد صدیوں تک یہ مسئلہ پریشانی کا باعث بنا رہا کہ اس سے کام لینے کے لیے موزوں ہتھیار کون سا ہو سکتا ہے۔ پہلے توڑے والی بندوق ایجاد ہوئی، پھر چقماقی بندوق نکلی۔ ۱۸۰۷ء میں الیگزانڈر جان فارسیتھ[5] نے ایک ایسی بندوق تیار کی جس کے پیالے پر تانبے کی ٹوپی رکھی جاتی تھی۔ تیس سال کے غور و فکر کے بعد فوجی ماہروں نے اسے استعمال کرنا منظور کر لیا۔ آتش بار ہتھیاروں میں اصلاحات کا سلسلہ برابر جاری رہا مگر ان میں غیر معمولی ترقی پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں ہوئی۔ چھوٹے سے چھوٹا ہتھیار ۲۲ نمبر کا پستول تھا اور بڑے سے بڑا ہتھیار جرمنوں کی توپ جسے بگ برتھا[6] کہتے تھے۔ اس کی مار اسّی میل تک تھی۔

بارُود سُرنگیں بنانے اور چٹانیں توڑنے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

۱- Roger Bacon ۲- Berthold Schwartz ۳- Bannockburn یہ سکاٹ لینڈ میں ہے۔
۴- فرانس میں Crecy ۵- John Forsyth ۶- Big Bertha



قطب نما سات سمندر مسخّر کرتا ہے

نقل و حرکت کے بہت سے پُرانے ذرائع مثلاً بیل گاڑی، گھوڑا، بادبان اور چپو وغیرہ فرسودہ ہو گئے، لیکن برقی آلات کی ایجاد کے باوجود قدیم قطب نما سے بدستور کام لیا جا رہا ہے۔ جہاں راہ و منزل کا کوئی نشان نہیں ملتا، وہاں مسافروں کا سب سے بڑا سہارا قطب نما ہی ہوتا ہے۔ یقیناً اس میں بھی اصلاحات ہوئیں لیکن ان کی رفتار بہت سُست تھی۔ اصل مقناطیسی آلہ آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ چودھویں صدی میں یا اس سے پیشتر تھا۔ سیر و سیاحت میں انسان اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

کوئی نہیں جانتا کہ یہ سادہ سا آلہ کس نے بنایا اور کس نے سب سے پہلے اسے استعمال کیا۔ قیاس یہ ہے کہ بحیرۂ روم کے کسی ملّاح کے پاس یہ آلہ موجود ہوگا۔ یکایک موسم خراب ہو گیا۔ آسمان پر بادل چھا گئے۔ ستاروں کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اس موقع پر اسی آلے نے کام دیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بارھویں صدی کا کوئی اطالوی یا عرب ملّاح ہوگا جس نے سب سے پہلے قطب نما سے کام لیا، لیکن وہ کوئی ہو اور کسی سرزمین کا رہنے والا ہو، اس حقیقت میں کوئی شُبہ نہیں کہ قطب نما کی ایجاد تاریخ کا ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے۔

اس بارے میں بہت سے افسانے مشہور ہیں۔ سب سے پُرانا یہ ہے کہ چین کے کسی بادشاہ کو حضرت مسیح علیہ السّلام سے دو ہزار چھ سو چونتیس برس پہلے دشمن سے لڑائی پیش آ گئی۔ اتفاق سے فضا میں سخت کُہر پھیل گئی اور کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ فوج کو کس رُخ چلنے کا حکم دیا جائے۔ بادشاہ نے

ایک ایسی جنگی رتھ بنوائی جس سے جنوبی سمت معلوم ہو سکتی تھی۔ بس اس گاڑی کی رہنمائی میں دشمن پر حملہ کیا گیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ گاڑی مقناطیس کے اصول پر بنائی گئی تھی یا اس وقت تک اہل چین کو مقناطیس کے خواص کا علم ہو چکا تھا، لیکن چین میں قطب نما کے وجود کی پہلی شہادت ۱۲۹۷ء میں ملتی ہے۔

چینیوں کے بعد دوسری قومیں بھی قطب نما بنانے کی مدعی ہیں۔ مثلاً عرب، یونانی، اطالوی وغیرہ۔ اس کا ذکر پہلی مرتبہ ایک انگریز الیگزانڈر نیکم[۱] کی کتاب میں ملتا ہے جو بارھویں صدی میں لکھی گئی تھی لہٰذا یہ جو کہا جاتا ہے کہ مارکوپولو نے مشرق کے سفر سے واپسی پر ۱۲۶۰ء میں یورپ کو قطب نما سے روشناس کیا تو صاف ظاہر ہے کہ یہ بات غلط ہے۔

مدت تک کسی کو مقناطیس کے اس اصول کا علم نہ تھا کہ قطب نما کی سوئی شمال کی طرف رہتی ہے (یا جنوب کی طرف جیسا کہ چینیوں نے اپنے حساب کے لیے مناسب سمجھا)۔

اسی طرح کسی کو یہ علم بھی نہ تھا کہ جغرافیائی قطب شمالی اور مقناطیسی قطب شمالی ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ نیز یہ کہ مقناطیسی قطب شمالی ایک جگہ مستقل نہیں رہتا، بلکہ بدلتا رہتا ہے۔ مقناطیسی قطب شمالی نقشے پر پہلے پہل ۱۸۳۱ء میں متعین کیا گیا تھا۔

قطب نما میں فنی اصلاح کی رفتار اتنی سست تھی کہ ۱۸۲۰ء میں بحریہ انگلستان کے پاس شکایت پیش ہوئی جس میں بتایا گیا تھا کہ بحریہ کے نصف سے زیادہ آلے بالکل بے کار ہیں۔

غرض قطب نما کی ایجاد نے نوعِ انسان کی تاریخ اور نقل و حرکت پر جو اثرات ڈالے ان کا اندازہ مشکل ہے۔ افسوس کہ ہم نہ یہ جانتے ہیں کہ اس کا موجد کون تھا اور نہ یہ جانتے ہیں کہ یہ آلہ کیوں کر ایجاد ہوا۔

۱- Alexander Neckam



کولمبس نئی دُنیا دریافت کرتا ہے

جس طرح تاریخ کے بہت سے عظیم الشان کارنامے اکثر بلا ارادہ انجام پا گئے، اسی طرح کولمبس (ولادت تخمیناً ۱۴۴۶ء، وفات ۱۵۰۶ء) بھی بلا ارادہ امریکہ پہنچ گیا۔ حالانکہ اس کی منزل مقصود ہندوستان تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے پانسو سال پیشتر ناروے کا ایک ملاح لیف ایرک سن[1] محض اتفاق سے امریکہ پہنچ چکا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ بھی امریکہ نہیں، بلکہ آئس لینڈ[2] کے ارادے سے نکلا تھا۔

امریکہ کی دریافت پر کولمبس کو جو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی، اس کا سبب یہ ہے کہ جب اس نے سفر اختیار کیا تو زمانے کے حالات بدل چکے تھے۔ یورپ میں صلاحیت پیدا ہو چکی تھی کہ اس دریافت کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر کے اس سے پورا فائدہ اُٹھا سکے۔ ایرک سن کے عہد میں ایسی کوئی صورت موجود نہ تھی۔ نئے برِاعظم کی دریافت میں کولمبس کو پہلا درجہ دیا جائے یا نہ دیا جائے لیکن اس کی مستقل مزاجی، حوصلہ مندی اور بحری مہارت پر انگلی رکھنے کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی، نہ اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ نئی دنیا صحیح معنی میں اس وقت پیدا ہوئی جب محض اتفاق سے کولمبس غرب الہند میں پہنچا۔

کولمبس چودہ سال کی عمر ہی سے بحری سفر کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے بحیرۂ روم کے چکر لگائے، اوقیانوس کے جزائر میں پہنچا، انگلستان گیا، شمالی سمندروں میں پھرتا رہا۔ ۱۴۷۴ء میں اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مغربی سمت سے ہندوستان کا راستہ دریافت کرنا چاہیئے۔ اس خیال نے ایک دُھن کی شکل اختیار کر لی۔ اٹھارہ سال تک نشیب و فراز کے کئی دور اس پر آئے، لیکن وہ اپنی دُھن پر قائم رہا۔ آخر ہسپانیہ کے فرمانروا اس کی دست گیری کے لیے تیار ہو گئے۔ ۳ راگست ۱۴۹۲ء کو وہ تین چھوٹے جہاز لے کر ولبہ[3] کی بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ راستے میں اسے طوفانوں سے بھی سابقہ پڑا، بیماریاں بھی جھیلیں۔

۱- Leif Ericson ۲- Iceland

۳- Huelva جنوبی ہسپانیہ کی مشہور بندرگاہ ہے۔ عرب اسے "ولبہ" کہتے تھے۔

ملّاحوں کی سرکشی کا خوف بھی دامن گیر رہا، لیکن اس کے ارادے میں کوئی تزلزل پیدا نہ ہوا، یہاں تک کہ وہ مغربی سمت بڑھتا بڑھتا یکم اکتوبر کو بہاما[1] کے ایک چھوٹے سے جزیرے سان سالواڈور[2] میں پہنچ گیا۔

بعدازاں اس نے نئی دُنیا کے تین اور سفر کیے۔ ان سفروں میں جزیرۂ ٹرینی ڈاڈ[3] کے علاوہ جنوبی امریکہ کا برِاعظم دریافت کیا، نیز خلیج میکسیکو کے جنوبی ساحل کی دیکھ بھال میں لگا رہا۔ اس نے دولت بھی خُوب کمائی اور شہرت بھی بہت حاصل کی۔ ایک مرتبہ بیڑیوں میں جکڑا ہوا بھی ہسپانیہ لایا گیا تھا لیکن مرنے کے بعد اس کے سر پر عظمت کا تاج رکھا گیا۔

اس کے متعلّق بہت سے افسانے بھی مشہور ہو گئے، مثلاً یہ کہ جو اہلِ علم اس کے عزمِ سفر کی مخالفت کر رہے تھے انھیں قائل ہونا پڑا کہ زمین گول ہے، حالانکہ ان کا اختلاف سمندر کی چوڑائی کے متعلّق تھا اور انجامِ کار ثابت ہوا کہ کولمبس کے مقابلے میں ان کا حساب حقیقت سے زیادہ قریب تھا۔

ہمارے زمانے میں بحریات کے متعلّق جو اکتشافات ہوئے ہیں ان سے فنِ جہاز رانی میں کولمبس کی مہارت کے حیرت انگیز ثبوت ملے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ اس نے مشرقی سمت میں اوقیانوس کو عبور کیا اور جس مقام پر پہنچنا چاہتا تھا، وہ صرف پینتیس میل ایک طرف رہ گیا۔ لہروں اور ہواؤں پر قابو پائے رکھنے کا یہ بڑا ہی عجیب کارنامہ ہے خصوصاً جب یہ حقیقت پیشِ نظر رکھی جائے کہ اس کے پاس آلات بہت ہی معمولی حیثیت کے تھے تو کارنامے کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

بلاشبہ کولمبس سے پہلے بھی بہت سے گروہ امریکہ پہنچ چکے تھے اور اُنھوں نے مختلف حصّوں میں نوآبادیاں بھی قائم کر لی تھیں۔ ایلاسکا کی طرف سے بھی لوگ اس برِاعظم میں داخل ہو چکے تھے پھر وہ آگے بڑھتے بڑھتے وسطی امریکہ سے گزر کر جنوبی امریکہ میں پہنچ گئے، لیکن ان کی دریافت کے بعد وہاں وسیع پیمانے پر آبادکاری کا سلسلہ شروع نہ ہو سکا۔ کولمبس کی دریافت کے بعد یورپ اس نئے برِاعظم کی طرف اُمنڈ پڑا اور تھوڑی ہی مدت میں عام آبادکاری شروع ہو گئی۔ پھر امریکہ ہی میں اس جمہوریت کی داغ بیل پڑی جو آج ساری دُنیا کے لیے ایک مثال بنی ہوئی ہے۔ امریکہ ہی میں متحدہ ریاستوں کے اس نظام نے پرورش پائی جسے آج مال و دولت، صنعت و تجارت اور علم و فن میں سب پر فوقیت حاصل ہے۔

۱- Bahamas ۲- San Salvador آج کل اس جزیرے کا نام Wating Island ہے اور یہ مجمع الجزائر کے وسط میں واقع ہے۔ ۳- Trinidad



کرۂ ارض کے گرد پہلا چکر لگتا ہے

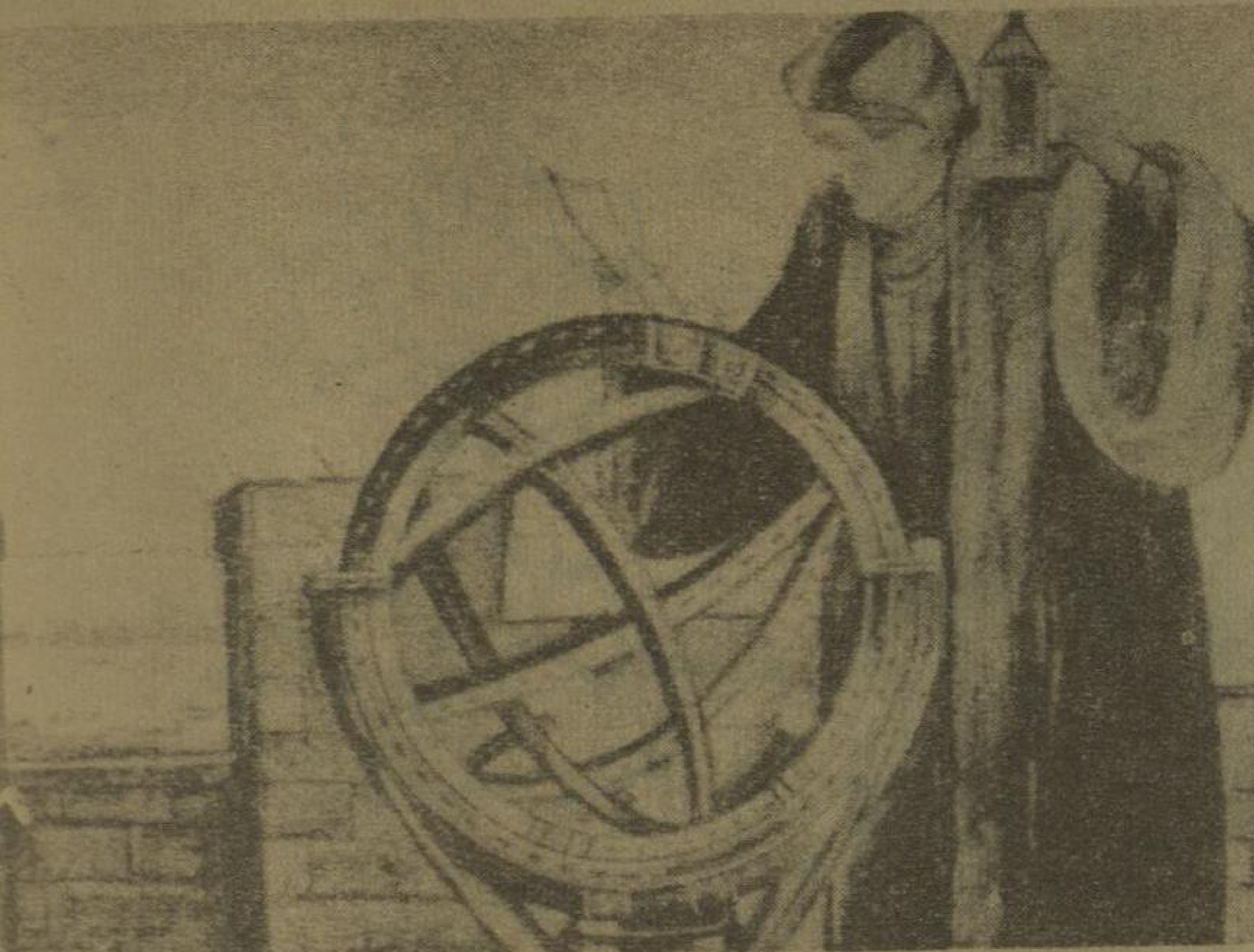
ستمبر ۱۵۱۹ء میں پانچ جہازوں کا ایک بیڑا میجی لن[۱] (ولادت تخمیناً ۱۴۸۰ء، وفات ۱۵۲۱ء) کی سرکردگی میں سان لوکر[۲] (جنوبی ہسپانیہ) کی بندرگاہ سے کرۂ ارض کا چکّر لگانے کے لیے روانہ ہُوا۔ تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفر تھا۔ تین سال بعد اس بیڑے میں سے صرف ایک جہاز جس کا نام وٹوریا[۳] تھا، سان لوکر میں واپس آیا اور اس میں صرف اٹھارہ آدمی تھے۔ گویا پُورے بیڑے میں سے یہی ایک جہاز اور یہی چند آدمی باقی رہ گئے تھے۔ خود میجی لین بھی اثنائے سفر میں کام آگیا تھا۔

میجی لن امیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اتفاقیہ اس کے سر میں کرہ ارض کے گرد چکر لگانے کا سودا سمایا۔ اس نے بحری سفر کا ایک نقشہ تیار کر کے شاہِ پرتگال کے سامنے پیش کیا، لیکن اسی زمانے میں میجی لن کے خلاف سرکاری رقم میں خُرد بُرد کا الزام لگایا گیا تھا، بادشاہ نے اس کی تجویز نامنظور کر دی۔ وہ اس ناکامی سے اتنا متاثر ہُوا کہ پرتگیزی قومیت ہی ترک کر دی اور ۱۵۱۷ء میں ہسپانیہ چلا گیا، جہاں شاہ چارلس نے اس کی تجویز منظور کر کے پانچ جہاز اس کے حوالے کر دیئے۔

ہسپانیہ سے روانہ ہو کر وہ دو مہینے اور نو دِن میں اٹلانٹک کو عبور کر کے برازیل (جنوبی امریکہ) کی ایک بندرگاہ میں جا پہنچا۔ پھر وہ ساحل کے ساتھ ساتھ جنوبی سمت کو روانہ ہُوا۔ سردیوں کا موسم پٹے گونیا کی ایک بندرگاہ میں گزارا۔ ۱۵۲۰ء کی آخری سہ ماہی میں اس نے پھر لنگر اُٹھایا اور جنوبی امریکہ کے جنوبی گوشے میں تین سو ساٹھ میل لمبی آبنائے سے گزر کر بحرالکاہل میں داخل ہو گیا۔ یہ آبنائے بعد میں اسی کے نام پر موسوم ہوئی۔

اپنے بیڑے کے افسروں سے مشورے کے بعد وہ پھر روانہ ہُوا۔ بحرالکاہل کے سفر میں اس کے آدمیوں کو فسادِ خون، بھُوک اور پیاس کے ہولناک مصائب نے پریشان کیے رکھا، لیکن ہمّتِ مرداں مددِ خدا، اٹھانوے روز کی جدوجہد کے بعد وہ جزائر ماریاناز[۴] میں پہنچ گیا۔ وہاں سے اشیائے خور و نوش لے کر چلا تو ۷ راپریل ۱۵۲۱ء کو وسطی فلی پین کے مشہور مقام سیبو[۵] میں لنگر انداز ہُوا۔ وہاں کے ایک مقامی سردار نے اہلِ ہسپانیہ کی ایک بہت بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مقتولین میں خود میجی لن بھی تھا۔ صرف ایک جہاز وٹوریا سلامت وطن پہنچا۔

- Magellan ۲- Sanlucar یہ بندرگاہ وادیٔ کبیر کے دہانے پر ہے۔ ۳- Vittoria
- Marianas Island ۵- Cebu اس نام کا ایک جزیرہ بھی ہے اور شہر بھی۔



کوپرنیکس سورج کے گرد زمین کی گردش کا انکشاف کرتا ہے

جس زمانے میں میجی لن عملاً زمین کے گول ہونے کا ثبوت مہیا کر رہا تھا، اسی زمانے میں نکولس کوپرنیکس[1] ایک اور نکتہ ثابت کرنے میں لگا ہوا تھا اور وہ یہ کہ زمین بھی دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ کوپرنیکس کو دوسرے اہل علم کی طرح زمین کے گول ہونے کا یقین تھا اور اس نے جو نیا نکتہ دریافت کیا اس کے اثرات بھی بڑے ہی دور رس تھے۔

کوپرنیکس ۱۹ فروری ۱۴۷۳ء کو تھورن[2] (پولینڈ) میں پیدا ہوا۔ کراکو[3] کی یونیورسٹی میں ریاضیات کی تعلیم پائی۔ پھر بولونیا[4] (اٹلی) جا کر بیک وقت عیسوی دینیات اور علم ہیئت پڑھتا رہا۔ حالانکہ ان دونوں میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ پیڈوا (اٹلی) پہنچا تو اس کی توجہ طبابت کی طرف منعطف ہوئی۔ تعلیم مکمل کر کے وطن واپس ہوا تو طبابت شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ کلیسا کے بہت سے کام بھی انجام دیتا رہا، اگرچہ اس نے کلیسا سے باقاعدہ ملازمت کا تعلق کبھی پیدا نہ کیا۔ علاوہ بریں اقتصادیات اور بنک کاری سے بھی دلچسپی لیتا رہا۔ بلکہ اس نے سکے میں اصلاح کی ایک تجویز بھی پیش کی تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ ہیئت کے نئے نظام پر غور و فکر کرتا رہتا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کائنات کے متعلق انسانی فکر میں ایک نیا انقلاب پیدا ہو گیا۔

ہیئت دنیا کے قدیم ترین علوم میں سے ہے اور اسے بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ غیر مہذب لوگ بھی اجرام سماوی کے مشاہدے سے وقت اور موسموں کا حال دریافت کرتے تھے۔

ماقبل تاریخ زمانے میں مصر و بابل، چین و ہند میں ہیئات کی بہت کچھ معلومات حاصل ہوئیں لیکن اس علم کا نقطۂ آغاز یہی تھا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے۔ تیسری صدی ق م میں جزیرہ ساموس[5] کے سائنسدان ارسٹارکس[6] نے سب سے پہلے سورج کو مرکز قرار دیا۔ پھر ارشمیدس[7] نے اپنا نظریہ پیش کیا۔ ایک ہزار آٹھ سو سال بعد کوپرنیکس بھی اسی نتیجے پر پہنچا جس پر ارشمیدس پہنچا تھا۔ کوپرنیکس اس دور میں پیدا ہوا جسے یورپ میں احیاء علوم کا دور کہا جاتا ہے۔ لوگ قدیمی فکر و نظر کی زنجیریں توڑنے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا کوپرنیکس کے انقلابی نظریے کے لیے قبول و پذیرائی کا بندوبست ہو گیا۔

کوپرنیکس کو اپنی کتاب کا پہلا مطبوعہ نسخہ اپنی وفات (۲۴ مئی ۱۵۴۳ء) سے چند روز پہلے ملا۔ اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کتاب پر بلا اجازت ایک مقدمہ لکھ کر اس کے مضبوط دلائل کو محض ایک مفروضے کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اس خوف سے کہ کہیں لوگ اس کی مخالفت پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

۱- Nicholas Copernicus ۲- Thorn ۳- Cracow ۴- Bologna
۵- Samos ۶- Aristarchus ۷- Archimedes



امریکہ میں پہلا انگریزی شہر آباد ہوتا ہے

نئی دُنیا کی دریافت کو ایک صدی گزر چکی تھی، تب کہیں انگریزوں کو وہاں قدم جمانے کا موقع ملا۔ یہی سرزمین آگے چل کر انگریزی آبادی کی اکثریت کا وہ ملک بن گئی، جسے آج کل ریاستہائے متحدہ کہتے ہیں۔ سر والٹر ریلے[1] اور بعض دوسرے لوگ ورجینیا کو آباد کرنے کے لیے سولھویں صدی میں جو کوششیں کر چکے تھے، وہ پائدار ثابت نہ ہوئیں، البتہ ورجینیا کا نام باقی رہ گیا۔ لیکن ۱۶۰۷ء میں دریائے جیمز کے کنارے جیمز ٹاؤن[2] کے نام سے جو بستی آباد ہوئی، وہ شمالی امریکہ کے مشرقی حصے میں انگریزی اقتدار کا مرکز بن گئی۔

لنڈن کمپنی نے آبادکاروں کی جو پہلی مہم بھیجی، وہ ۱۳ مئی ۱۶۰۷ء کو جیمز ٹاؤن میں پہنچی اور اس نے وسیع پیمانے پر کھیتی باڑی کا سلسلہ شروع کر دیا، جس کے دو مقصد تھے: اوّل یہ کہ زمین کی زرخیزی سے فائدہ اُٹھایا جائے، دوسرے یہ کہ ہسپانیہ کے مقابلے میں اپنا قبضہ مستحکم کر لیا جائے۔ لیکن آگے چل کر ہسپانویوں کی نسبت امریکہ کے اصلی باشندے زیادہ خوف ناک دشمن ثابت ہوئے۔ زمین بلاشبہ بڑی زرخیز تھی، لیکن آب و ہوا نے جفاکش کاشتکاروں کو مضمحل کر دیا۔ مشکلات اتنی بڑھ گئیں کہ وہ لوگ واپس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اچانک جون ۱۶۱۰ء میں آبادکاروں کا نیا گروہ آ پہنچا۔ ان کے پاس سامان رسد بھی بافراط موجود تھا۔ پھر لہروں کی طرح پے در پے آبادکار آنے لگے۔ موسمی بخار اور دوسری بیماریوں سے نقصان ہوتے رہے۔ اصلی باشندوں کے حملوں نے بھی بہت سے آبادکاروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، لیکن تازہ دم مہاجر آتے

۱- Sir Walter Raleigh ۲- James Town

اور یہ کمی پوری کرتے رہے۔ تمباکو کی کاشت اس قدر نفع بخش تھی کہ لوگ سارے مصائب سے بے پروا ہو کر اس میں لگ گئے۔ اگرچہ جیمز ٹاؤن میں چند سو سے زیادہ لوگ آباد نہ تھے لیکن چھوٹی چھوٹی بستیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور ورجینیا کی آبادی تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔

اب ایک اور مصیبت پیش آئی۔ جیمز ٹاؤن نیو انگلینڈ کے علاقے سے بہت قریب تھا اور وہاں بعض پرانے خاندان آباد تھے، جنھوں نے اپنے لیے اقتدار کے خاص حقوق حاصل کر لیے تھے۔ جو لوگ دور افتادہ سرحدوں پر رہتے تھے انھیں یہ صورتِ حال پسند نہ تھی۔ ۱۶۷۶ء میں امریکہ کے اصلی باشندوں نے آباد کاروں پر حملہ کیا تو گورنر نے کوئی قابل ذکر امداد نہ دی۔ سرحدی آباد کاروں نے اپنی ہمت سے اس حملے کو روکا اور ناکام بنایا۔ بعد ازاں گورنر، اس کے حامیوں اور دوسرے آباد کاروں کے درمیان ایک قسم کی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جس میں آباد کار کامیاب ہوئے۔ جیمز ٹاؤن کو آگ لگا دی گئی جس سے وہ تباہ ہو گیا۔

۱۶۹۹ء میں جیمز ٹاؤن کی جگہ ولیمز برگ کو مرکز حکومت بنا لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ مرکز حکومت تبدیل ہو جانے کے بعد جیمز ٹاؤن کی پہلی حیثیت باقی نہ رہ سکتی تھی اور یہی صورت پیش آئی۔ جیمز ٹاؤن کا زوال اس پیمانے پر شروع ہوا کہ تین صدیاں گزر جانے پر اس شہر کی جگہ صرف ایک دود کش (چمنی) باقی رہ گیا ہے۔

تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امریکہ کی سرزمین میں جیمز ٹاؤن انگریزوں کا پہلا شہر تھا، یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں انگریزوں نے جو بے شمار شہر اور قصبے آباد کیے، ان میں سب سے پہلا۔



انسانی نظر

بلندیوں اور گہرائیوں میں پہنچتی ہے

اگرچہ عینک سازی کا سلسلہ ۱۲۸۰ء سے عام طور پر شروع ہو چکا تھا، لیکن ان شیشوں سے کوئی اور کام لینے کی نوبت سوا تین سو سال تک نہ آئی۔

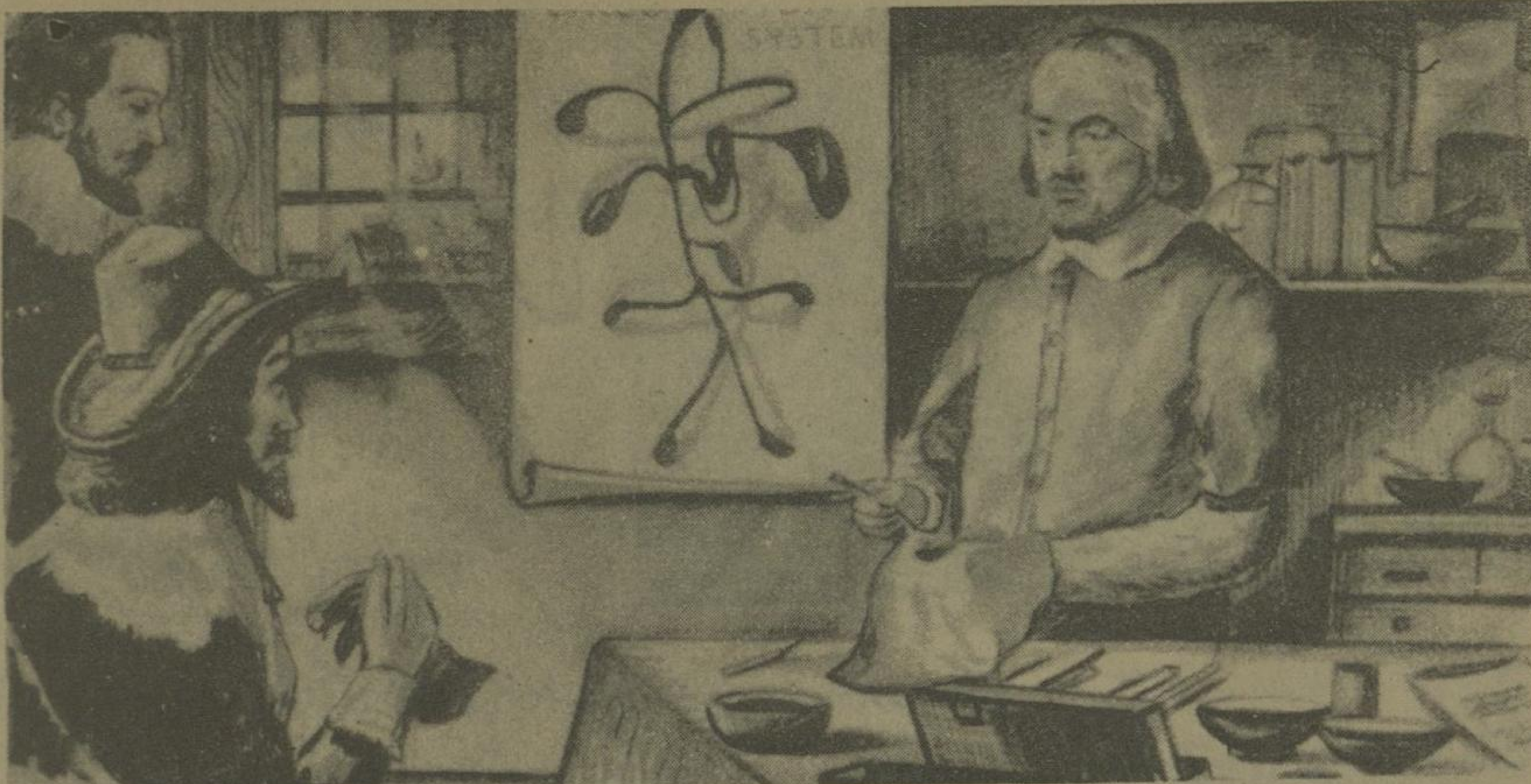
۱۶۰۸ء میں ہالینڈ کے ایک عینک ساز نے اتفاقیہ دو شیشے ملا کر گرجے کے ایک مینار پر نظر ڈالی، تو وہ حیران رہ گیا کہ مینار بہت قریب معلوم ہوتا ہے اور اس کی ایک ایک چیز صاف دکھائی دے رہی ہے۔ اس طرح اس پر دُوربین کا راز آشکارا ہو گیا اور اس نے دُوربین پیٹنٹ کرانے کے لیے درخواست دے دی۔ اسی طرح بعض اور لوگوں کے دل میں بھی دُوربین بنانے کا خیال پیدا ہُوا، لیکن اس سلسلے میں جو شہرت و ناموری اٹلی کے مشہور و معروف سائنسدان گیلی لیو[1] (۱۵۶۴-۱۶۴۲) کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے کے حصے میں نہ آئی۔

کہتے ہیں گیلی لیو ۱۶۰۹ء میں وینس میں تھا کہ اس نے سُنا، بلجیم کے ایک شخص نے دُوربین بنائی ہے۔ گیلی لیو نے یہ دُوربین دیکھی نہ تھی، لیکن انعطافِ نور کے اصول پر غور کرتے کرتے اس نے چند روز میں ایک ایسا آلہ ایجاد کر لیا جو تمام دُوربینوں سے بدرجہا بہتر تھا۔ یہ آلہ اس نے حاکم وینس کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پیشکش کے صلے میں گیلی لیو کو پاڈوا[2] کی یونیورسٹی میں مدت العمر کے لیے لکچرر مقرر کر دیا گیا اور اس کی تنخواہ دُگنی ہو گئی۔

گیلی لیو کی پہلی دُوربین میں ہر شے صرف تین گُنا دکھائی دیتی تھی، پھر اس نے ایسی دُوربین بنائی جس میں ہر شے تینتیس گنا بڑی دکھائی دیتی تھی۔

دُوربین کی طرح خوردبین کی ایجاد میں بھی گیلی لیو کو ایسے ہی حالات سے سابقہ پڑا۔ دُوربین کی ایجاد سے کوئی چوبیس سال پیشتر زکریا جین سن[3] نام ایک عینک ساز نے مرکّب خوردبین تیار کر لی تھی جو چھوٹی چیزوں کے دیکھنے میں کام آتی تھی۔ یہ دراصل ایسے شیشوں کے دو جوڑوں کو ملا کر بنائی گئی تھی جن میں چھوٹی چیزیں بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ جین سن کی خوردبین ۱۵۹۰ء میں تیار ہو چکی تھی۔ گیلی لیو کی توجّہ ۱۶۱۰ء میں اس طرف منعطف ہوئی، لیکن اس نے اپنی دُوربین ہی کو ایسے انداز میں استعمال کرنے کا طریقہ دریافت کر لیا جس سے چھوٹی چیزیں بڑی نظر آئیں۔ ۱۶۲۴ء میں ڈریبل[4] کی خوردبین رومہ پہنچی تو گیلی لیو مستقل خُردبین کی ایجاد کی طرف متوجہ ہُوا۔ اس نے اس آلے میں جو اصلاحات کیں، ان کی وجہ سے خوردبین کی کامیابی کا سہرا بھی اسی کے سر بندھا۔ اس طرح چند سال میں انسانی مشاہدے نے دو مختلف سمتوں میں وسعت اختیار کر لی اور نئی کائنات کے چہرے سے پردے اٹھ گئے۔

۱- Galileo ۲- Padua ۳- Zacharias Jansen ۴- Drebel



دورانِ خون کا اصول دریافت ہوتا ہے

ولیم ہاروے[1] (۱۵۷۸-۱۶۵۷ء) ایک حاذق اور محنتی طبیب تھا۔ سترھویں صدی کے اوائل میں وہ گھوڑے پر سوار ہو کر چکّر لگاتا اور مریضوں کا علاج کرتا۔ اس نے یہ راز دریافت کیا کہ دل ایک پچکاری ہے جس کی بدولت خون شریانوں اور رگوں کے راستے سارے جسم میں دَورہ کرتا رہتا ہے۔ انسان کے لیے یہ شاید نہایت اہم اِنکشاف تھا۔

انسانوں میں جب سے الفاظ کے شاعرانہ استعمال کا سلسلہ جاری ہؤا، عشق و محبّت اور ہمّت و جوانمردی کے داستاں سرا دل کو جذبات کا مرکز قرار دیتے رہے ہیں۔ ہاروے کے اس اہم انکشاف نے آج بھی دل کے اس شاعرانہ تصوّر پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اگرچہ ہر صدی کے جنگجو اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ دل میں تلوار کی نوک کا ایک کچوکا بھی فوری موت کا باعث ہوتا ہے، لیکن ارسطو یا جالینوس یا ہیروفلس[2] یا سولھویں صدی کے کسی روشن دماغ ڈاکٹر کو دورانِ خون کے نظام کا کوئی واضح اور صحیح خاکہ تیار کرنے کی نہ سُوجھی۔ ہاروے کو یہ نکتہ سُوجھ گیا اور اسی سرسری خاکے پر دورِ حاضر کے علم طِب کا بڑا حصّہ تیار ہؤا۔

ہاروے کے زمانے میں خوردبین موجود نہ تھی۔ اس لیے وہ بال جیسی باریک رگوں سے آگاہی حاصل نہ کر سکا جنھیں عروق شعریہ کہتے ہیں، لیکن اس نے دَورانِ خون کا جو نظریہ پیش کیا وہ آج کل اسکولوں میں تعلیم پانے والے بچّوں کو بھی معلوم ہے اور یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ سترھویں صدی سے پیشتر یہ نظریہ موجُود نہ تھا۔ اس کے بغیر ایسی عجیب تدبیریں کیونکر ظہور میں آسکتی تھیں جو رات دن ہمارے گردوپیش ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ٹیکے، نازک عمل جراحی، گندھک کی دوائیں، پنسلین یا فسٹ ایڈ کے سلسلے میں خون روکنے والے آلوں کا استعمال۔

ولیم ہاروے پہلے کیمبرج میں پڑھتا رہا۔ پھر اٹلی کی یونیورسٹی پادوا میں داخل ہو گیا جو

۱- William Harvey ۲- Herophilus

اس زمانے میں یورپ کی بہترین طبی درسگاہ تھی۔ ۱۶۱۶ء سے اس نے دورانِ خون کے متعلق لکچر دینے شروع کیے اور ۱۶۲۸ء میں اس موضوع پر اپنی کتاب شائع کی۔ ساتھ ساتھ طبابت بھی کرتا رہا۔ وہ شاہ جیمس اول اور شاہ چارلس اوّل کے علاوہ ان کے بعض درباریوں کا بھی طبیب خاص تھا۔ اس نے بڑے بڑے جرّاحی کے عمل کیے، جن کی پوری کیفیت لکھی ہوئی موجود ہے۔ ۱۶۳۵ء میں ٹامس پار[۱] نے وفات پائی جس کی عمر ایک سو باون برس بتائی جاتی تھی۔ بادشاہ کے حکم سے ہاروے نے پار کی لاش کا بھی طبی معائنہ کیا، لیکن جس علاج نے دورانِ خون کے متعلق ہاروے کے نتائج کا روشن ثبوت مہیا کیا وہ ایک ایسے بیمار کا علاج تھا جس کی رسولی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ ہاروے نے ان تمام رگوں کے منہ باندھ دیئے، جن کے ذریعے رسولی تک خون پہنچ رہا تھا۔ اس طرح نہ صرف رسولی کا بڑھنا ہی رک گیا بلکہ وہ آہستہ آہستہ خشک ہو کر بالکل ناپید ہو گئی اور مریض اچھا ہو گیا۔



۱۔ Thomas Parr



بھاپ کا اِنجن تیّار کیا جاتا ہے

ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ معمولی مشینوں کی مرّمت کرنے والا کوئی شخص اپنے کسی عجیب و غریب کارنامے سے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دے، لیکن ۱۷۶۴ء میں بمقام گلاسگو (سکاٹ لینڈ) ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا۔

بھاپ کے انجن کا خیال یا خود انجن، کوئی انوکھی چیز نہ تھی۔ ایسی مشینیں بن چکی تھیں جو کوئلے کی کانوں سے پانی باہر نکالنے کے کام آتی تھیں اور بھاپ سے چلتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک کان کی مشین میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی۔ جیمز واٹ (۱۷۳۶ - ۱۸۱۹ء) سے کہا گیا کہ اسے دُرست کر دے۔ اس وقت واٹ کی عمر اٹھائیس سال کی تھی اور وہ لندن میں اوزار بنانے کا کام سیکھ چکا تھا۔

واٹ کو مشین کی دُرستی میں تو کوئی خاص دقّت پیش نہ آئی، لیکن مشین کو دیکھ کر اس کے دماغ میں بھاپ کے انجن کا وہ خیال تازہ ہوگیا جو تین سال سے بار بار آرہا تھا۔ مشین کا معائنہ غور سے کیا تو واٹ کو اندازہ ہوگیا کہ اس میں بھاپ بہت زیادہ خرچ ہوتی ہے لہٰذا اسے کفایت شعاری سے نہیں چلایا جاسکتا۔ وہ مشین میں نئی نئی ترمیمیں سوچتا رہا، تاکہ خرچ میں کمی کی صُورت نکل آئے۔ سوچتے سوچتے اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جو انجن اب تک بنائے گئے ہیں ان میں سلنڈر (بیلن) کے ذریعے ایک غیر ممکن کام انجام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ جمع شدہ بھاپ کا درجۂ حرارت بہ حالت عمل کم ہونا چاہیئے، البتّہ سلنڈر (بیلن) کو اتنا ہی گرم ہونا چاہیئے جتنی اس میں داخل ہونے والی بھاپ گرم ہوتی ہے۔ غرض اس نے ایک نئی چیز تیار کر دی جس کا نام آلۂ تکثیف (کنڈنسر) ہے۔ اس کیلئے پانی سے ٹھنڈا ہوتے رہنے کا انتظام کر دیا اور سلنڈر (بیلن) کو بدستور گرم رہنے دیا۔ اس اصول کے مطابق نیا انجن بنایا تو اس کی مرضی کے مطابق کام دینے لگا۔ اس میں پہلے انجن سے ایک چوتھائی یا اس سے بھی کم بھاپ خرچ ہوتی تھی۔

بعدازاں واٹ نے اپنے انجن میں مزید اصلاحیں کیں اور ان تمام اصلاحوں کے پیش نظر اسے بھاپ کے انجن کے مُوجد کا اعزاز دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔ اسی انجن سے آگے چل کر حمل و نقل، صنعت و حرفت اور بجلی پیدا کرنے کے بڑے بڑے کام لیے گئے۔



امریکی ریاستیں آزادی کا اعلان کرتی ہیں

امریکی ریاستوں کی کانگرس کا ایک اجلاس ۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو فلاڈلفیا میں ہوا، جس میں برطانیہ کی حکومت سے آزاد ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ امریکہ میں یہ دن ہر سال دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور بڑی خوشیاں کی جاتی ہیں۔ یہ اعلان ٹامس جیفرسن[1]، جان ایڈمز[2] اور بنجمن فرینکلن[3] نے تیار کیا تھا۔

یہ امر بہت پہلے سے مقدر ہو چکا تھا۔ امریکی ریاستیں برطانیہ سے لڑائیاں کر چکی تھیں۔ ان میں جو خون بہا، اس کا تقاضا یہی تھا کہ برطانیہ کی اطاعت سے کامل انحراف کیا جائے، لیکن ایک گروہ کے نزدیک آزادی میں طرح طرح کے خطرے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر شاہی حکومت اُٹھ گئی تو ریاستوں کے درمیان اتحاد قائم نہ رہ سکے گا۔ جمہوری خیالات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مساوات ترقی کرے گی۔ عوامی حکومت سے بدنظمی پھیلے گی۔ جان و مال کی سلامتی مخدوش ہو جائے گی۔ اگرچہ برطانوی لشکروں سے لڑائیاں ہو رہی تھیں لیکن اس خیال کے لوگ برطانیہ سے علیحدگی کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ لوگ فلاڈلفیا کے اجلاس میں مہینوں اپنے خطرات شدت سے پیش کرتے رہے۔

دوسری طرف آزادی پسند لوگ ان خطرات کو بے بنیاد قرار دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں ٹامس پین کے ایک پمفلٹ "کامن سنس" (عقل سلیم) نے عوام کے خیالات پر بہت اثر ڈالا، لیکن تیرہ ریاستوں کے نمائندوں کے درمیان اختلاف باقی رہا۔ انجام کار ۱۰ جون ۱۷۷۶ء کو اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ تین ہفتے کے بعد آخری فیصلے کے لیے ووٹ لے لیے جائیں۔ اس زمانے میں جیفرسن، ایڈمز اور فرینکلن نے بڑا کام کیا۔ یکم جولائی کو ووٹ لیے گئے تو نو ریاستوں کے نمایندوں نے آزادی کے حق میں اور دو ریاستوں نے خلاف ووٹ دیتے۔ ایک ریاست کے نمایندوں میں سے نصف ایک طرف تھے اور نصف دوسری طرف۔ ایک ریاست کا نمایندہ اس وجہ سے کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کوئی قطعی ہدایت نہیں ملی تھی۔ بڑی کوششوں سے ۲ جولائی کو تمام نمایندے اعلانِ آزادی پر متفق ہو گئے اور ۴ جولائی کو اعلان

۱- Thomas Jefferson ۲- John Adams ۳- Benjamin Franklin

جاری کر دیا گیا۔ اس کے تمہیدی حصّے کا ترجمہ ذیل میں درج ہے :۔

"جب نوعِ انسان کے احوال و وقائع کی رفتار کے پیشِ نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ جن سیاسی رابطوں نے ایک قوم کو دُوسری سے وابستہ کر رکھا تھا، انھیں توڑ دیا جائے، اور قانونِ قدرت اور خدائے کائنات کی طرف سے اس قوم کو اقوامِ عالم میں استقلال اور مساوات کے جو حقوق حاصل ہیں انھیں خود سنبھال لیا جائے تو رائے عامہ کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ ان اسباب کو واضح کر دیا جائے جو ایسی علیحدگی کا موجب بنے۔

"یہ سچائیاں کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ خدا نے سب انسانوں کو ایک سا پیدا کیا اور سب کو بعض حقوق یکساں طور پر حاصل ہیں جنھیں چھینا نہیں جا سکتا۔ ان حقوق میں زندگی، آزادی اور حصولِ راحت بھی شامل ہیں۔ انھی حقوق کی حفاظت کے لیے حکومتیں قائم کی جاتی ہیں، جو عوام کی رضامندی سے مناسب اختیارات کی مالک بنتی ہیں۔ جب کوئی حکومت ان مقاصد کی بربادی کا موجب بن جاتی ہے تو عوام کا حق ہے کہ اسے بدل دیں یا منسوخ کر دیں اور نئی حکومت بنائیں۔ اس کی بُنیاد ایسے اصول پر رکھیں اور اسے ایسے انداز میں منظم کریں جو ان کے نزدیک حفاظت و راحت کے لحاظ سے مناسب ہو۔ احتیاط و تدبیر کا تقاضا یقیناً یہی ہے کہ جو حکومتیں مدت سے قائم چلی آتی ہیں، انھیں معمولی اور عارضی حالات کی بنا پر نہ بدلا جائے۔ تجربہ بھی شہادت دے رہا ہے کہ انسان مصیبتیں جھیل لیتے ہیں، بشرطیکہ انھیں جھیل لینا ممکن ہو، مگر جس طرزِ حکومت کے عادی ہو جائیں اسے بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ لیکن جب خرابیاں لامتناہی ہو جائیں حقوق کا سلب و غصب جاری رہے اور ایسے طریقے اختیار کیے جائیں جن سے واضح ہو کہ عوام کو مطلق العنانی کا شکار بنائے رکھنا منظور ہے تو ایسی حکومت کا جوا اُتار پھینکنا عوام کا حق ہی نہیں، بلکہ ان کا فرض ہو جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے حالات میں اپنی آیندہ حفاظت کے لیے نئے محافظ مہیا کیے جائیں۔

"ان نوآبادیوں نے بڑے صبر سے فرمانبرداری کا حق ادا کیا۔ اب ضرورت کے مطابق وہ سابقہ نظامِ حکومت کو بدلنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ موجودہ شاہِ برطانیہ کی سرگزشت مسلسل نقصان رسانی اور حقوق غصب کرنے کی سرگزشت ہے۔ مدعا یہ تھا کہ ان ریاستوں پر کامل استبداد کا نظام جاری کر دیا جائے۔ اس کے ثبوت میں ہم انصاف پسند دُنیا کے سامنے حقائق پیش کرتے ہیں۔"



انقلابِ فرانس کا پرچم کھلتا ہے

فرانس میں جس فساد کا مدّت سے خطرہ تھا، وہ ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو پیرس میں برپا ہو گیا۔ عوام نے بستیل[1] کے قید خانے پر حملہ کر کے گورنر کو قتل کر دیا اور قید خانے کی تاریک کوٹھڑیوں میں جو سات قیدی بند تھے، انھیں رہائی دلادی۔ دراصل عوام سامانِ جنگ کی تلاش میں تھے، لیکن یہ مقصد بھی ان کے پیشِ نظر تھا کہ اس پرانے قلعے پر قبضہ جمالیں، جو قید خانے کی صورت میں ظلم و استبداد کا ایک منحوس نشان بن گیا تھا۔ بستیل کا جبراً کھول دیا جانا عوام کے دبے ہوئے جذبات کی بارود کے لیے فتیلہ بن گیا اور اس سے دھماکوں کا وہ وسیع سلسلہ جاری ہوا جسے انقلابِ فرانس کہا جاتا ہے۔

بنیادی اسباب پر نظر کی جائے تو یہ انقلاب دراصل صنعتی انقلاب کا شاخسانہ تھا۔ ترقی پذیر متوسط طبقہ سیاسی اور اقتصادی اقتدار حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ فرانسیسی نوابوں نے جاگیرداری کے سلسلے میں جو خاص حقوق حاصل کر لیے تھے، اگرچہ وہ فرسودہ ہو چکے تھے تاہم ان کی وجہ سے کسان اور مزدور بھوکوں مر رہے تھے اور محاصل کا بوجھ بھی انہی پر پڑا ہوا تھا۔ اُمرا رنگ رلیاں منا رہے تھے اور ان سے سرکاری خزانے کو کوئی رقم نہ ملتی تھی۔ بادشاہ حد درجہ کمزور تھا۔ اس سے یہ امید ہی نہ تھی کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کو مطمئن رکھنے کی غرض سے پرانے آئین میں مناسب ردّوبدل کرے گا، لہٰذا عوام اٹھے اور انھوں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

۱۷۸۹ء میں بادشاہ نے دب کر وہ قانون ساز مجلس[2] بلوائی جس میں امیروں، پادریوں اور عوام کے نمائندے شریک تھے۔ ۱۶۱۴ء سے اس کا کوئی اجلاس نہ ہوا تھا۔ مجلس کا اصل کام یہ تھا کہ شکایتیں بادشاہ کے علم میں لائے اور اصلاحات کی مناسب تجاویز پیش کرے۔ پہلے ہی اجلاس میں تینوں طبقوں کے نمائندوں نے چند امور پر اتفاق کر لیا، اگرچہ تینوں کا نقطۂ نگاہ بالکل الگ تھا، لیکن تینوں چاہتے تھے

۱- Bastille اس کا صحیح فرانسیسی تلفّظ بستی ہے، لیکن میں نے عام انگریزی تلفّظ استعمال کیا ہے۔

۲- اس سے مراد States - General ہے۔

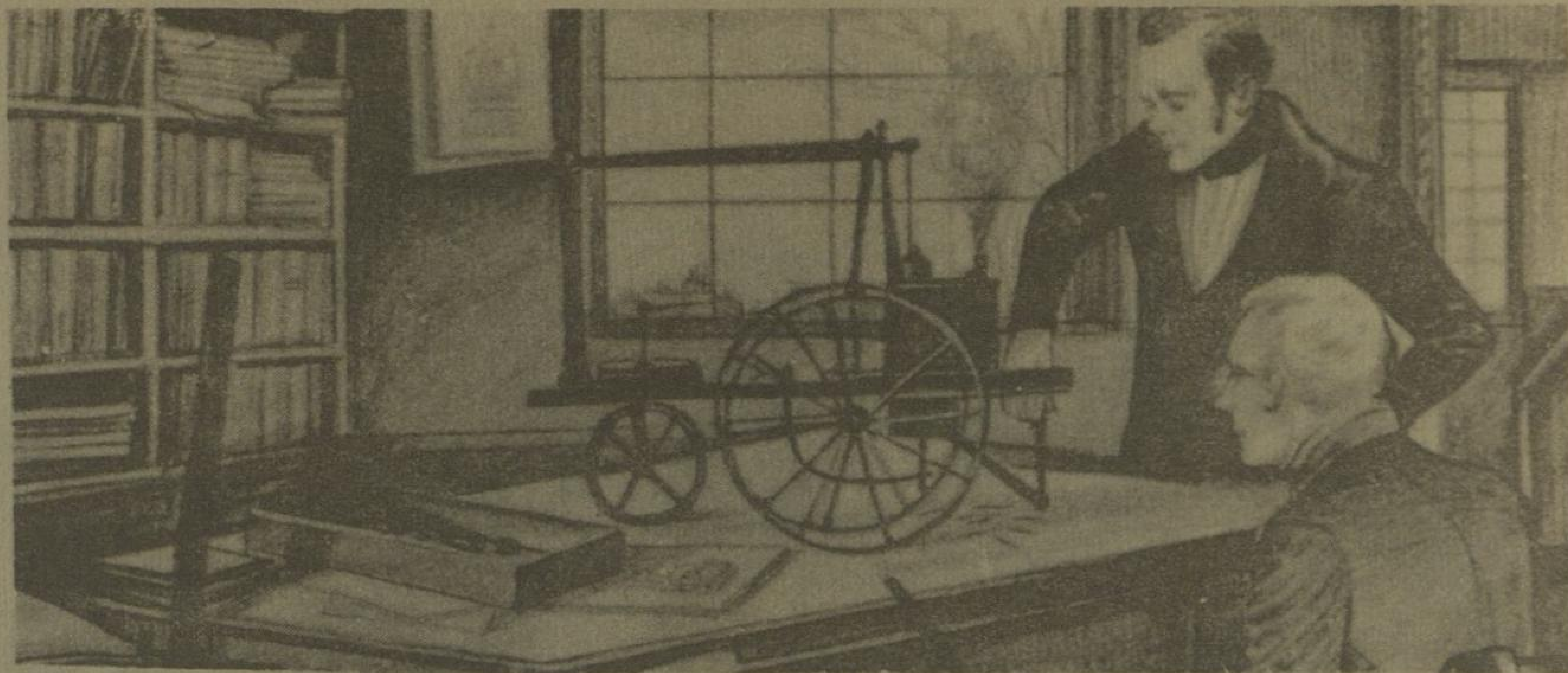
کہ ملک کا دستور قلمبند کیا جائے اور بادشاہ کے اختیارات پر پابندی لگادی جائے۔ تینوں کی خواہش تھی کہ اس مجلس کی رائے سے محاصل کا فیصلہ ہو۔ نیز تینوں اس مالی نظام کی مخالفت میں ہم آہنگ تھے جو ملک کو اقتصادی تباہی کی طرف لے جا رہا تھا۔

لیکن تینوں کے درمیان رائے دینے کے طریقے پر کشمکش شروع ہوگئی۔ عوام کے نمائندے چاہتے تھے کہ سب لوگ یکجا رائے دیں۔ اس طرح انھیں اکثریت حاصل ہو جاتی تھی۔ امرا اور پادریوں کی خواہش تھی کہ تینوں طبقوں کے ووٹ الگ الگ لیے جائیں اور طبقوں کی بنا پر آخری فیصلہ کیا جائے۔ اس صورت میں عوام کے نمائندے اقلیت میں رہ جاتے۔ چھ ہفتوں تک کام رُکا رہا۔ آخر عوام کے نمائندوں نے اعلان کردیا کہ قوم کی ترجمانی کا حق صرف ہمیں حاصل ہے اور وہ قانون منظور کرنے میں لگ گئے۔ پہلی قرارداد یہ تھی کہ ان کی منظوری کے بغیر کوئی نیا ٹیکس نہ لگایا جائے۔

بادشاہ نے اس عمارت کو قفل لگوا دیے جس میں اجلاس منعقد ہو رہے تھے۔ عوامی نمائندوں نے محل کے اس حصے میں اجلاس شروع کردیے، جہاں ٹینس کھیلا جاتا تھا اور حلف اُٹھایا کہ جب تک دستور منظور نہ کرالیں گے، منتشر نہ ہوں گے۔ فوج نے ان کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے سے انکار کردیا تو نچلے درجے کے امرا اور پادری بھی ان میں شامل ہو گئے۔ بادشاہ نے غیر ملکی فوجی دستے بلالیے کہ شہر کی پاسبانی کریں۔ عوام نے فوجوں کو ہٹا لینے کا مطالبہ کیا۔ لیکن بادشاہ نہ مانا۔ اس پر اہل پیرس نے مجلس قانون ساز کی حفاظت کے لیے ایک عوامی فوج تیار کرلی۔ اسی رنگا رنگ فوج نے بیستل پر حملہ بول دیا۔ قومی نمائندوں کو امداد کا یقین ہوگیا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ انقلاب کی راہ میں جو قدم اٹھایا گیا ہے وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

بیستل کی تسخیر کے بعد کسان مضافات میں امیروں کے بنگلے جلانے اور انھیں خوف زدہ کرنے لگے۔ پیرس میں انتہا پسندوں کے درمیان کھینچ تان شروع ہوگئی۔ عوام پر کسی کو قابو نہ رہا۔ بادشاہ اور ملکہ گرفتار ہوئے۔ بعد ازاں وہ اور ہزاروں امرا مارے گئے۔ خیالات و افکار نے وحشت کا ایسا رنگ اختیار کرلیا کہ آج ایک دستور بنتا اور کل اسے توڑ دیا جاتا۔ مذہب پر حملے شروع ہوگئے۔ کلیسا کے اوقاف قومی ملکیت قرار پائے۔ مالی مشکلات میں اضافہ ہوتا رہا۔ انقلابیوں کی زیادتیوں کے باعث آسٹریا اور انگلستان سے لڑائی چھڑ گئی۔

دہشت انگیزی کے اس دَور سے فرانس اتنا تنگ آگیا کہ ۱۷۹۹ء میں جب نپولین نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ نپولین کے عہدِ اقتدار میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انقلابیوں نے مساوات کے جو خواب دیکھے تھے وہ سب پریشان ہوگئے، لیکن ایک لحاظ سے نپولین کی فوجی مہموں کے ذریعے سے انقلابی خیالات جگہ جگہ پھیلے۔ عوام نئی چیزوں کے لیے تیار ہوگئے۔ فرانس میں جاگیرداروں کا پرانا نظام درہم برہم ہوگیا اور اس کی جگہ نپولین کے ضوابط نے معاشرے میں انصاف کا انتظام کردیا۔ متوسط طبقہ جن اختیارات کا خواہاں تھا، وہ اسے مل گئے۔ پیرس یورپ بھر کے لیے آزاد خیالات کا سرچشمہ بنا رہا، یہاں تک کہ عوامی انقلاب کے انتہا پسندانہ افکار بھی پرورش پاتے رہے۔ مارکس اور اینگلس کی اشتمالی تحریرات نے انھیں پیرس ہی سے دُنیا بھر میں پھیلایا۔



رُوئے زمین پر ریلیں دوڑتی ہیں

اگر رچرڈ ٹریوی تھک[1] (۱۷۷۱-۱۸۳۳ء) کو اچھے قدردان مل جاتے تو وہ بھاپ کے انجنوں سے سر جمیس واٹ کے مقابلے میں زیادہ دولت کما لیتا۔ اگر وہ ریل کی اچھی پٹریاں تیار کرنے کی زحمت برداشت کر لیتا تو ریل کے لیے بھاپ کے انجن بنانے میں جارج سٹیفن سن سے زیادہ شہرت و عظمت کا مالک بن جاتا۔ ہوا یہ کہ اس نے واٹ کے انجن سے بہتر انجن بنایا۔ لیکن اُسے مالی لحاظ سے منفعت بخش نہ بنا سکا۔ اس نے سٹیفن سن سے دس سال پیشتر نہایت عمدہ دُخانی انجن تیار کر دیا، لیکن اس کے لیے جو پٹریاں بچھائیں وہ بار بار خم کھا جاتی تھیں۔ اس نے پٹریوں کی دُرستی اور اصلاح پر توجہ کرنے کے بجائے یہ لائن ہی چھوڑ دی اور انجینیری کا پیشہ اختیار کر لیا۔

واٹ نے زیادہ دباؤ کی بھاپ کا استعمال خطرناک بتایا تھا۔ ٹریوی تھک اپنے تجربات میں لگا رہا اور اس نے ایک سادہ انجن تیار کر دیا، جس پر خرچ بھی زیادہ نہ ہوتا تھا۔ ۱۸۰۰ء میں اسے رجسٹر بھی کرا لیا۔ ۱۸۰۳ء میں اس نے اس انجن کو گاڑیاں کھینچنے کے لیے استعمال کیا۔ تجربے میں اسے شاندار کامیابی حاصل ہوئی، لیکن اچانک اس نے انجن ایک آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیا اور گاڑیاں دُوسرے کو دے دیں۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی تھی کہ ٹریوی تھک میں استقلال کا جوہر موجود نہ تھا یا یہ سمجھنا چاہیے کہ اسے ان چیزوں سے جو دلچسپی پیدا ہوئی تھی وہ یکایک ختم ہو گئی۔

اس نے پہلی ریل ویلز میں چلائی۔ انجن میں چالیس پونڈ کے دباؤ کی بھاپ استعمال کی گئی۔ گاڑیوں پر دس ٹن بوجھ لدا ہوا تھا۔ مسافر بھی بیٹھے تھے۔ کوئلہ بھی تھا جو انجن میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ انجن پانچ چھ میل کی رفتار سے چلا اور یقیناً یہ بہت بڑی کامیابی تھی لیکن پٹریاں اچھی نہ تھیں، اس لیے بار بار انجن اور گاڑیاں پٹریوں سے اُتر جاتیں۔ ٹریوی تھک اس سے تنگ آ گیا، لہٰذا اس کا انجن کان سے پانی باہر نکالنے کے کام کا رہ گیا اور ریل کی پٹریاں بنانے کا اعزاز جارج سٹیفن سن کے حصّے میں آیا۔

۱- Richard Trevithick



ایتھر سے جرّاحی میں انقلاب پیدا ہوتا ہے

جمہوریہ امریکہ کی ریاست جارجیا میں جیفرسن[1] ایک قصبہ ہے ۔ وہاں ایک آدمی کی گردن پر رسولی نکلی۔ ڈاکٹر کرافورڈ لونگ[2] نے ۳۰ مارچ ۱۸۴۲ء کو اس پر جرّاحی کا عمل کیا اور رسولی کی جگہ کو سُن کرنے کی غرض سے ایتھر سے کام لیا۔ آپریشن کامیاب ہوا اور مریض کو اس دوران میں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ جراحی کے لیے جسم کے مختلف حصّوں کو سُن کرنے کی غرض سے ایتھر کے استعمال کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

ڈاکٹر کرافورڈ کو اس جدّت کے لیے کوئی اعزاز حاصل کرنے کا خیال نہ آیا۔ غالباً اسے احساس ہی نہ ہوا کہ کوئی بڑا کارنامہ انجام پا گیا ہے، لیکن ۱۸۴۹ء میں جب دو دندان سازوں ہوریس ویلز[3] اور ولیم مورٹن[4] کے درمیان ایتھر کے استعمال میں پہل کرنے کے متعلق بحث چھڑی تو ڈاکٹر کرافورڈ بھی اس بحث میں شامل ہو گیا۔

ایتھر ۱۵۴۰ء سے ایک عام نشہ آور شے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جارجیا کے باشندے اسی طرح اکٹھے بیٹھ کر اسے سانس کے ساتھ چڑھایا کرتے تھے، جس طرح وہ بعد میں شراب پینے لگے۔ اس زمانے میں عملِ جرّاحی کے وقت درد محسوس نہ کرنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ وِسکی یا دوسری شراب پی لی جاتی یا افیون کا شیرہ استعمال کیا جاتا یا ہپناٹزم سے کام لیا جاتا۔ رسولی کے مریض درد اور تکلیف کے خوف سے آپریشن نہ کراتے تھے۔ ڈاکٹر کرافورڈ کے پاس رسولی کا مریض آیا تو ڈاکٹر نے وسکی پینے کے بجائے ایتھر سونگھنے کا مشورہ دیا، مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ دونوں کے اثر میں کتنا بڑا فرق ہے۔

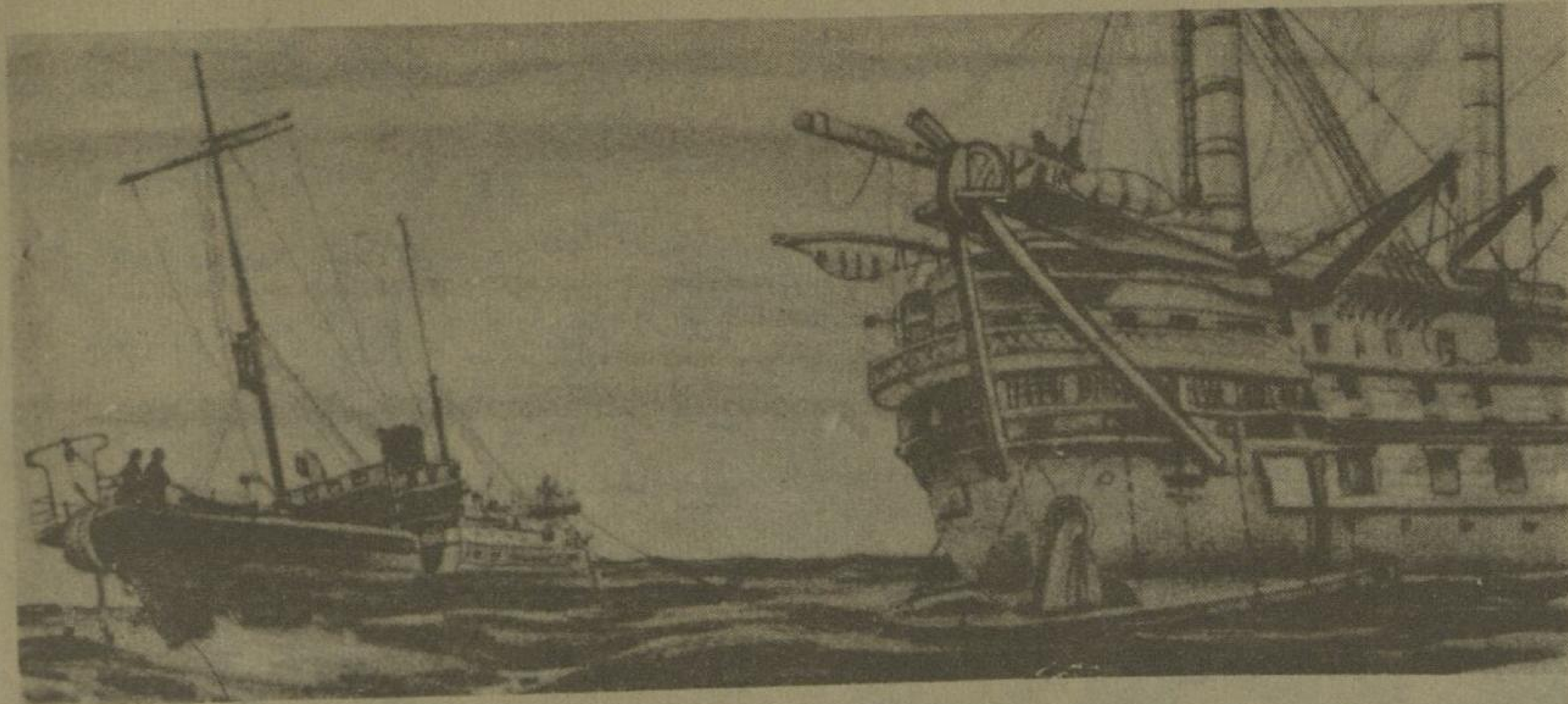
مشہور دندان ساز ہوریس ویلز نے ۱۸۴۴ء میں عملِ جراحی کے مقام کو سُن کرنے کے لیے ہنسانے والی گیس (نائٹرس آکسائڈ گیس) کے تجربے کیے اور جنوری ۱۸۴۵ء میں اعلان کر دیا کہ بوسٹن میں اس کا برسرِ عام تجربہ ہوگا۔ چنانچہ دانتوں کے ایک مریض پر یہ

William Morton -۴ Horace Wells -۳ Crawford Long Jefferson -۱

گیس استعمال کی گئی۔ سُوءِ اتفاق سے مریض کراہتا رہا۔ تماشائیوں نے سمجھا کہ وہ درد کی وجہ سے کراہ رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ویلز کے دعوے کو غلط قرار دیا۔ ۱۸۴۶ء میں مورٹن نے ایتھر کے تجربات بوسٹن ہی میں پیش کیے جو زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ۱۸۴۷ء میں اسکاٹ لینڈ کے ڈاکٹر سر جیمز سمپسن نے کلوروفارم سے کام لینے کا آغاز کیا۔

غرض اس سلسلے میں سبقت کے دعووں اور ان کی تردید کے بارے میں دیر تک ہنگامہ بپا رہا۔ ویلز نے اپنے اُوپر بے ہوش کرنے والی دواؤں کے اتنے تجربے کیئے کہ اسے کلوروفارم کی لت پڑ گئی اور اس نے جیل میں خودکشی کر لی۔ دوسروں نے بے حسی پیدا کرنے والی ان دواؤں کے بنانے کے خاص حقوق حاصل کر کے انھیں اپنی تجوریاں بھرنے کا ذریعہ بنا لیا، لیکن نوعِ انسانی کو ان دواؤں سے بہرحال فائدہ ہی پہنچا۔ جرّاحی کے جو عمل پندرہ منٹ سے زیادہ دیر تک جاری رہتے، ان کی دہشت عموماً مہلک ثابت ہوتی۔ اب ان بے حسی یا بے ہوشی پیدا کرنے والی دواؤں سے زیادہ پیچیدہ عمل جرّاحی میں بھی زندہ رہنے کے امکانات پیدا ہو گئے، اس لیے کہ مریض کو درد اور تکلیف کا کوئی احساس نہ ہوتا تھا۔

غور فرمایئے یہ کتنا عجیب واقعہ ہے کہ مشرق میں جرّاحی وہ درجۂ کمال حاصل نہ کر سکی جو ہمارے زمانے میں اس نے مغرب میں حاصل کر لی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ جرّاحی میں جو تکلیف ہوتی تھی، اس سے مریض کو محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر اختیار نہ کی جاتی تھی اور لوگ تکلیف کے خوف سے یا تو علاج کرتے ہی نہ تھے یا دورانِ جرّاحی میں مر جاتے تھے۔ مغربی جرّاحوں نے آہستہ آہستہ جسم کو سُن کرنے یا مریض کو تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کر دینے والی دوائیں ایجاد کر لیں۔ اس کے برعکس مشرق میں ایسی دواؤں کی ایجاد پر توجّہ جمی رہی، جن سے جرّاحی کے بغیر ہی فائدہ ہو جاتے۔ مثلاً طبِ مشرق میں اب بھی ایسی دوائیں موجود ہیں، جن سے رسولیاں یا ورم تحلیل ہو جاتے ہیں۔ پھر مالش کے فن کو کمال پر پہنچا دیا گیا۔ ایسے مالشیئے ہم نے خود دیکھے ہیں جو ٹوٹے ہُوئے یا ہلے ہُوئے جوڑوں کو مالش کے ذریعے سے درست کر دیتے تھے، اور ایسے ماہر لوگ شاید اب بھی موجود ہوں۔



سمندر کی گہرائیوں میں تار بچھتا ہے

سیموئل مورس نے ۱۸۴۴ء میں تار برقی کے سلسلے کو کامیاب بنا دیا تھا۔ دس سال بعد امریکہ کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اٹلانٹک میں سے تار گزار کر یورپ اور امریکہ کے درمیان برقی خبر رسانی کا سلسلہ قائم کر دے۔ اس کا نام سائرس ڈبلیو فیلڈ[1] تھا۔

اس سلسلے میں پہلی ضرورت یہ تھی کہ ایسے آلے تیار کیے جائیں جو سمندر میں سے گزرنے والے تار پر اتنے لمبے فاصلے سے برقی اشارے ایک دوسرے تک ٹھیک ٹھیک پہنچا سکتے ہوں۔ یہ مشکل یوں حل ہو گئی کہ لارڈ کیلون[2] نے شیشے کا مقناطیسی برق پیما تیار کیا۔ پھر ہزاروں میل لمبا مضبوط اور لچکدار تار تیار کرنا ضروری تھا جس پر گٹا پرچا چڑھا ہوا ہوتا، کہ بجلی کی لہریں اندر محفوظ رہتیں اور گٹے پرچے کے اوپر پیتل کا ایسا خول چڑھا دیا جاتا جس میں کوئی آبی جانور سوراخ نہ کر سکتا۔ اس تار کے بڑے بڑے پیپے جہازوں میں لاد کر کام شروع کر دیا گیا۔ اس امر کا خاص انتظام کیا گیا کہ اگر تار اتفاقیہ کہیں ٹوٹ جائے تو اس کے سرے مشین سے اٹکے رہیں۔ ان انجینیئروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا جو رودبار انگلستان اور بحیرہ روم میں بجلی کے تار بچھا چکے تھے۔

ان احتیاطوں اور پیش بندیوں کے باوجود اگست ۱۸۵۷ء اور جون ۱۸۵۸ء کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ ۱۸۶۵ء میں ایک بہت بڑا جہاز اس غرض سے استعمال کیا گیا۔ اس میں مسافروں کے لیے جو کمرے بنے ہوئے تھے، وہ سب توڑ دیئے گئے، تاکہ تار کے پیپے رکھنے کی گنجائش نکل آئے۔ دو تہائی تار بچھ چکا تو اچانک ٹوٹ گیا اور اس کا سرا تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ ۱۸۶۶ء میں تار کا سلسلہ درست ہوا تو ۲۸ جولائی کو مبارک باد کا پہلا پیغام ملکہ وکٹوریا کی طرف سے جمہوریہ امریکہ کے صدر اینڈریو جانسن[3] کو بھیجا گیا۔

نیویارک میں یہ تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ تاریخ کا بہت بڑا واقعہ تھا۔ یورپ سے امریکہ کی علیحدگی قطعی طور پر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

۱- Cyrus W. Field ۲- Lord Kelvin ۳- Andrew Johnson



حبشی غلاموں کی آزادی کا اعلان ہوتا ہے

نیو یارک کے اخبار نویس ہورس گریلے[1] نے پریزیڈنٹ لنکن[2] (۱۸۰۹-۱۸۶۵ء) پر اپنے اداریتی مقالوں میں پے در پے نہایت تیز اور شدید نکتہ چینی کی تھی۔ لنکن نے ۲۲ر اگست ۱۸۶۲ء کو گریلے کے نام ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ:

> اگر ریاستوں کے اتحاد کو محفوظ رکھنے کا تقاضا یہ ہو کہ کسی غلام کو آزاد نہ کیا جائے تو میں یہی راستہ اختیار کر لوں گا۔ اگر اس مقصد کی خاطر سب غلاموں کی آزادی کا اعلان ضروری ہو گیا تو میں اس کے مطابق کاربند ہو جاؤں گا۔ اگر بعض کو آزاد کر دینے اور بعض کو بدستور غلام رکھنے سے اس مقصد کو تقویت پہنچنے کا امکان نظر آیا تو میں یہی طریقہ اپنا لوں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ لنکن پہلے ہی سے آخری طریقے پر کاربند رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے انھی غلاموں کی آزادی کا اعلان کیا جو اتحاد (یونین) کے خلاف بغاوت میں سرگرم حصّہ لینے والے علاقوں کے اندر مقیم تھے۔ لنکن نے خود یہ حقیقت واضح کر دی کہ میرا اوّلین مقصد باغی ریاستوں کی جنگی مساعی کو کمزور کرنا ہے۔ چنانچہ جزوی آزادی کا اعلان ہو گیا، تمام غلاموں کی آزادی کے لیے امریکی آئین میں تیرھویں ترمیم کا انتظار کرنا پڑا۔ جزوی اعلان آزادی کے بعد یونین کو اینٹی ٹم[3] کے مقام پر زبردست فتح حاصل ہوئی، جس کا اثر ملک کے باہر اچھا پڑا، ورنہ اندیشہ تھا کہ برطانیہ اور فرانس جنوب کی باغی ریاستوں کی حکومت کو تسلیم کر لیتے اور خانہ جنگی میں یونین کی کامیابی مشکل ہو جاتی۔

بلاشبہ امریکی خانہ جنگی غلامی کے مسئلے سے شروع ہوئی تھی، لیکن لنکن کے نزدیک اس مسئلے کو اتحاد (یونین) کے برابر اہمیت حاصل نہ تھی۔ امریکہ کے بڑے بڑے لیڈروں (مثلاً واشنگٹن[4]، جیفرسن[5]، میڈیسن[6]) کے نزدیک غلامی کو ان جمہوری اصول و مقاصد سے کوئی مناسبت نہ تھی، جن کی خاطر اہلِ امریکہ نے

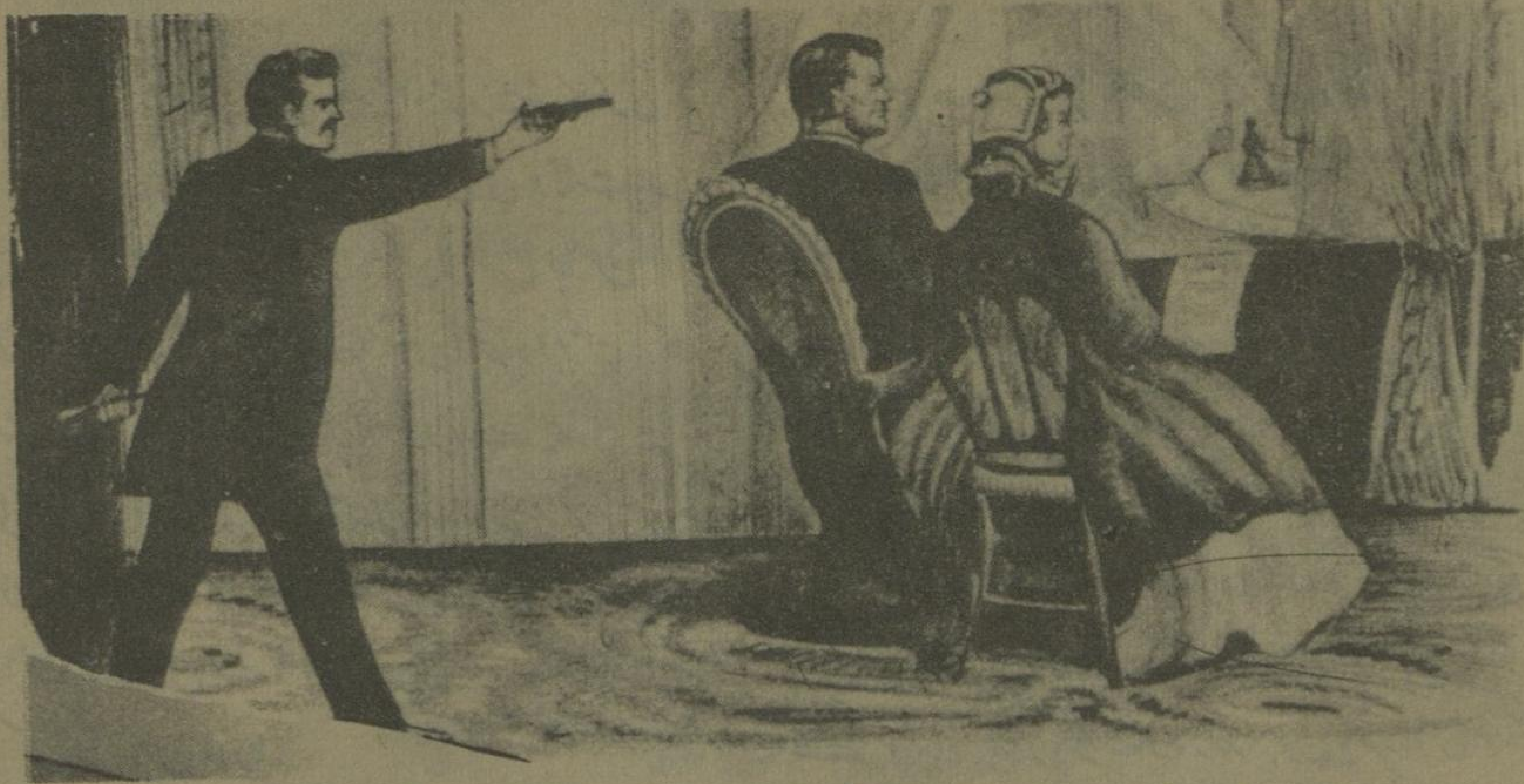
۱- Horace Greeley ۲- Abraham Lincoln ۳- Antietam ۴- Washington
۵- Jefferson ۶- Madison

انقلاب کی صیبتیں برداشت کی تھیں۔ لنکن بھی غلامی کا ویسا ہی مخالف تھا، لیکن جلد بازی میں کوئی قدم اُٹھانے کی عملی مشکلات سے بھی ناواقف نہ تھا۔ اس کے نزدیک اس مسئلے کا معقول حل یہ تھا کہ مالکوں کو مناسب معاوضہ دے کر غلامی کو تدریجاً ختم کیا جائے۔

انسانوں کی ذلّت خیز تجارت کو روکنے کے لیے پریزیڈنٹ لنکن نے ۱۸۶۳ء میں جو قدم اُٹھایا تھا، بیسویں صدی کے بعض مغربی ملکوں نے امریکہ سے باہر اس کی ساری برکتوں پر پانی پھیر دیا۔ انجمن اقوام متّحدہ نے اس نفرت انگیز رواج کے متعلّق اعداد شائع کیے ہیں جسے نرم الفاظ میں جبری مزدوری کا نام دیا جا رہا ہے۔ انسانوں کی نیلامی کا سلسلہ مدّت ہوئی ختم ہو چکا، لیکن بعض جابر طاقتوں نے فوجی فتوحات کے بعد مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے جو سلوک کیا، اس سے ظاہر ہے کہ اصل مرض وسیع پیمانے پر بدستور موجود ہے اور لنکن نے میسن اور ڈکسن لائن[1] کے جنوب میں رہنے والے غلاموں کے لیے آزادی کا جو انتظام کر دیا تھا، آج اس کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

کیا یہ حقیقت کسی سے مخفی ہے کہ جرمنوں اور اطالویوں نے جو علاقے فتح کیے تھے، ان کے باشندوں کے ساتھ کتنا بُرا سلوک کیا تھا؟ کیا سامراجی طاقتیں آج بھی اسی طریق عمل کی پیروی نہیں کر رہی ہیں؟ یہ بھی تو آخر غلامی ہی کی مختلف صُورتیں ہیں جو انسانوں کے مختلف طبقوں کے لیے مصیبت کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ دُنیا میں حقیقی امن کا انحصار اس امر پر ہے کہ غلامی ہر شکل میں مٹ جائے اور ہر جگہ مکمّل آزادی اور مساوات قائم ہو جائے۔ پھر پس ماندہ طبقوں کو اس طرح مدد دی جائے جس طرح کسی گھرانے کے زیادہ کمانے والے لوگ اپنے غریب عزیزوں کو مدد دیتے ہیں۔ انجمن اقوام متّحدہ اس بارے میں دُنیا کی آخری امید گاہ ہے۔ دیکھیے یہ کب تک اپنے اصل مقصد میں کامیاب ہوتی ہے۔

۱- Mason and Dixon Line



لنکن قاتل کی گولی کا نشانہ بنتا ہے

امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے سپہ سالار جنرل لی[1] نے بمقام اپومیٹکس[2] ہتھیار ڈالے اور امریکہ کی خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا۔ اس سے پانچ روز بعد متحدہ ریاستوں کے فاتح صدر ابراہم لنکن پر ایک ایکٹر نے فورڈ کے تھیٹر (واشنگٹن) میں گولی چلادی اور اگلے دن صبح کے وقت لنکن نے وفات پائی۔ (۱۸۶۵ء)

اس قتل کا نتیجہ یہ نکلا کہ شکست خوردہ جنوبی ریاستوں کی از سرِ نو تعمیر کا دور مشکلات سے لبریز ہو گیا۔ تاریخی شخصیت ہونے کے اعتبار سے لنکن کو بقائے دوام کے دفتر میں وہی حیثیت حاصل ہو چکی تھی جو جولیس سیزر کو اپنے عہد میں حاصل ہوئی تھی۔ اہل الرائے اصحاب اس امر پر متفق ہیں کہ سیزر کے قتل نے سیزر کے عہد پر اتنا اثر نہ ڈالا تھا، جتنا لنکن کی موت نے لنکن کے عہد پر ڈالا۔

لنکن کی سادہ مزاجی اور عام مجلسی آداب کی پابندی سے بے پروائی نے امریکیوں کے دل موہ لیے تھے۔ وہ عدالت میں اعلیٰ تعلیم یافتہ قانون دانوں سے بازی لے جاتا تھا۔ کشتیوں میں کسرتی جوانوں کو پچھاڑ دیتا تھا۔ تقریریں اور خطبے لکھتا تو بڑے بڑے زبان آور خطیب اس کے سامنے طفلِ مکتب رہ جاتے۔ سیاسیات کے چکروں میں بھی اس کے مقاصد کی پاکیزگی بدستور قائم رہی اور سخت حوصلہ شکن حالات میں بھی اس نے اپنے بلند نصب العین کبھی ترک نہ کیے۔

اس سے بڑھ کر حوصلہ شکن حالات کیا ہو سکتے تھے کہ ملک دو حصوں میں بٹا ہوا تباہی خیز خانہ جنگی میں مبتلا تھا اور جو نئی سیاسی پارٹی وجود میں آئی تھی، اس پر قطعاً بھروسا نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس میں حد درجہ انتہا پرست بھی شامل تھے اور وہ قدامت پسند بھی جو مالی مقاصد کے لالچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

صدر لنکن کو سرکاری فرائض انجام دینے میں ایک لمحے کے لیے بھی آرام لینے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ بایں ہمہ اس نے خانہ جنگی میں فتح و فیروزمندی کا راستہ پیدا کر

۱- General Lee ۲- Appomauox

لیا، لیکن ایک پاگل کی گولی سے محفوظ رہنے کا کوئی سامان اس کے پاس موجود نہ تھا۔ اس کی وفات پر اینڈریو جانسن[1] صدر جمہوریہ بنا۔ لنکن کی طرح جانسن کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ جنوبی ریاستیں اتحاد (یونین) کا لاینفک جزو ہیں اور جن ریاستوں نے علیحدگی اختیار کی تھی۔ انھیں سہل سے سہل شرطوں پر واپس لانے کا انتظام کیا جائے لیکن ری پبلکن پارٹی کے انتہا پسندوں نے لنکن اور جانسن کے ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔

جنوبی ریاستوں کے باشندے خود بھی از سرِ نو تعمیر میں مشکلات پیدا کرنے کے ایک حد تک ذمہ دار تھے۔ لنکن اور جانسن دونوں کی مصالحت کے لیے یہ تجویز تھی کہ حبشیوں کو جزوی حقِ رائے دہی مل جانا چاہیے۔ جنوبی ریاستوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ اس طرح وہ انتہا پسند ری پبلکن عناصر کے ہاتھ میں آلۂ کار بن گئے۔

شمالی اور جنوبی ریاستوں میں خانہ جنگی جاری تھی کہ گیٹس برگ کے مقام پر ایک اجتماع ہوا جس میں لنکن نے ایک یادگار خطبہ دیا۔ اس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے:

ستاسی سال گزر چکے ہیں جب ہمارے اجداد نے اس برِاعظم میں ایک نئی قوم کو جنم دیا تھا۔ یہ قوم آزادی کی فضا میں پیدا ہوئی اور اس کا نصب العین یہ تھا کہ تمام انسان بلحاظ پیدائش برابر ہیں۔ اب ہم ایک خوفناک خانہ جنگی میں اُلجھے ہوئے ہیں اور آزمائش ہو رہی ہے کہ آیا یہ قوم یا ایسے ہی حالات میں جنم لینے والی اور ایسا ہی نصب العین سامنے رکھنے والی کوئی قوم زیادہ دیر تک باقی رہ سکتی ہے؟

ہم اب اس مقام پر جمع ہیں جہاں خانہ جنگی کے دور میں ایک بہت بڑی لڑائی ہو چکی ہے۔ ہم اس غرض سے آئے ہیں کہ میدانِ کارزار کے ایک حصّے کو ان بہادروں کی آخری آرام گاہ کے لیے وقف کر دیں جنھوں نے اس لیے جانیں قربان کیں کہ قوم زندگی کی دولت سے بہرہ مند رہے۔ ہمارا یہ یادگار منانا یقیناً ہر لحاظ سے موزوں اور مناسب ہے۔ وسیع تر نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میدان کی تخصیص، تقدیس اور پاکیزگی کا فرض ہم انجام نہیں دے سکتے۔ جو بہادر یہاں لڑے، وہ زندہ ہوں یا مُردہ اس سرزمین کو پاکیزگی کے اس درجے پر پہنچا چکے ہیں کہ ہم بہر کیف نہ اسے بڑھانے کے اہل ہیں اور نہ گھٹانے کے قابل۔ آج جو کچھ ہماری زبان پر جاری ہے، اسے نہ دنیا کوئی اہمیت دے گی اور نہ زیادہ دیر تک یاد رکھے گی، لیکن ان بہادروں کے کارناموں کو کبھی بھلایا نہیں جائے گا۔ ہم زندوں کا فرض یہ ہے کہ اس کام کو پورا کرنے کا حلف اُٹھائیں، جسے اُنھوں نے لڑ کر کمالِ شرافت سے تکمیل کے قریب پہنچایا۔ ہمارے لیے یہی ممکن ہے کہ ان کے باقی ماندہ کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنی ساری قوّت و طاقت وقف کر دینے کا عہد کریں۔ ان واجب الاحترام مقتولوں سے اس مقصد کے لیے فداکاری کا تازہ جذبہ حاصل کریں جس کے لیے اُنھوں نے جاں نثاری کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ہمیں یہ دکھانے کا پختہ عزم کر لینا چاہیے کہ ان جوانمردوں نے بے سُود جانیں نہ دی تھیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ یہ قوم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آزادی کا نیا جنم لے گی اور ایسی حکومت روئے زمین سے ناپید نہ ہونے پائے گی جو عوام کی، عوام ہی کے ہاتھ میں اور عوام ہی کی خدمت کے لیے وقف ہے۔"

۱- Andrew Johnson


۱

گرہیم بیل ٹیلی فون تیار کرتا ہے

ایگزانڈر گرہیم بیل[1] (۱۸۴۷-۱۹۲۲ء) نے ۱۸۷۶ء میں ٹیلی فون کی ایجاد مکمل کی جس سے انسانی آواز کو برقی لہروں کی مدد سے کرۂ ارض کے گوشے گوشے میں پہنچانے کا انتظام ہو گیا، لیکن آپ یہ سُن کر یقیناً حیران ہوں گے کہ گرہیم بیل کا اصل مقصد ٹیلیفون ایجاد کرنا نہ تھا، بلکہ وہ اور اس کے والد بہروں اور گونگوں کی تعلیم میں لگے ہوئے تھے۔ گرہیم بیل چاہتا تھا کہ آوازوں کو حرکات میں تبدیل کر دے تاکہ آوازیں اگر بہروں کے کانوں میں نہیں پہنچ سکتیں تو آنکھوں کے ذریعے سے اُنھیں دکھا کر اصلیت تک پُہنچنے کے قابل بنا دیا جائے۔ اس کام سے اس کی دِلچسپی برابر قائم رہی۔ چنانچہ جب حکومت فرانس نے ٹیلی فون کی ایجاد پر اُسے پچاس ہزار فرانک کا انعام دیا تو اس نے یہ رقم اس تجربہ گاہ کے حوالے کر دی جو بہروں کی سہولت کے لیے نئی نئی تدبیروں کی چھان بین میں مصروف تھی۔

اس سے پیشتر بھی بہت سے موجد ٹیلی فون کی ایجاد کے لیے کوششیں کر چکے تھے، لیکن کسی کو پُوری کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ گرہیم بیل نے جس اصُول پر کام کیا، وہ بہت سادہ اور واضح تھا۔ اس نے سوچا کہ باہر جو آواز پیدا ہوتی ہے، وہ ہوا کی لہروں کے ذریعے سے کان میں پہنچتی ہے اور کان کی جھلّی میں حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ یہی حرکت دماغ تک چلی جاتی ہے اور انسان اندازہ کر لیتا ہے کہ آواز کیسی ہے یا کیا کہا گیا ہے۔ اگر جھلّی جیسی دو چیزیں لے کر فاصلے پر رکھی جائیں اور اُنھیں بجلی کے تار کے ذریعے سے ملا کر ایک کی آواز دُوسری تک پہنچائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں حرکت پیدا نہ ہو۔ چنانچہ اسی اصُول پر کام کرتے ہوئے اُس نے لوہے کی دو پتلی سی پتریاں لیں اور اپنے تجربے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۰ مارچ ۱۸۷۶ء کو گرہیم بیل نے سب سے پہلا پیغام اپنے رفیق مسٹر واٹسن کو پہنچایا۔ واٹسن سہ منزلہ مکان کے سب سے نچلے کمرے میں مصروف تھا۔ ارد گرد مشینوں کی گڑگڑاہٹ تھی، جس میں کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ عین اس حالت میں گرہیم بیل کی آواز گُونجی: "مسٹر واٹسن! یہاں تشریف لائیے، مجھے آپ سے کام ہے!"

اس کے بعد ٹیلی فون کی صنعت نے آہستہ آہستہ بے اندازہ ترقی کر لی۔

۱- Alexander Graham Bell



تصویریں حرکت کرنے لگتی ہیں

ٹامس آلوا ایڈیسن نے ۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو اپنی تجربہ گاہ (واقع نیو جرسی) میں نئی ایجاد کے مظاہرے کا انتظام کیا، جس کا نام "کینیٹوسکوپ" رکھا اور آج دُنیا میں یہ سنیما کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اس طرح کی ایک مشین تھی جیسی آج کل بعض لوگ کندھوں پر اُٹھائے پھرتے ہیں اور اسے "سیر بین" کہا جاتا ہے۔ بس جہاں کسی نے چند پیسے دیئے مشین زمین پر رکھی اور چند منٹ کے لیے تصویروں کا تماشا دکھا دیا۔

ایڈیسن نے اس وقت اس ایجاد کو چنداں اہمیت نہ دی۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ بولنے والی جو مشین ایجاد کر چکا ہے، اس کے ساتھ ساتھ تصویریں بھی دکھائی جا سکیں۔ گویا اس نے چالیس سال پیشتر بولنے والی فلموں کا تصوّر قائم کر لیا تھا۔ دو سال بعد اس نے اپنے بنائے ہوئے کیمرے کو رجسٹر کرایا اور ۱۸۹۴ء میں نیو یارک شہر کو پہلے پہل متحرک تصویریں دیکھنے کا شرف حاصل ہُوا۔

متحرک تصویریں تیار کرنے والے کیمرے کے لیے ایڈیسن نے سلولائڈ کے ایک فیتے پر ایسے مسالے لگائے جو روشنی کا اثر ٹھیک ٹھیک قبول کر سکتے تھے اور اس کا نام "فلم" رکھا۔ تصویروں کے متحرک اور چلتے پھرتے نظر آنے کا راز یہ ہے کہ ہر تصویر سیکنڈ کے ایک حصّے کے لیے آنکھ کے پردے پر جمی رہتی ہے۔ پھر بہت ہی قلیل وقفے تک کوئی تصویر سامنے نہیں ہوتی۔ اس کے بعد دُوسری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس طرح پہلی سے دوسری تصویر کا نقش ملتا جاتا ہے اور ایک چلتا پھرتا سلسلہ نظروں کے سامنے قائم ہو جاتا ہے۔

آج کل کی متحرک تصویروں کی فلم ایک چرخی پر لپٹی ہوتی ہے اور ایک جانب کی چرخی سے تیز روشنی میں کھلتی اور دوسری جانب کی چرخی پر لپٹتی جاتی ہے۔ روشنی تصویروں کا سایہ سامنے لٹکے ہوئے سفید پردے پر ڈالتی ہے اور ایک سیکنڈ میں چوبیس مختلف تصویریں سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ ہر تصویر کے درمیان ایک وقفہ ہوتا ہے جو ایک سیکنڈ کے ۱/۶۰ یا ۱/۱۰۰ حصّے کے برابر سمجھنا چاہیئے۔

ایڈیسن کی ایجاد سے متحرک تصویروں کی صنعت جاری ہوئی۔ اس صنعت نے محض تفریحی مشاغل ہی میں انقلاب پیدا نہیں کیا، بلکہ اب فلمیں تعلیم دینے کا بھی ایک مؤثر ذریعہ بن گئی ہیں۔



گھوڑے کے بغیر گاڑی چلتی ہے

امریکہ کی ایک ریاست مساچوسٹس[1] میں سپرنگ فیلڈ[2] ایک جگہ ہے، وہاں ستمبر ۱۸۹۳ء میں گھوڑے کے بغیر چلنے والی گاڑی کے کامیاب تجربات کیے گئے جس سے گھوڑا گاڑی کا دور ختم ہو گیا اور دنیا میں ایک نئی عظیم الشان صنعت وجود میں آئی۔

پندرھویں صدی ہی میں اس بات کا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ میکانکی آلات کے ذریعے سے نقل و حرکت ہو سکتی ہے۔ لیونارڈو دا ونچی[3] (ایک مشہور اطالوی مصور جس نے مونا لزا[4] کی شہرۂ آفاق تصویر بنائی) نے بھاپ سے چلنے والی گاڑی کا بھی منصوبہ تیار کیا تھا۔ نکولاس کوگ نو نے ۱۸۷۰ء میں پہلے تین پہیے کی ایک گاڑی گھوڑے کے بغیر چلائی۔ اگرچہ یہ بہت بھونڈی تھی تاہم جن موٹر گاڑیوں سے ہم آگاہ ہیں، وہ ایک ایسی ایجاد کے بعد سکیں جو انیسویں صدی کے اواخر میں ہوئی، یعنی داخلی اشتعال پذیری سے چلنے والا انجن۔

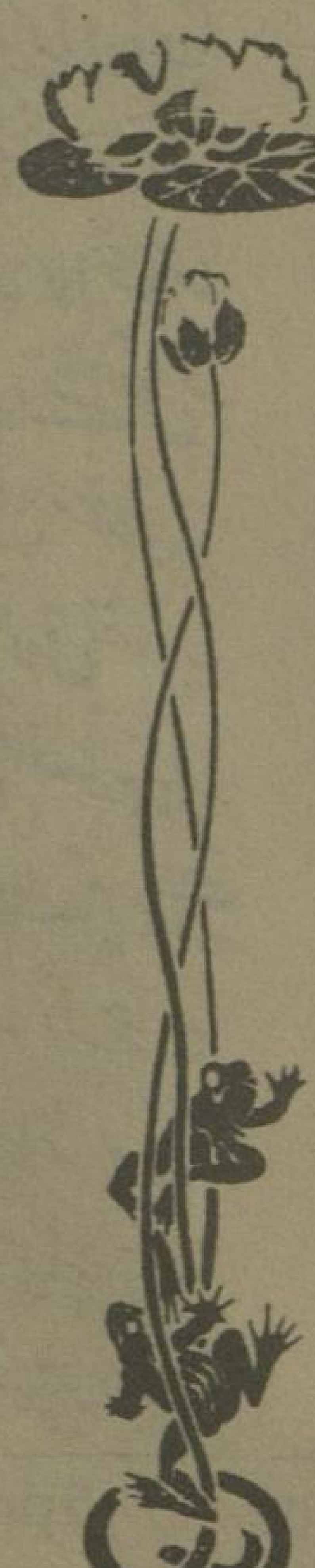
۱۸۹۲ء میں چارلس دوریا[6] نے نئی موٹر گاڑی کا ڈھانچا اس خیال سے تیار کیا کہ اس کا بھائی فرینک اس کے لیے ایک موزوں انجن تیار کر دے گا۔ ستمبر ۱۸۹۳ء تک فرینک نے نئے انجن کی میکانیکی مشکلات پر قابو پا لیا اور صرف ایک امر باقی رہ گیا کہ اس گاڑی کی رفتار بڑھانے، گھٹانے یا اسے حسبِ منشا روکنے کا کیا بندوبست ہو۔ فرینک نے پہلی مرتبہ انجن چلایا تو گاڑی قابو میں نہ رہ سکی اور دیوار سے جا ٹکرائی۔ جس شخص نے اس ایجاد میں سرمایہ لگایا تھا، وہ بھی موقع پر موجود تھا۔ گاڑی کا نظارہ دیکھنے کے بعد اسے مزید سرمایہ لگانے میں تامل نہ ہوا۔ غرض دونوں بھائیوں نے آٹوموبائل بنانے کے لیے ایک کمپنی

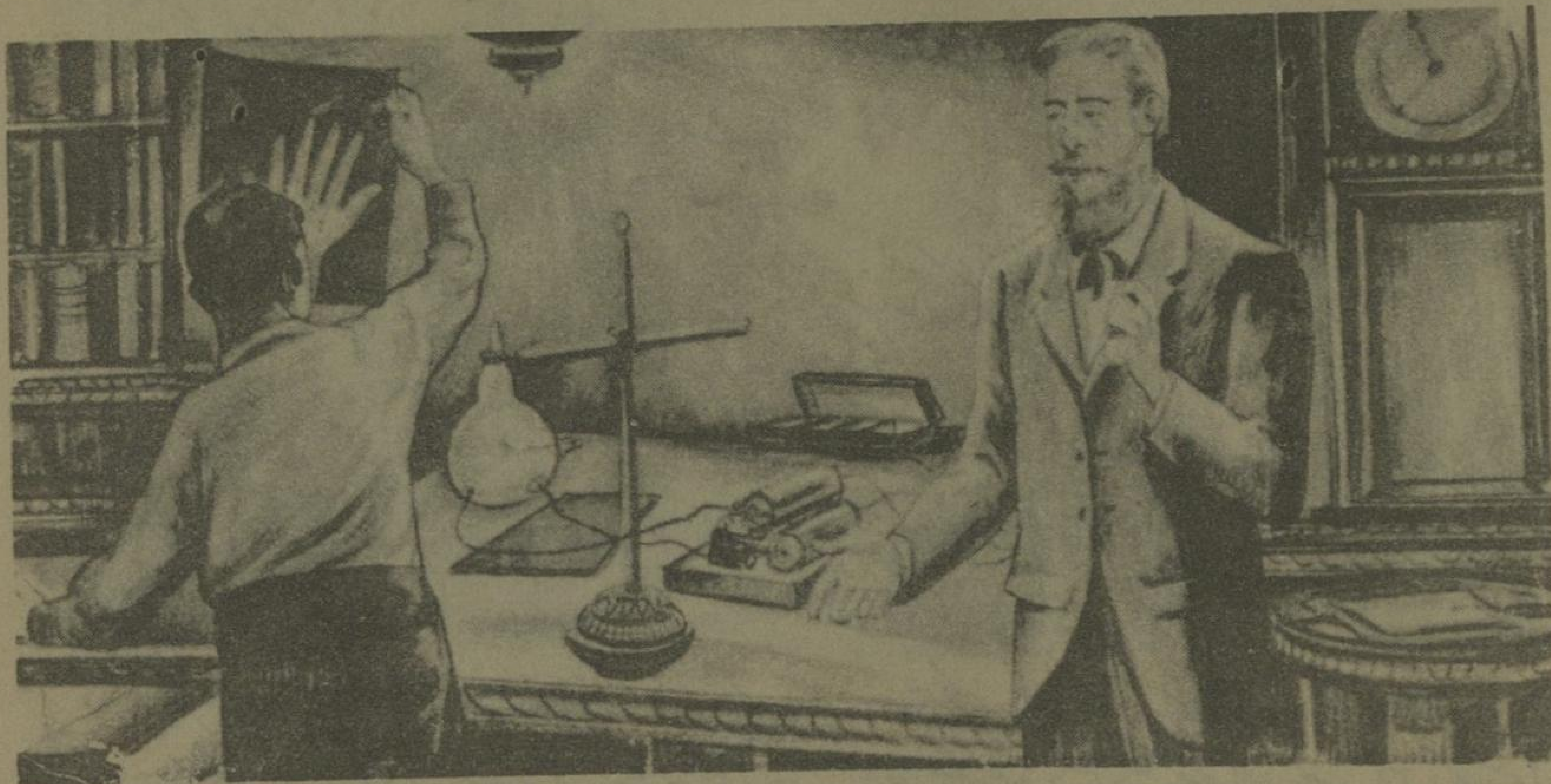
۱- Massachusetts ۲- Springfield ۳- Leonardo da Vinci ۴- Mona Lisa
۵- Nicol. Cugnot ۶- Charles Duryea

گی بنیاد رکھ دی۔ پھر ہنری فورڈ، چارلس کنگ اور دُوسرے لوگ اس صنعت کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ صنعت اوجِ کمال پر پہنچ گئی۔ آج صرف امریکہ میں پانچ لاکھ سے زیادہ آدمی اس صنعت میں مصروف ہیں اور اس سے متعلقہ صنعتیں جمہوریۂ امریکہ کی تمام ریاستوں سے خام مال لیتی ہیں۔

ساٹھ باسٹھ سال پیشتر جمہوریۂ امریکہ میں کل تین سو باسٹھ موٹریں تھیں، جن میں سے امریکی ساخت کی موٹریں صرف چار تھیں۔ آج جمہوریہ کے ہر پانچویں فرد کے پاس ایک موٹر ضرور ہے۔ پھر اس ایجاد نے ملک کی زراعت میں بھی زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے اور زرعی فارموں نے کارخانوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

اگر آپ ترقی یافتہ ملکوں خصوصاً امریکہ میں جا کر دیکھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ موٹروں کے ذریعے کس قدر کام کتنی تیزی سے انجام پا رہے ہیں۔ ہر قسم کا سامان ٹرکوں میں لایا جاتا ہے۔ لمبے لمبے سفر لاریوں اور بسوں میں کیے جاتے ہیں۔ بھاری اور مضبوط اور نازک چیزیں ایک جگہ سے دُوسری جگہ پہنچائی جاتی ہیں۔ ٹریکٹر، بل ڈوزر اور خدا جانے کیا کیا چیزیں تیار کر لی گئی ہیں جن کے ذریعے بڑے کٹھن کام حد درجہ آسانی سے اور بہت کم مُدّت میں انجام پاتے ہیں۔ پھر ساتھ ساتھ موٹروں کے سلسلے میں ایسی سہولتیں مہیا کر دی گئی ہیں کہ کسی کو تکلیف نہ ہونے پائے۔ کئی ٹرک مرمّت کا پُورا سامان لیے ہوئے جگہ جگہ چکّر لگاتے رہتے ہیں، تاکہ جہاں کسی کی موٹر میں خرابی پیدا ہو، وہاں پہنچ کر اُسے جلد سے جلد دور کر دیں۔





نئی شعاع کا سُراغ ملتا ہے

جرمن پروفیسر وِلہلم کانراڈ رونٹ جن[1] (۱۸۴۵-۱۹۲۳ء) نے اتّفاقیہ ۱۸۹۵ء میں ایکس رے[2] دریافت کرلی اور طبّی دُنیا نے دریافت کی اہمیّت کا اندازہ کرتے ہوئے اس سے کام لینا شروع کر دیا۔ پروفیسر موصوف کے اعلان سے چند روز بعد ایک امریکی ڈاکٹر کے پاس کوئی مریض آیا جس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ ڈاکٹر نے ایکس رے کے ذریعے گولی کی جگہ معلوم کرلی۔ دُنیا کے مختلف حصّوں میں دُوسرے ڈاکٹروں نے ایسے ہی تجربات کیے۔ برطانوی سائنسدان سر ہربرٹ جیکسن نے چھان بین کرتے ہوئے ایک ایسا آلہ تیار کرلیا جو انسانی جسم کے معائنے کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ اسے نمونے کے طور پر سامنے رکھ کر آیندہ زیادہ عمدہ آلے بنائے گئے۔

ایکس رے کی دریافت کا قصّہ بڑا دلچسپ ہے۔ پروفیسر رونٹ جن شیشے کی ایک نلکی میں سے بجلی کی رَو گزار رہا تھا۔ نلکی کے اوپر سیاہ کاغذ لپٹا ہُوا تھا اور اس میں سے ہوا بالکل نکال دی گئی تھی۔ اگرچہ بجلی کی رَو میں سے روشنی نلکی کے اندر نظر نہ آسکتی تھی، تاہم پروفیسر نے دیکھا کہ پاس پلاٹینم کے جو ذرّے پڑے ہُوئے ہیں وہ خوب چمک رہے ہیں۔ اس نے نلکی اور ذرّوں کے درمیان کئی چیزیں رکھ کر تجربہ کیا۔ روشنی کی لہریں بدستور تمام چیزوں سے گزرتی رہیں حالانکہ عام حالات میں وہ چیزیں روشنی کی لہروں کو روک لیتی ہیں۔

اُسے یہ اندازہ تو ہوگیا کہ نئی دریافت طب کے لیے خاصی مفید ہوگی، مگر وہ اس کی حقیقت سے بالکل ناواقف تھا، لہٰذا اس کا نام "ایکس رے" رکھا، کیونکہ غیر متعیّن اشیاء کو عمومًا "ایکس" کہتے ہیں۔ بعدازاں سائنس دانوں نے اسے پروفیسر کے نام سے موسُوم کرنے کی کوشش کی، لیکن عام لوگوں کی

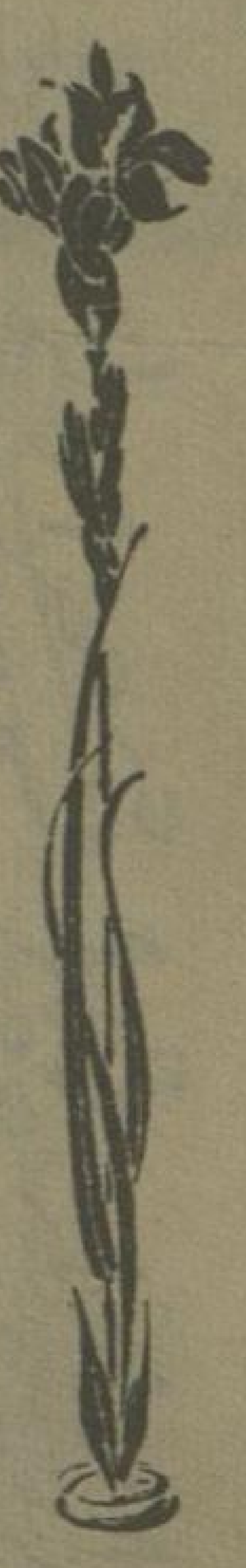
[1] Wilhelm Konrad Roentgen
[2] X-ray

زبان پر اس کا نام ایکس رے ہی رہا۔

آگے چل کر سائنس دانوں نے دریافت کر لیا کہ روشنی کی جو لہریں نظر آتی ہیں، ان کے مقابلے میں ایکس رے کی لہریں چھوٹی ہوتی ہیں اور انھیں بجلی یا مقناطیس سے موڑا نہیں جا سکتا۔ انجینیروں نے ایکس رے کی خاص نلکیاں بنا لیں جنھیں ضرورت کے مطابق مختلف اشیاء کے اندر کم و بیش گہرائی تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ استعمال ہونے والی لہروں کی مقدار ایک فیصلہ کن عامل بن گئی۔

پھر اسی کے ذریعے سینے اور جسم کے دوسرے حصّوں کی ہڈیوں کی تصویریں لی جانے لگیں، تاکہ دیکھا جا سکے کہ ہڈی کہاں سے ٹوٹی ہے اور اس کی شکست کا کیا حال ہے۔ علاوہ بریں ایکس رے کو جواہرات کے نقائص یا قیمتی تصویروں کی نقّالی کی دریافت کے لیے استعمال کرنے لگے۔ دھاتوں کے ماہروں کو مختلف قسم کی آمیزشوں کے متعلّق ضروری حقائق معلوم ہونے لگے۔

سائنس دانوں نے جو دریافتیں کیں شروع میں اکثر ان کے فائدے محدود سمجھے گئے، مگر آہستہ آہستہ ان کی قدر و قیمت کا احساس بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ان سے کئی ایسے کام لیے جانے لگے جن کے متعلّق شروع میں کسی کو خیال تک نہ تھا، بالکل یہی کیفیت ایکس رے کی ہے۔ اس سے جو کام آج کل لیے جا رہے ہیں اور مختلف صورتوں میں یہ جتنی مفید ثابت ہو رہی ہے، اس کا صحیح اندازہ ابتدا میں کسی کو کب تھا اور ابھی کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ کہاں کہاں کیا کیا کام دے گی۔



١



ریڈیم دریافت ہوتا ہے

پیرس میں پی ایر کیوری (۱۸۵۹-۱۹۰۶ء) اور اس کی بیوی مادام ماری کیوری کی تجربہ گاہ ساز و سامان کے اعتبار سے بہت معمولی حیثیت رکھتی تھی، تاہم اس میں تجربے کرتے کرتے انھوں نے ۱۸۹۸ء میں ریڈیم دریافت کر لیا جس نے مرض سرطان کے علاج کا ایک مؤثر ذریعہ پیدا کر دیا۔ نیز مادے کی ہیئت ترکیبی کے متعلق ہمیں نئی روشنی مل گئی اور اسی روشنی میں ہم آگے بڑھتے بڑھتے موجودہ دور میں پہنچ گئے، یہاں تک کہ ذرّے کو توڑنے اور اٹیم کی بے پناہ قوّت حاصل کرنے کا راز بھی ہم پر آشکارا ہو گیا۔

دونوں میاں بیوی یورینیم کی تابکاری کے متعلق تحقیقات میں لگے ہوئے تھے۔ انھیں اچانک محسوس ہوا کہ ان کے برق نما میں روشنی کی ایسی لہریں پیدا ہو رہی ہیں جن کا کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا۔ خوب غور اور چھان بین کے بعد ان پر آشکارا ہوا کہ خام یورینیم کی تابکاری یورینیم کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ وہ تحلیل و تجزیے میں لگے رہے اور آہستہ آہستہ تابکار اجزا کو الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آخر انھیں دو نئے عنصر نہایت قلیل مقدار میں مِل گئے۔ ایک کا نام اُنھوں نے ریڈیم رکھا اور دُوسرے کا بیریم۔ ان دونوں کی تابکاری بہت اعلیٰ پیمانے پر پہنچی ہوئی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں مادام کیوری نے محنت و مشقّت سے خالص ریڈیم کو الگ کر لیا۔

طبیعیات کا ایک اُصول قوّت کا تحفّظ ہے لیکن ریڈیم سے متواتر حرارت اور روشنی نکلتے رہنے کی بنا پر شروع میں خیال ہوا کہ مذکورہ بالا اصول غلط ثابت ہو رہا ہے، آخر سائنس دان غور کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچے کہ عنصر پر برابر انحلال کا عمل جاری رہتا ہے۔ ہر ذرّہ اپنی قوّت باہر پھینکتے پھینکتے جو حصّہ الگ کرتا ہے، وہ ایک اور عنصر کی شکل میں

Marie Curie -- Pierre Curie -۱

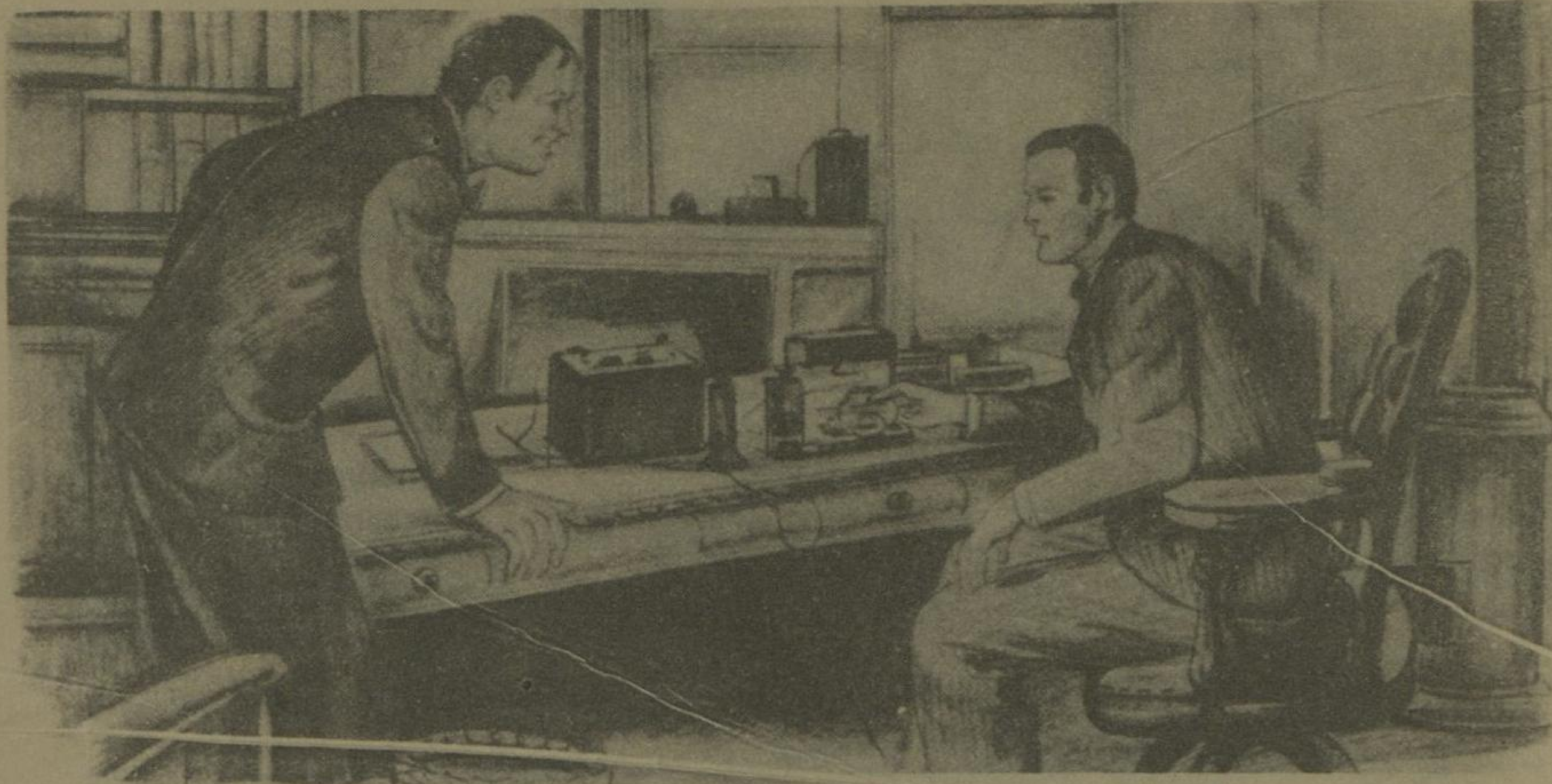
تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا نام پولونیم تجویز ہوا۔

ریڈیم کے تحلیل ہونے سے جو روشنی کی تین شعاعیں پیدا ہوتی ہیں ان کے نام الف، ب اور ج رکھے گئے۔ الف شعاع اور شعاع ب دراصل نہایت باریک ذرّے ہیں اور ج روشنی کی عام شعاعوں جیسی شعاع ہے۔ اسے گھڑیوں کے ڈائلوں میں ہندسوں کو روشن کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ الف شعاع کے ذرّات ہیلیم سے مرکّب ہیں اور ان کا چارج مثبت ہے۔ اس کے برعکس ب شعاع کے اجزا برق پارے ہیں جن کا چارج منفی ہے۔ الف شعاع اور ب شعاع ہی کو طبابت میں جسمِ انسانی کے ان فاسد پھوڑوں پر استعمال کیا جاتا ہے جن کی جڑیں بہت گہری ہوں۔

پی اَیر کیوری اور ماری کیوری کے انکشاف کو مادے کے ذرّات کی تحقیقات میں جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ جب ایٹم بم کے لیے چھان بین کرتے کرتے ایک نیا عنصر سامنے آیا، تو اس کا نام مذکورہ بالا سائنس دانوں کے نام پر "کیوریم" رکھا گیا۔

سر آغا خاں نے اپنے سوانح حیات میں ریڈیم کے متعلّق ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ ایران کا بادشاہ مظفر الدّین یورپ گیا تو قیام پیرس کے زمانے میں اس نے ریڈیم دیکھنے کی بھی خواہش کی۔ سر آغا خاں نے اپنے اثر سے کام لے کر پی اَیر کیوری اور ماری کیوری کو ریڈیم دکھانے پر راضی کر لیا۔ جہاں مظفر الدّین شاہ ٹھہرا ہوا تھا اس کی نچلی منزل میں سیاہ پردے تان کر اندھیرا کر لیا گیا۔ جب بادشاہ اور اس کے مصاحب کُرسیوں پر بیٹھ گئے تو بتّیاں گُل کر دی گئیں اور ریڈیم سامنے میز پر رکھ دیا گیا۔

ریڈیم کی چمک دمک دیکھ کر بادشاہ پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ چیخنے لگا اور بولا کہ یہ مجھے قتل کرنے کی تدبیر ہے۔ دونوں سائنسدان اس پر بہت رنجیدہ ہُوئے۔ بعد میں بادشاہ نے ان کے لیے خاص سنہری تمغے بنوائے لیکن انھوں نے قبول نہ کیے۔



مارکونی بے تار پیغامات بھیجتا ہے

اطالوی سائنسدان مارکونی (ولادت ۱۸۷۶ء) کی عمر ستائیس سال کی تھی جب اس نے ۱۹۰۱ء میں لاسلکی پیغامات یورپ سے امریکہ بھیجنے کا پہلا کامیاب تجربہ کیا۔ اس نے ایک مرکز کارنوال (انگلستان) میں بنایا اور دوسرا سینٹ جان (نیو فونڈ لینڈ امریکہ) میں۔ کارنوال سے بجلی کے ذریعے جو اشارے بھیجے گئے وہ سینٹ جان میں پہنچ گئے حالانکہ بیچ میں تار کا کوئی سلسلہ موجود نہ تھا۔ تین ہزار میل چوڑا سمندر بھی ان میں رکاوٹ نہ ڈال سکا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ کرۂ ارض کا خم بجلی کی لہروں کو روک نہیں سکتا۔ چنانچہ تار کے بغیر دنیا کے ہر حصے میں پیغام رسانی کا سلسلہ جاری کر دینا ایک مثبت حقیقت بن گیا۔

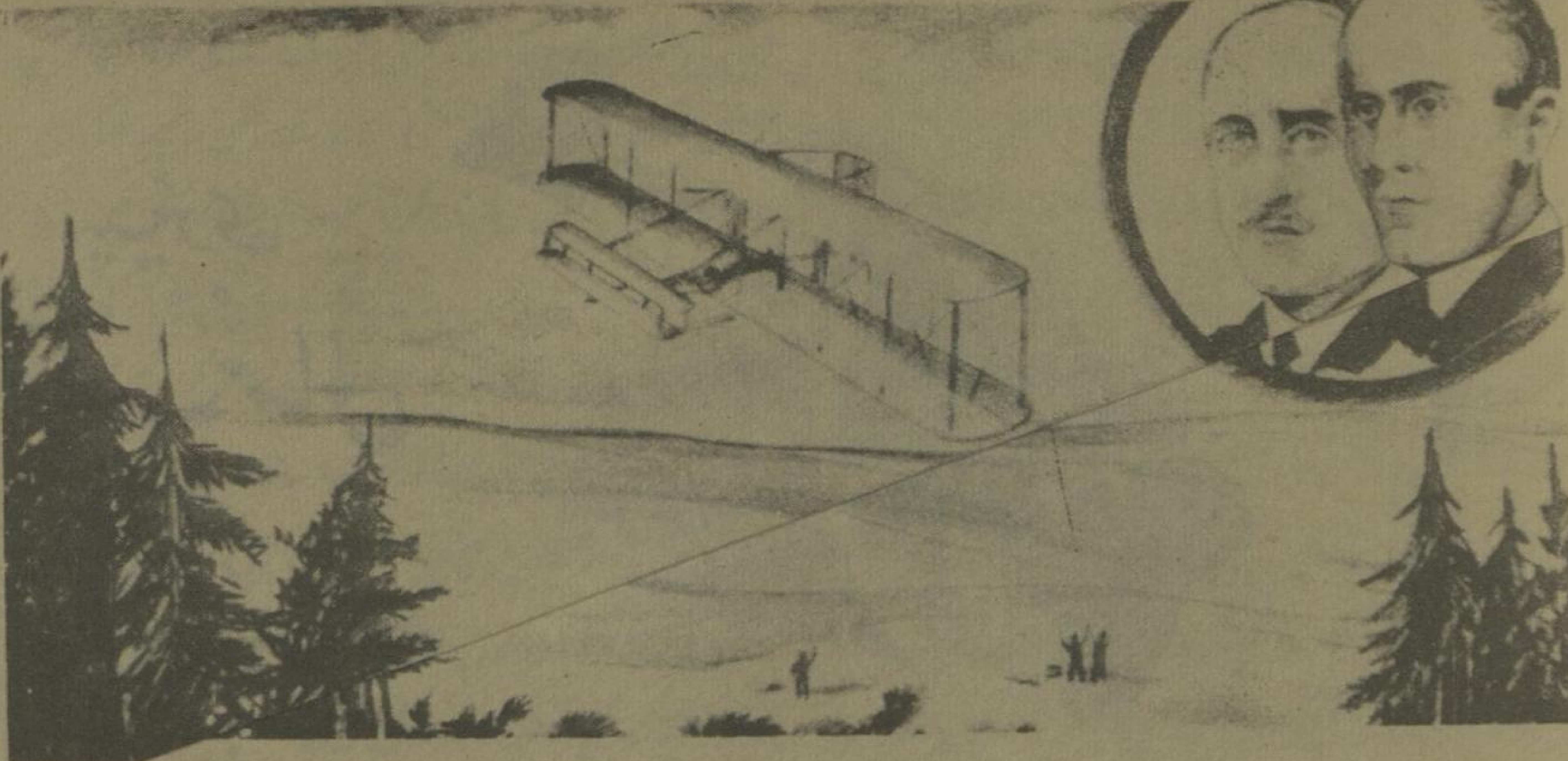
گگلی ایلمو مارکونی[1] دولت مند والدین کا بیٹا تھا۔ اس کی تعلیم زیادہ تر گھر پر ہوئی۔ برقیات سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ ہائنرش ہرٹز[2] نے بجلی اور مقناطیس کی لہریں دریافت کر لیں تو یہ دریافت مارکونی کے سمندِ شوق کے لیے تازیانہ بن گئی۔ اس نے تجربات کے بعد نیا آلہ تیار کر لیا جو پہلے سائنس دانوں کے آلوں سے بہتر تھا۔ بائیس سال کی عمر میں اس نے ایک ایسی مشین ایجاد کر لی، جس کے ذریعے بغیر تار کے دو میل کے فاصلے پر پیغامات بھیجے جا سکتے تھے مگر اس کے اہلِ وطن نے اس ایجاد کی کوئی قدر نہ کی، لہٰذا وہ انگلستان چلا گیا، جہاں اسے قدر دان انجینیروں کے مل جانے کی امید تھی۔ وہاں اسے صرف روپیہ ہی نہ ملا، سائنس دانوں کی تائید و حمایت بھی حاصل ہو گئی اور اپنی ایجاد کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کا موقع مل گیا۔

مارکونی کے سامنے کلارک میکسویل[3] اور ہائنرش ہرٹز کی نظری تحقیقات موجود تھیں جن میں ریڈیائی لہروں کی حقیقی حیثیت واضح کی گئی تھی۔ مارکونی نے ان نظری تحقیقات کو عملیات کی سطح

۱۔ Guglielmo Marconi. ۲۔ Heinrich Hertz ۳۔ Clerk Maxwell

پر پہنچا دیا۔ اس کی ایک خوش نصیبی یہ تھی کہ جب سے اس نے اپنی تحقیقات کو برقی خبر رسانی کے لیے استعمال کیا، ان تحقیقات کو نامور سائنس دانوں، انجینیئروں اور ماہرینِ فنونِ لطیفہ کے ہاتھوں سے گزرنے کا موقع ملا۔ اس طرح وہ ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہو گئیں، نیز وہ اطلاعات، تفریح اور اشتہار کے علاوہ نفسیاتی جنگ میں بھی ایک زبردست حربہ بن گئیں۔ مادی جنگ میں بھی وہ حد درجے قیمتی ہتھیار ہیں۔ موجودہ دور کے وسیع لشکروں میں سب سے بڑھ کر اہم اور ضروری چیز یہ ہے: کہ اطلاعات جلد سے جلد ہر جگہ پہنچائی جا سکیں اور ظاہر ہے کہ فوجوں کے مختلف حصے ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر حصے کی خبریں سپہ سالار کو وقت پر ملتی رہیں تاکہ وہ ایک حصے کی کیفیت پیش نظر رکھ کر دوسرے حصوں کو مناسب حکم دے سکے۔

ان اطلاعات کے لیے ریڈیو سے بہتر ذریعہ کونسا ہے! ادھر خبر نشر ہوئی اُدھر جہاں اسے پہنچانا مقصود ہے پہنچ گئی۔ اس میں ایک مشکل تھی اور وہ یہ کہ دشمن کے لیے بھی ان خبروں سے فائدہ اٹھا لینے کے امکانات موجود تھے۔ اس کا علاج یہی تھا کہ ایسی تمام خبریں رمز و کنایے کی شکل میں نشر کی جاتیں، تاکہ اپنوں کے سوا کوئی انھیں سمجھ نہ سکے، یہی کیا گیا۔ تار کے بغیر صرف برقی لہروں کے ذریعے پیغامات بھیجنے کے بے شمار فائدوں کا اندازہ کیجیے۔ نئی نئی تحقیقات کے لیے مہمیں دور دور بھیجی جاتی ہیں۔ ریڈیو کے ذریعے ان کے ساتھ برابر تعلق قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اکا دکا جہاز سمندر کی وسعت میں کہیں خطرے میں پڑ جائے یا اُسے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو دور دور تک فوراً اطلاع پہنچائی جا سکتی ہے اور جگہ جگہ سے امدادی جماعتیں موقع پر پہنچ سکتی ہیں۔

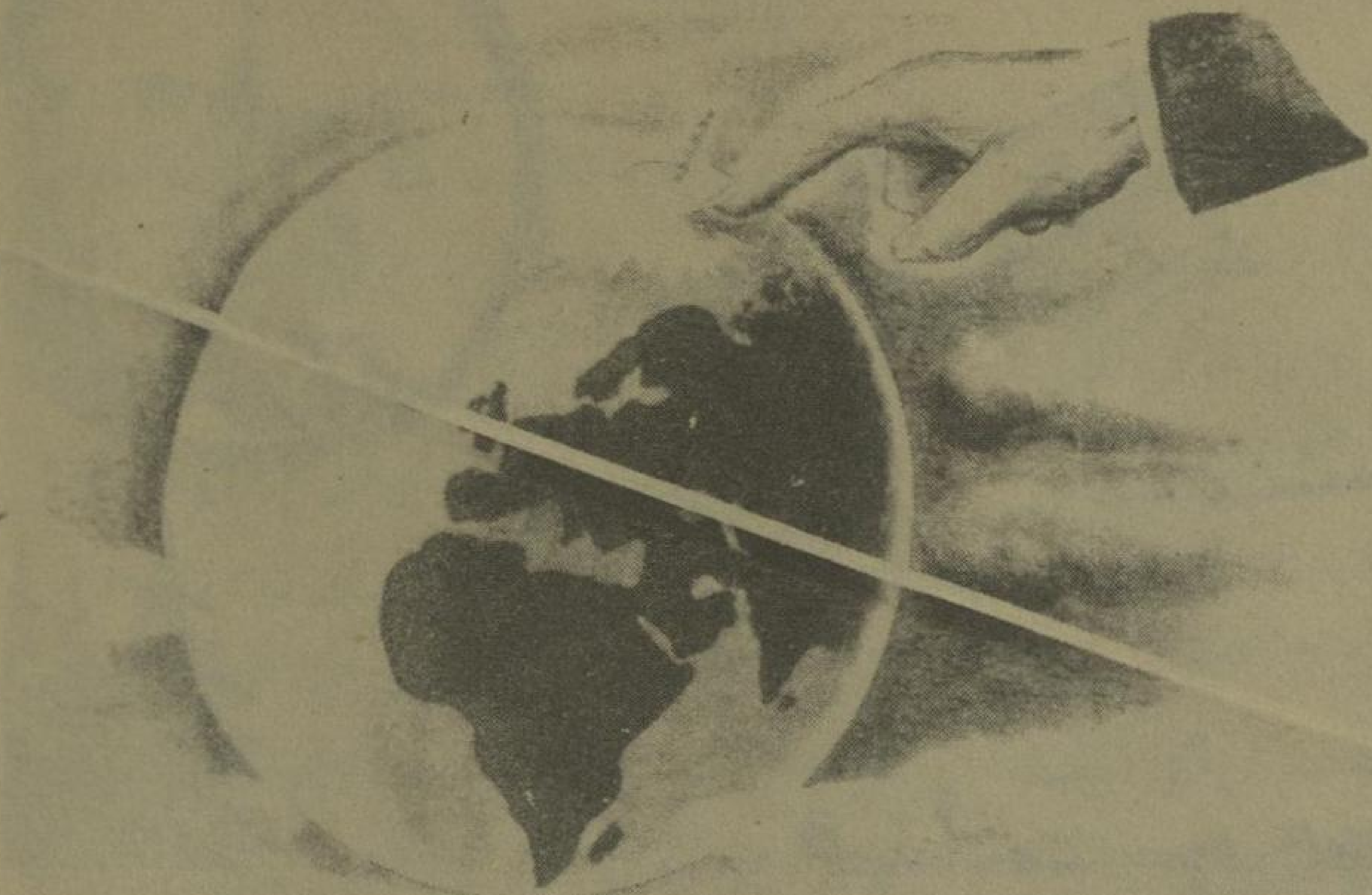


پہلا ہوائی جہاز اُڑتا ہے

اب انسان چاند میں پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے اور فضائے محیط میں پرواز کرتے ہوئے چاند تک پہنچ جانا سائنسدانوں کے لیے ایسا مسئلہ نہیں رہا کہ اس کے امکان میں قیل و قال کی جائے، بلکہ اب یہ اندازہ کیا جارہا ہے کہ اس مہم پر خرچ کتنا ہوگا۔ ان حالات میں ولبر رائٹ اور آرویل رائٹ کسے یاد رہیں، جنھوں نے سب سے پہلے امریکہ میں پرواز کی تھی۔

جب ان بھائیوں نے فضائے آسمانی میں پرواز سے دلچسپی کا اظہار کیا تو صورتِ حال ایسی تھی کہ لوگ زمین سے اُوپر اُٹھنے کے امکانات کو چنداں وقعت نہ دیتے تھے۔ ولبر اور آرویل نے بہت جلد معلوم کرلیا کہ ہوائی حرکیات کے بارے میں جتنے نظریات موجود ہیں، ان میں سے بیشتر اصل مقصد سے ہٹے ہوئے ہیں۔ انھوں نے خود ہوا کا ایک نل بنایا جس میں پرواز کے متعلق خود ہی تجربات کرتے رہے۔ وہ دونوں غیر شادی شدہ تھے۔ دن بھر سائیکل کی دُکان میں کام کرتے، گھر واپس آکر اپنا سارا وقت تجربوں میں گزارتے۔

آخر انھوں نے کنٹرول کا ایک ایسا نظام دریافت کرلیا جس کے ذریعے سے ہوا کا دباؤ مشین کے مختلف حصّوں پر بدلتا رہتا تھا اور اسے رجسٹر کرالیا۔ ہوا کے نل میں جو تجربات کرتے رہے تھے، ان کی بنا پر انھوں نے قبل از وقت اعلان کردیا کہ ہم ہوا میں پرواز کا مظاہرہ کریں گے۔ چنانچہ ایک ایسا جہاز تیار کرلیا جس میں ابتدائی تخمینے کے خلاف ایک چوتھائی سے نصف تک قوت صرف ہوتی تھی۔ ان کا جہاز چار سلنڈر کا تھا۔ اس میں بارہ گھوڑوں کی طاقت کا انجن لگایا گیا جو پٹرول سے چلتا تھا۔ ایک مسافر کے وزن کو شامل کرکے جہاز کا کل وزن ساڑھے سات سو پونڈ تھا۔ دسمبر ۱۹۰۳ء میں یہ جہاز کٹی ہاک پہنچا۔ ۱۷ دسمبر کو آرویل نے اس میں چار مرتبہ پرواز کی۔ جہاز قریباً ایک منٹ ہوا میں رہا اور صرف تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے پرواز کرسکا مگر آج کل تو ہوائی جہاز ترقّی کرکے کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں۔



پیئری۔ قطب شمالی پر پہنچتا ہے

۶/ اپریل ۱۹۰۹ء کو کمانڈر رابرٹ ایڈون پیئری (۱۸۵۶-۱۹۲۰ء) قطب شمالی پر پہنچ گیا۔ کرۂ ارض کے انتہائی شمالی حصے کا یہ مرکزی نقطہ ہے جسے ہماری دُنیا کا بلند ترین مقام سمجھا جاتا ہے۔ پانچ اور آدمی پیئری کے ہمراہ تھے۔ وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرے۔ خوب چھان بین کر لی کہ آیا وہ واقعی عرض البلد کے ۹۰ درجے پر پہنچ گئے ہیں۔ آس پاس کے سمندر کی گہرائی کا اندازہ کیا۔ پھر اپنے جہاز پر لوٹ آئے جس کا نام "روز ویلٹ" تھا اور وہ قطب شمالی کے سفر کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے بنایا گیا تھا۔ پورے سفر میں صرف ایک جان تلف ہوئی۔

اس مہم کو سر کرنا آسان نہ تھا اور نہ یہ ایک جست میں سر ہوئی۔ خود پیئری نے اس سلسلے میں چار مرتبہ کوششیں کیں اور آخری کوشش ہی میں کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھا۔ وہ پہلی مرتبہ ۱۸۹۲ء میں گیا۔ اس سفر میں بیوی کو بھی ساتھ لے گیا لیکن ۸۳ عرض البلد سے ذرا آگے بڑھ کر اسے لوٹنا پڑا۔ ۱۹۰۲ء میں اس نے پھر کمر ہمت باندھی اور اپنے ایک حبشی رفیق ہن سن کے ساتھ تھوڑا سا اور آگے بڑھا۔

اس کی جانفشانی اور بلند ہمتی کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ایک خاص جہاز اس کے لیے تیار کر دیا گیا۔ یہ جہاز قطب شمالی کے سمندر میں سفر کے لیے بہت موزوں تھا، جہاں برف کے تودے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں پیئری اس جہاز پر روانہ ہوا۔ دو سال کا سامانِ رسد ساتھ لے لیا تھا۔ سخت سردی کا موسم گرین لینڈ میں گزارنے کے بعد پیئری اور اس کے ساتھی ۲۱/ فروری ۱۹۰۶ء کو برف گاڑیوں میں چل پڑے، جن میں پہیے نہیں ہوتے اور کتے ان گاڑیوں کو برف پر کھینچتے ہیں، لیکن ۸۴ عرض البلد اور ۸۵ عرض البلد کے درمیان انھیں رُکنا پڑا، اس لیے کہ وہاں پانی پر برف نہیں جمی تھی لہٰذا برف گاڑیاں کام نہ دے سکتی تھیں۔ پھر ایک طوفان آیا جو چھ دن برابر جاری رہا۔ اس میں خبر رسانی کے سلسلے کٹ گئے اور رسد کے جو مرکز جگہ جگہ قائم کیے گئے تھے، وہ برباد ہو گئے۔ ناچار ۲۱/ اپریل ۱۹۰۶ء کو انھیں واپس ہونا

۱- Robert Edwin Peary

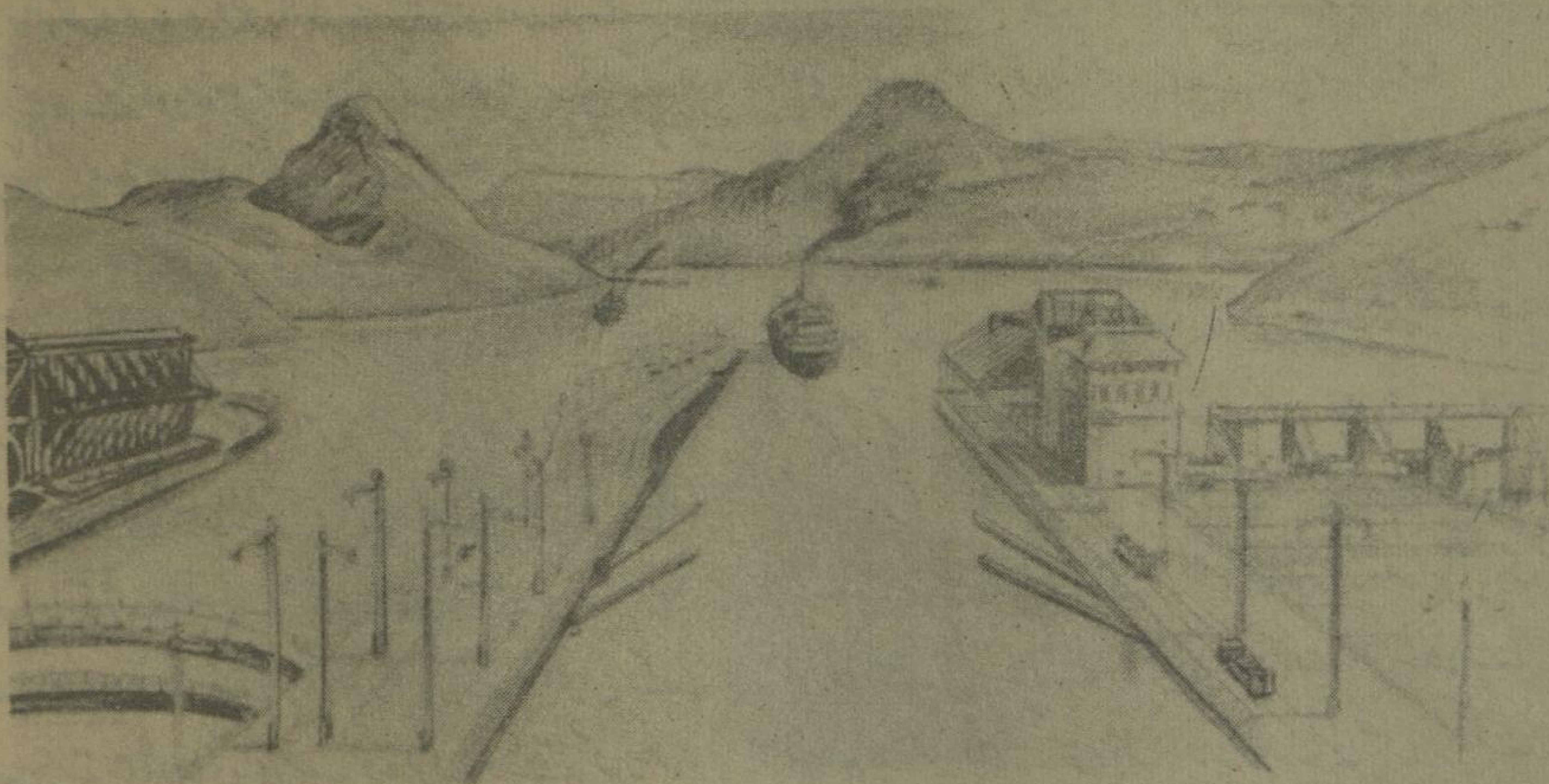
پڑا۔ حالانکہ وہ ۸۷° ۶' عرض البلد سے بھی کسی قدر آگے بڑھ چکے تھے اور منزلِ مقصود نزدیک معلوم ہوتی تھی۔ واپسی کے سفر میں بھی انھیں بہت تکلیفیں پیش آئیں۔

۱۹۰۸ء میں پیئری نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب کے قطب شمالی پر پہنچے بغیر نہ لوٹے گا۔ چنانچہ وہ ۲۱ اگست کو روانہ ہُوا۔ اس مرتبہ بھی سردی کا موسم گرین لینڈ میں گزارا۔ پھر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائیں۔ ہر ٹولی تھوڑے تھوڑے وقفے سے روانہ ہوئی۔ اس سے یہ فائدہ ہُوا کہ اگلی ٹولی بعد میں آنے والوں کے لیے راستہ بناتی جاتی اور جب وہ لوگ دیکھتے کہ رسد کم ہو رہی ہے تو ان ساتھیوں کو واپس کر دیتے جو بیمار یا کمزور ہوتے۔ منزل کا آخری حصّہ صرف پیئری، ہن سن اور ان کے چار ساتھیوں نے طے کیا۔ ان کے جوش اور بلند حوصلگی کا یہ عالم تھا کہ قطب شمالی سے ایک میل آگے تک بڑھے چلے گئے۔

بہر حال وہ ڈیڑھ دن قطب شمالی پر ٹھہرے رہے۔ ان کی مشکلات کا اندازہ یُوں ہو سکتا ہے کہ اس سفر میں بعض مقامات پر تپش منفی ۲۷ سے بھی نیچے تھا۔

۱۹۱۱ء میں پیئری کو نائب امیر البحر کا منصب دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے وفات پائی۔ پھر ہوائی جہازوں کی دَوڑ شروع ہوئی تو ۱۹۲۶ء میں امریکہ کے امیر البحر رچرڈ برڈ[1] کا ہوائی جہاز سب سے پہلے قطب شمالی کے مرکزی نقطے پر پہنچا۔ شروع میں قطب شمالی تک پہنچنے کے لیے برف، قلتِ خوراک، بے آبادی اور فاصلے کی مشکلات حائل تھیں۔ اب وہ مشکلات ایک حد تک دُور ہو گئی ہیں اور فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے ضروری معلومات بہم پہنچانے کا زیادہ خطرناک مسئلہ سامنے آ گیا ہے۔ اب یہ اندازہ کیا جا رہا ہے کہ جنگی جہازوں کو مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق کی طرف لانے لے جانے میں قطب سے کیا کیا کام لے سکتے ہیں۔ قطب شمالی کے موسم کے متعلق بھی قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

۱- Richard Byrd



نہر پانامہ کا افتتاح ہوتا ہے

نہر پانامہ دُنیا کی بہت بڑی آبی شاہراہ ہے، جسے جمہوریہ امریکہ نے خاکنائے پانامہ کو کاٹ کر تیار کیا تھا۔ اس نہر نے اوقیانوس (اٹلانٹک) کو بحر الکاہل سے ملا دیا ہے۔ اگرچہ جہاز اس میں سے پہلے ہی گزرنے لگے تھے، لیکن اس کے افتتاح کی رسم سرکاری طور پر تھیوڈر روزویلٹ صدر جمہوریہ امریکہ نے ۱۲ جولائی ۱۹۱۵ء کو ادا کی۔ دُنیا میں اسے انجینیئری کے عجائبات کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔

اس نہر کی کُھدائی ۱۹۰۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کے لیے ریاست پانامہ سے دائمی پٹے پر زمین لے لی گئی تھی۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ نہر بنانے کا خیال پہلے پہل جمہوریہ امریکہ کو آیا، بلکہ جس زمانے میں ہسپانیہ کی سلطنت عروج پر تھی اور نئی دُنیا میں اس کی آبادکاری کا ڈنکا بج رہا تھا، اس زمانے میں بھی یہاں سے ایک نہر بنانے کی تجویز زیرِ غور آئی تھی۔ اس وقت تک جمہوریہ امریکہ کا وجود تک نہ تھا۔ جب امریکی ریاستوں نے آزادی حاصل کر لی تو انھیں یہ احساس ہوا کہ اگر پانامہ میں سے ایک نہر بنا دی جائے، جس سے جہاز بآسانی گزر سکیں تو اطلانطک سے بحر الکاہل میں جانے کے لیے جہازوں کو جنوبی امریکہ کا چکر نہ لگانا پڑے گا۔ اس طرح وقت بھی بچ جائے گا، خرچ بھی کم آئے گا اور تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ عین اسی زمانے میں برطانیہ اور فرانس بھی اس نہر کی تیاری سے دِلچسپی لینے لگے۔ جمہوریہ امریکہ نے پہلے برطانیہ سے معاہدہ کر کے نہر بنانے کے پُورے حقوق حاصل کر لیے۔ پھر فرانس کی کوششیں ناکام ہوئیں اور اس کی دو بڑی تجارتی کمپنیوں کا دیوالہ نکل گیا تو اس نے بھی دست برداری اختیار کر لی اور جمہوریہ امریکہ تنہا میدان میں رہ گئی۔

نہر کی تعمیر پر کل تینتیس کروڑ چھیاسٹھ لاکھ

پچاس ہزار ڈالر خرچ ہوئے اور تقریباً چوبیس کروڑ مکعب گز زمین کھودی گئی۔ نہر کا رُخ شرقی غربی نہیں، بلکہ اطلانطک کی جانب سے کولون[۱] کو مرکز قرار دیں تو بحر الکاہل کے ساحل پر بلبوا[۲] تک اس کا رُخ جنوبی اور جنوب مشرقی ہے۔ اگر ایک سمندر کے ساحل سے دُوسرے سمندر کے ساحل تک فاصلہ ناپا جائے تو اصل نہر قریباً چالیس میل لمبی ہے، لیکن اطرافِ نہر میں دونو طرف سمندروں میں بھی کسی قدر زمین کھود کر جہازوں کی آمد و رفت کے قابل بنانی پڑی تھی۔ اسے بھی حساب میں شامل کر لیا جائے تو نہر کی لمبائی پونے اکیاون میل بن جاتی ہے۔ اس کی کم سے کم گہرائی اکتالیس فٹ ہے۔

انجینیری کا خاص کمال نہر کھودنے میں نہیں، بلکہ اس کے اندر بند بنانے سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً جو جہاز اوقیانوس کی طرف سے نہر میں داخل ہو، اسے بندوں کے پہلے سلسلے میں سطح بحر سے پچاسی فٹ کی بلندی پر اٹھایا جاتا ہے۔ پھر جہاز ایک اور بند سے گزرتا ہوا بحر الکاہل کی جانب آخری سلسلے کے بند میں عام سطح پر آجاتا ہے اور بے تکلّف دُوسرے سمندر میں داخل ہو جاتا ہے۔ پُورا فاصلہ طے کرنے میں سات آٹھ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔

اگر یہ نہر نہ بنتی اور وسط امریکہ میں سے جہازوں کے لیے آمد و رفت کا انتظام نہ کیا جاتا، تو اندازہ کیجئے کہ کتنی مشقّت اُٹھانی پڑتی، کتنا وقت اور روپیہ صرف ہوتا! فرض کیجئے کہ جہاز کو وسط امریکہ کی کسی مشرقی بندرگاہ سے مغربی بندرگاہ میں جانا ہوتا تو وہ پُورے جنوبی امریکہ کا چکّر لگائے بغیر نہ جا سکتا اور یہ فاصلہ کم از کم دس ہزار میل ہوتا۔ اب نہر پاناما میں سے صرف اکاون میل کا فاصلہ طے کر کے جہاز مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف آ جا سکتا ہے۔

۱- Colon ۲- Balboa



جنگ عظیم کی پہلی چنگاری چھوٹتی ہے

۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ کا آغاز آسٹریا ہنگری کے ولی عہد فرانسس فرڈی ننڈ کے قتل سے ہوا۔ یہ واقعہ ۲۸ رجون کو پیش آیا۔ ۳ راگست کو جرمنی نے بلجیم اور لکسمبرگ پر حملہ کر دیا۔ اس طرح جنگ شروع ہو گئی۔ بعض مؤرخوں کی رائے ہے کہ تھوڑا سا وقت اور نکل جاتا تو ممکن تھا جنگ بالکل نہ ہوتی یا اس کا دائرہ محدود رہتا۔ گویا دل سے جنگ کا خواہاں شاید کوئی بھی نہ تھا، مگر فوجوں کی نقل و حرکت کے احکام جاری ہو چکے تھے۔ یکایک ٹکر ہوگئی، جس طرح کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹتا ہے تو ہر طرف تباہ کن لاوا بہہ نکلتا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی اس جنگ کو ایک طرح کا قتل عام ہی سمجھنا چاہیئے کیونکہ فوجی تنظیمات ناقص اور منصوبہ بندی کمزور تھی جس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ جنگ میں حصہ لینے والے بے حد تکلیفیں اور مصیبتیں اُٹھاتے۔ نقصانات کا اندازہ یہ ہے کہ کم و بیش ایک کروڑ آدمی مارے گئے، دو کروڑ کے قریب زخمی ہوئے۔ جو جائدادیں تباہ ہوئیں ان کی قیمت کا حساب لگانا مشکل ہے۔

جرمنوں کو دریائے مارن[1] کی پہلی جنگ میں فیصلہ کُن اقدام کا موقع مل گیا تھا اور پیرس ان کے رحم و کرم پر تھا، مگر معلوم نہیں وہ کیوں یکایک پیچھے ہٹے اور خندقیں کھود کر ان میں بیٹھ گئے اور بعد کے تین سال انھی خندقوں میں گزار دیئے۔ بے شک مشرقی محاذ پر ہنڈنبرگ کے زیرِ قیادت انھوں نے روسیوں کو سخت شکستیں دیں۔ ۱۹۱۶ء میں رُوسیوں نے جوابی حملہ کیا، مگر دس لاکھ رُوسی کھیت رہے۔ اس خوفناک حادثے سے رُوس میں انقلاب ہو گیا اور اس نے جنگ سے دست کشی اختیار کر لی۔ آسٹریا کی فوجیں جرمنی اور بلغاریہ کی امداد کے بغیر سرویا اور مانٹی نیگرو کے خلاف بھی کامیابی حاصل نہ کر سکیں برطانیہ نے جرمنوں کی افریقی نو آبادیوں پر قبضہ جما لیا، لیکن گیلی پولی میں ترکوں سے شکست کھائی۔ اٹلی، جرمنی اور آسٹریا سے معاہدے کے خلاف برطانیہ اور

۱- Marne

فرانس کے ساتھ مل گیا اور ۱۹۱۷ء تک آسٹریا سے بے نتیجہ لڑتا رہا۔ بلکہ کیپوریٹو کی جنگ میں ذلت کے ساتھ شکست کھا کر بھاگا۔

اس جنگ میں سائنس کے کمالات خوب نمایاں ہوئے۔ جرمنوں نے آبدوزوں کے حملے اس پیمانے پر پہنچا دیئے کہ بحری تجارت کے لیے دہشت انگیز خطرہ پیدا ہو گیا، بلکہ برطانیہ کی بحری فوج کا شیرازہ درہم برہم ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا، لیکن جرمنوں نے یہ غلطی کی کہ امریکی جہاز لوسی ٹینیا کو اُنھوں نے ڈبو دیا جس پر ۱۹۱۷ء میں امریکہ بھی فرانس و برطانیہ کے دوش بدوش لڑائی میں شریک ہو گیا۔ برطانیہ اگرچہ زہریلی گیس ایجاد کر چُکا تھا، لیکن ہمدردیٔ بنی نوع کے خیال سے اس نے اسے استعمال نہ کیا۔ جرمنی نے اس حربے سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے ٹینک بنائے، اگرچہ ان سے مؤثر طریق پر کام نہ لیا گیا۔ جرمنوں نے دُوسری عالمگیر جنگ میں ٹینکوں سے جو فائدہ اُٹھایا وہ سب پر آشکارا ہے۔ ہوائی جہاز بھی اس جنگ میں ایک حربہ بن گئے، اگرچہ ان سے زیادہ تر دیکھ بھال یا بہت معمولی بم باری کا کام لیا گیا۔ جرمنوں نے جو بڑی توپ ایجاد کی تھی، وہ چالیس میل سے پیرس پر گولے برساتی رہی، لیکن جن چیزوں کو فوجی اغراض کے لیے استعمال کیا گیا ان میں سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر ٹرک اور موٹریں تھیں۔ ان سے جنگی نقل و حرکت کے ایک نئے دَور کا آغاز ہُوا۔

امریکی فوجیں اگرچہ بڑی بہادری سے لڑیں، لیکن برطانیہ اور فرانس کے مقابلے میں ان کا درجہ نسبتہً کم تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جرمن آبدوزوں کا خطرہ کم ہو گیا تو چھ لاکھ امریکی فوجیں فرانس پہنچ گئیں۔ جرمنوں میں داخلی اختلافات شروع ہو گئے اور ستمبر، اکتوبر اور نومبر میں وہ ہر محاذ پر پسپا ہوئے۔ جرمن بیڑے کے لیے آخری جد و جہد کا جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا، اس پر عمل کا وقت آیا تو ۲۹ر اکتوبر کو بغاوت شروع ہو گئی۔ اگلے مہینے عارضی صلح ہوئی تو جس بیڑے پر جرمنوں کو ناز تھا وہ اتّحادیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اس میں دس جنگی جہاز تھے۔ چھ جنگی کروزر، آٹھ ہلکے کروزر، پچاس تباہ کُن جہاز اور تمام آبدوزیں۔



روس میں انقلاب برپا ہوتا ہے

۷ رنومبر ۱۹۱۷ء کو بالشویک پارٹی کے لوگ لینن (۱۸۷۰–۱۹۲۴ء) کی قیادت میں اُٹھے اور حکومت پر قبضہ کر کے اس طاقتور رُوس کا سنگِ بُنیاد رکھا جس کے بارے میں آج دُنیا کو گُوناگوں شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس وقت بالشویکوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور انھیں خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ لینن کو بھی جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

طوفانی دَور کے اس انقلاب کا مرکز زیادہ تر وہ شہر تھا جسے روس میں دُوسرا درجہ حاصل تھا۔ اس کا نام ۱۹۱۴ء تک سینٹ پیٹرزبرگ تھا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۴ء تک پیٹروگراڈ رہا۔ لینن کی وفات پر اسے لینن گراڈ کا نام دیا گیا۔ اس شہر کی بنیاد ۱۷۰۳ء میں اس زار نے رکھی تھی جو تاریخ میں پیٹر اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ اسے مغربی یورپ کے طرز پر تعمیر کیا گیا۔ پیٹر کے نزدیک یہ ایک کھڑکی تھی جو یورپ پر کھلتی تھی۔

یہ شہر رُوس میں فنون و صنائع کا مرکز بن گیا۔ سامانِ جنگ کا عظیم الشان کارخانہ یہیں تھا۔ آج اس کی آبادی ۳۰ لاکھ سے زیادہ ہے۔ ۱۹۰۵ء میں سینٹ پیٹرزبرگ کے مزدوروں نے زار کے سامنے ایک درخواست پیش کرنی چاہی تھی جس پر انقلاب شروع ہو گیا۔ پیٹروگراڈ کے مزدوروں، سپاہیوں اور ملّاحوں نے بھی ۱۹۱۷ء کا انقلاب یہیں برپا کیا۔ گویا اس شہر میں تاریخ دُہرائی جاتی رہی ہے۔

بالشویزم اور سوویٹ رُوس کا بانی لینن نہ اس شہر میں پیدا ہُوا تھا اور نہ اس کا اصل نام لینن تھا۔ اس کی ولادت سن برسک[1] میں ہوئی، جسے آج کل لینن کے اعزاز میں الیانوسک[2] کہتے ہیں اس لیے کہ لینن کا اصل نام ولاڈیمیر ایلیچ الیانوسک[3] تھا۔ وہ ایک معلّم کا بیٹا تھا۔ ابتدا ہی سے اسے انقلابی خیالات پسند تھے۔ اس کے بھائی نے زار الیگزانڈر سوم کے خلاف سازش میں حصّہ

۱- Sinbirsk ۲- Ulyanovsk ۳- Vladimir Ilyich Ulyanovsk

لیا اور موت کی سزا پائی۔ غالباً اس وقت سے انقلاب لینن کی زندگی کا واحد نصب العین بن گیا۔

وہ قانون کی تعلیم پا رہا تھا، لیکن انقلابی سرگرمیوں کے باعث اُسے جلاوطن ہونا پڑا۔ سائبیریا بھی بھیجا گیا۔ پھر وہ رُوس کے باہر مختلف ملکوں میں انقلابی کام کرتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں لندن گیا، جہاں روس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی (حزبِ جمہوریہ اشتراکیہ) کا اجلاس ہوا اور یہ پارٹی دو حصّوں میں بٹ گئی۔ ایک کا نام بالشویک رکھا گیا، دُوسری کا منشویک۔ بالشویکوں کی قیادت لینن نے سنبھال لی۔ ۱۹۰۵ء میں ہنگامہ بپا ہوا تو لینن نے رُوس پہنچ کر دوسرے بالشویک لیڈروں کو اپنا ہم نوا بنا لیا، لیکن پھر اسے وطن چھوڑنا پڑا۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت وہ سوئٹزرلینڈ میں مقیم تھا۔

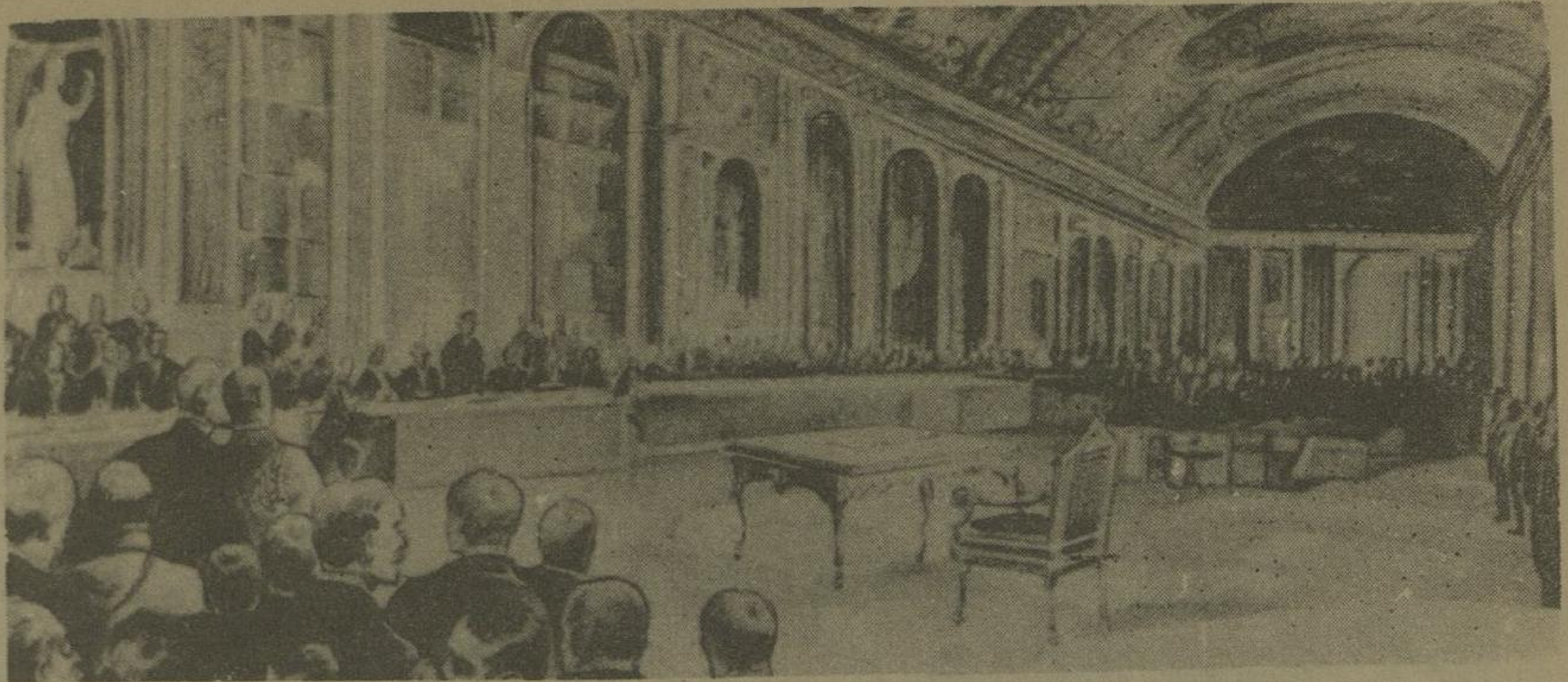
فروری ۱۹۱۷ء میں انقلاب بپا ہوا تو جرمنوں نے اُسے اجازت دے دی کہ بند گاڑی میں جرمنی سے گزرتا ہوا رُوس پہنچ جائے۔ وہاں ایک اعتدال پسند امیر نے نئی حکومت بنائی تھی، تاکہ مزدور اور سپاہی جنگی مساعی کے سلسلے میں بہ دستور اپنا فرض انجام دیتے رہیں۔ پھر اس حکومت کی جگہ کرنسکی کی حکومت نے لے لی۔ ۴ر اپریل کو لینن پہنچا اور جاتے ہی ایک تقریر کی جس میں بتایا کہ زاروں کے نظامِ حکومت کا خاتمہ اصل انقلاب نہیں، بلکہ انقلاب کا آغاز ہے۔ اب متوسط طبقے نے جو حکومت بنالی ہے وہ عوام کی خواہشات پُوری نہیں کرسکتی۔

اس کے بعد کشمکش پر کشمکش شروع ہو گئی۔ لینن کے مخالفوں نے جعل سازی سے ایسی دستاویزیں تیار کرلیں جن سے ثابت ہو کہ لینن نے جو کچھ کیا در اصل حکومت جرمنی کی ہدایت کے مطابق کیا ہے۔ ان حالات میں لینن کو پھر روپوش ہونا پڑا۔ اس نے کچھ مدت پیٹروگراڈ میں گزاری، بعدازاں فن لینڈ چلا گیا۔

جو کام لینن پُورا نہیں کرسکا تھا، وہ روسی حکومت کے احمقانہ طرزِ عمل نے پُورا کر دیا۔ اختلافی قوتوں کو دبانے کے لیے دہشت انگیزی کا دَور شروع ہوا۔ اس سے عوام بھی برگشتہ ہو گئے۔ بالشویکوں کو پیٹروگراڈ اور ماسکو کی مجلسوں میں اکثریت حاصل ہو گئی اور اُنھوں نے مطالبہ کیا کہ اختیارات ہمارے حوالے کر دیے جائیں۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں کرنسکی کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا اور عوام کی آمریت قائم ہو گئی۔ بالشویکوں کی مجلس نمائندگانِ عوام[1] کو اختیارات مل گئے۔ اس مجلس نے لینن کو اپنا صدر منتخب کر لیا۔ ٹراٹسکی، اسٹالین، رائی کوف مجلس کے ممبر تھے۔

اس مجلس نے متحارب قوتوں کے سامنے متارکۂ جنگ کی تجویز پیش کر دی۔ روس میں زمین کی ذاتی ملکیت کا حق منسوخ کر دیا گیا اور صنعتیں بھی قومی ملکیت بنا دی گئیں۔ لینن نے صلح کا جو وعدہ کیا تھا وہ معاہدۂ برسٹ لٹوسک[2] کی ذلت آمیز شرطیں قبول کر کے پُورا کیا گیا، لیکن رُوس کے مغربی ہمسایوں کے خلاف جنگ ۱۹۲۰ء تک ختم نہ ہوئی۔ لینن پر بیماری کے تین حملے پے در پے ہوئے۔ پہلا ۱۹۲۲ء میں، دُوسرا ۱۹۲۳ء میں اور تیسرا ۱۹۲۴ء میں۔ آخری حملے نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

۱- Council of People's Commissars ۲- Brest-Litovsk



اتّحادی صُلح نامے تیّار کرتے ہیں

۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو متارکۂ جنگ پر دستخط ہوئے تھے اور عالمگیر اقتدار کے لیے جو وحشیانہ اور خونریز کشمکش چار سال سے جاری تھی، وہ ختم ہوگئی۔ قیصر کی جرمن فوج ہار گئی اور ۱۹۱۹ء میں ورسائی (پیرس) کے مقام پر مستقل صُلح کے لیے مشورے شروع ہوئے۔ برطانیہ، امریکہ اور فرانس کے نمائندوں نے فاتحین کی حیثیت سے جو شرطیں پیش کیں ان پر آئندہ خود ان ملکوں کے شہریوں کو پشیمان ہونا پڑا۔

ان شرطوں کے مطابق جرمنی سے نوآبادیاں چھین لی گئیں۔ مشرقی پروشیا اور جرمنی کے درمیان پولینڈ کے لیے گزرنے کا راستہ نکالا گیا۔ سار کے علاقے کا انتظام چار سال کے لیے فرانس نے سنبھال لیا۔ رائن لینڈ پر اتنی ہی مدّت کے لیے اتّحادی قابض ہوئے۔ جرمنی کا فوجی نظام توڑ دیا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ قیصر اور بعض دُوسری بڑی بڑی شخصیتوں کے خلاف مقدمے چلائے جائیں (مگر وہ کبھی نہ چلائے گئے)۔ تاوان کے لیے ایسی رقمیں مقرر کر دی گئیں، جن کا ادا ہونا ممکن نہ تھا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی ادائیگی ملتوی کر دی گئی اور پھر کبھی تقاضا نہ کیا جا سکا۔ ۱۹۳۵ء میں ہٹلر نے عہدنامے کی ان تمام دفعات کو لغو و بے بنیاد قرار دیا، جن کا تعلّق فوجی معاملات سے تھا۔

امریکہ کے صدر ولسن کے نزدیک یہ شرطیں اگرچہ سخت تھیں، لیکن اس نے بادلِ ناخواستہ ان کو قبول کر لیا تاکہ اتّحادیوں نے پہلے سے جو خفیہ معاہدے کر رکھے تھے وہ پُورے ہو جائیں۔ ولسن یہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو جمعیّتِ اقوام کی بُنیاد رکھ دی جائے جو اس کے نزدیک آئندہ کے لیے قیامِ امن کی واحد اُمّید تھی۔ اس نے فرانس اور برطانیہ سے جمعیّتِ اقوام کا قیام منظور کرا لیا، مگر وہ امریکی سینیٹ سے عہدنامہ ورسائی کی منظوری حاصل نہ کر سکا۔ یُوں امریکہ کے لیے جمعیّتِ اقوام کا ممبر بننے کی کوئی صُورت پیدا نہ ہوئی اور اس جمعیّت کی تقدیر پر ناکامی کی آخری مہر لگ گئی۔

اس جنگ میں ساڑھے چھ کروڑ سپاہی نقل و حرکت

میں آئے اور ان میں سے نصف سے زیادہ مارے گئے یا زخمی ہوئے یا قید کر لیے گئے۔ پھر بھی فیصلہ کن لڑائی کوئی نہ ہوئی۔ حد یہ ہے کہ جب جرمنوں نے ہتھیار ڈالے تو وہ فرانس سے کریمیا تک اتحادی علاقوں پر قابض تھے۔ برطانیہ اور فرانس نے دریائے سوم کے کنارے کنارے جو اقدام کیا تھا، اس میں چھ لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اُتر گئے اور صرف چند میل کا علاقہ دشمن سے چھینا جا سکا۔ بیشتر سپاہیوں نے خندقوں میں بیٹھے بیٹھے تکلیفوں اور مصیبتوں کے سیل اپنے اُوپر سے گزرتے دیکھے کیونکہ خندقوں میں پانی اور کیچڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس ڈرامے میں پیش قدمی یا پسپائی کا کوئی طوفانی منظر رونما نہ ہوا، جیسے پیشتر یا بعد کی جنگوں میں اکثر سامنے آتے رہے۔

۱۹۱۴ء میں یورپ کے حالات اتنے متوازن اور مُستحکم تھے کہ صدیوں سے یہ کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ گویا بظاہر جنگ کی کوئی وجہ نہ تھی، تاہم جنگ ہوئی اور اس کے بعد یورپ میں مزید رزم و پیکار کے عوامل کی پرورش شروع ہو گئی۔ اٹلی جنگ میں کوئی مؤثر حصّہ نہ لے سکا تھا، لیکن وہاں فاشزم کا پہلا خوفناک مظاہرہ مسولینی کی شکل میں ہوا۔ ہٹلر عہد نامہ ورسائی کی سیڑھی لگا کر جرمنی میں اوجِ اقتدار پر جا پہنچا اور وہاں نازی انداز کا فاشزم ظہور میں آیا۔ فرینکو نے ہسپانیہ میں اقتدار حاصل کر لیا۔ غرض عہد نامہ ورسائی کو پُورے بارہ سال بھی نہ گزُرے تھے کہ اخباروں میں خبروں پر تبصرے کرنے والے آغازِ جنگ کی تاریخ کے بارے میں رائے زنی کرتے لگے۔

دونوں عالمگیر جنگوں میں امریکہ کو مجبوراً شریک ہونا پڑا۔ پہلی جنگ میں جرمن آبدوزوں کے حملوں نے شرکت کے سوا چارہ نہ چھوڑا، دُوسری جنگ میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ دونوں موقعوں پر دشمنوں کا خیال تھا کہ امریکہ کی پُوری تیاری سے پیشتر آخری فیصلہ ہو جائے گا، لیکن دونوں موقعوں پر یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ثابت ہُوا۔

پریزیڈنٹ ولسن نے اپنے مشہور چودہ نکات کو جرمنوں کے ہتھیار ڈالنے کی بنیاد قرار دیا تھا مگر وہ نکات عہد نامہ ورسائی میں گم ہو گئے۔ ولسن نے جس جمعیت اقوام کو امیدگاہ بنایا تھا وہ ناکام رہی۔ دُوسری عالمگیر جنگ کے بعد مقاصدِ امن کے لیے بہتر نظام انجمن اقوام متحدہ کی شکل میں وجود پذیر ہُوا۔ اگرچہ اسے خطرات کے جھٹکے بھی لگتے رہے تاہم اس سے ابھی تک کچھ نہ کچھ اُمیدیں وابستہ ہیں۔



مسولینی ڈکٹیٹر بنتا ہے

۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۲ء کو بینی ٹو مسولینی نے اٹلی کی بڑھتی ہوئی بدنظمی سے فائدہ اُٹھا کر اپنے سیاہ پوش فاشسٹوں کو روم پر پیشقدمی کا حکم دے دیا جنھیں اس نے فوج کی حیثیت سے منظم کر رکھا تھا۔ شاہ وکٹر عمانوئل کے نظام حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی اور اسے کہیں سے امداد کی اُمید بھی نہ تھی، لہٰذا اسے اجازت دینی پڑی کہ فاشسٹ شہر میں داخل ہو جائیں۔ مسولینی اس وقت میلان میں تھا، اُسے نئی وزارت بنانے کی دعوت دی گئی نئے وزیر اعظم نے یکے بعد دیگرے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ کمزور نظامِ حکومت نے نہایت سخت اور بے پناہ اقتدار (ڈکٹیٹری) کی حیثیت اختیار کر لی۔ مسولینی اور اس کے ساتھی اپنے دورِ عروج میں یہ سمجھ کر خوش ہوتے تھے کہ روما کی دیرینہ عظمت از سرِ نو زندہ ہو گئی۔

مسولینی کا باپ پیشے کے لحاظ سے لوہار تھا اور وہ مدرس بھی رہ چکا تھا۔ خود مسولینی بھی شروع میں کچھ مدت بچے پڑھاتا رہا۔ پھر وہ سوئٹزرلینڈ چلا گیا اور معمار بن گیا۔ بعدازاں ایک اشتراکی اخبار کا ایڈیٹر ہو گیا، مگر انقلابی سرگرمیوں کے باعث سوئٹزرلینڈ سے نکالا گیا۔ وہ آسٹریا پہنچا تو وہاں ایک اخبار سے وابستہ ہو گیا، لیکن حکام سے جھگڑا ہو گیا اور اسے آسٹریا سے بھی بھاگنا پڑا۔ بعدازاں وہ اٹلی میں ایک اشتراکی اخبار کا ایڈیٹر ہو گیا۔

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اس نے اشتراکی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنا اخبار جاری کر کے پُرانے رفیقوں کی مخالفت کرنے لگا۔ اس زمانے میں جاہ و اقتدار کی اس حرص کے چہرے سے پردہ اُٹھ گیا جو آگے چل کر اُسے نیز اس کے ملک کو زوال کی گہرائیوں میں پہنچانے والی تھی۔ جنگ کے بعد اٹلی کے حالات خاصے بگڑ گئے تھے۔ اس زمانے میں مسولینی کو اپنے نئے اور خطرناک خیالات کے حامی مل گئے۔ یہ حامی زیادہ تر غریب یا بے روزگار لوگ تھے یا وہ سپاہی تھے جو جنگ میں ناکامی کی وجہ سے حقیر

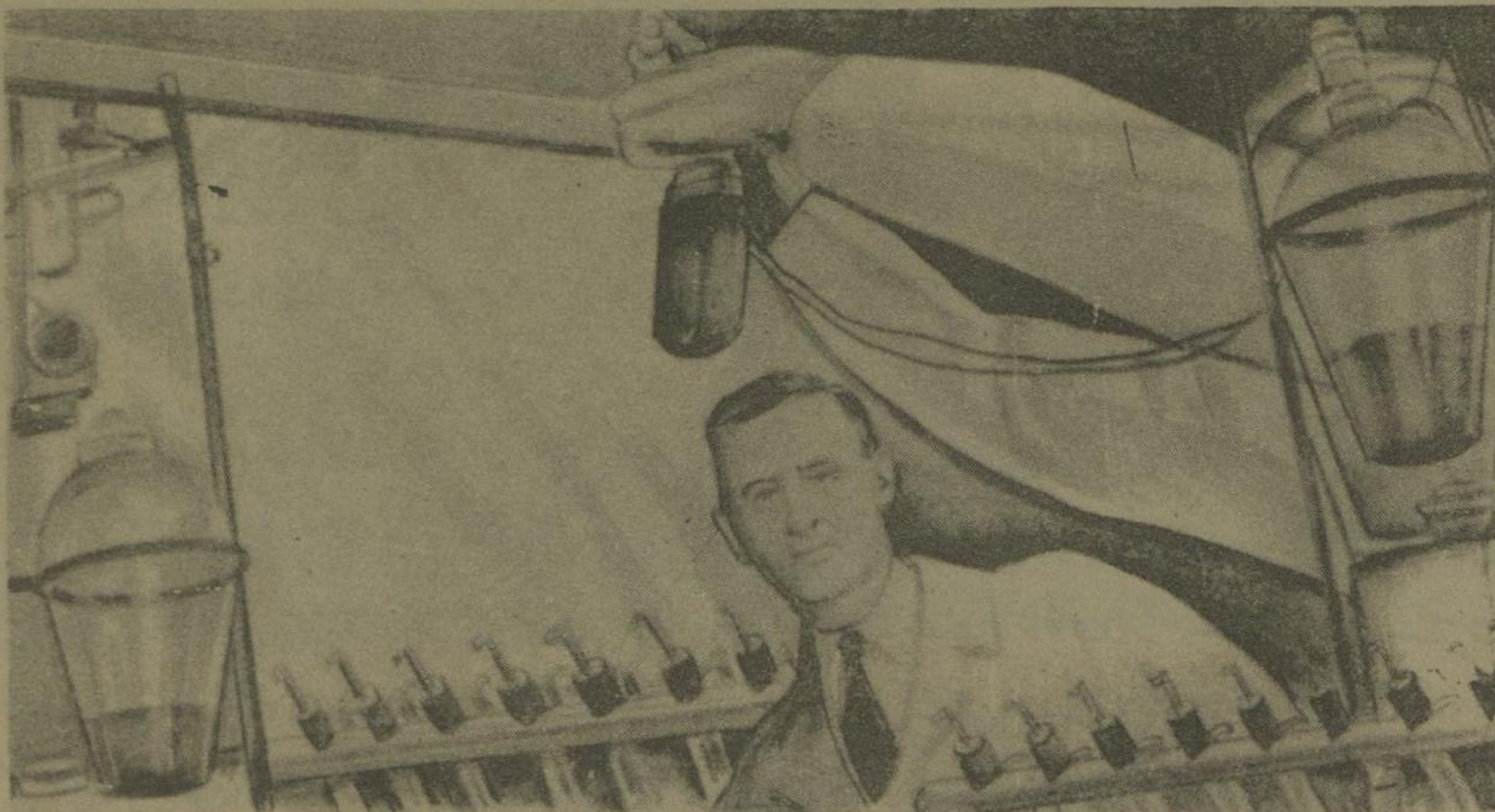
سمجھے جاتے تھے۔ مسولینی نے انھیں ایک پارٹی کی شکل میں منظم کر دیا۔ اس پارٹی کا نصب العین انتہا پسندانہ اور جنگجویانہ قومیت تھا۔ یوں فاشسٹ پارٹی کی بُنیاد پڑی اور ممبروں کے لیے سیاہ وردی تجویز ہوئی۔

ملک میں بے روزگاری عام تھی۔ پے در پے ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ ان حالات نے مسولینی کے حامیوں کی تعداد بہت بڑھا دی۔ مئی ۱۹۲۱ء میں مسولینی اطالوی پارلیمنٹ کا ممبر بن گیا۔ نومبر میں اس نے فاشسٹ پارٹی کی باقاعدہ تنظیم شروع کر دی اور ایک سال کے بعد اٹلی میں پہلی فاشسٹ حکومت قائم ہو گئی۔

مسولینی کے طور طریقوں اور فلسفے سے اڈولف ہٹلر نے جرمنی میں کام لیا۔ شروع میں مسولینی ہٹلر کو حقیر سمجھتا تھا اور آسٹریا کے الحاق کی جو کوشش کر رہا تھا، مسولینی اس کا سخت مخالف تھا۔ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کر دیا۔ اس پر تمام یورپی ملکوں سے مسولینی کے سیاسی تعلقات منقطع ہو گئے۔ اس وقت مسولینی اور ہٹلر ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ۱۹۳۶ء میں مسولینی اور ہٹلر نے ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں فرینکو کی طرف داری کی اور روم اور برلن کا اتحاد معرض وجود میں آیا۔ ۱۹۳۹ء میں دونوں کے درمیان اتحاد کا عہد نامہ ہو گیا۔ مسولینی نے ہٹلر کو الحاق آسٹریا کی اجازت دے دی۔ اسی سال مسولینی کی وساطت سے میونخ کا مہلک عہد نامہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اپریل ۱۹۳۹ء میں مسولینی نے البانیہ پر قبضہ جما لیا۔ اس وقت ہٹلر کا ستارہ بہت بلندی پر پہنچ چکا تھا اور مسولینی کی حیثیت محض ہٹلر کے طفیلی کی سی ہو گئی تھی۔

ہسپانیہ اور حبشہ کی جنگیں اٹلی والوں کے نزدیک پسندیدہ نہ تھیں، اس لیے مسولینی کا وقار کم ہو گیا اور اسے دوسری عالمگیر جنگ میں شریک ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ جون ۱۹۴۰ء میں فرانس کی شکست کے آثار نمودار ہونے لگے تو اسے ہٹلر کے ساتھ شامل ہونے میں کوئی مضائقہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ اس نے اچانک مظلوم فرانس کی پُشت میں چھُرا بھونک دیا۔

آخرکار اطالوی فوجوں نے افریقہ اور یونان میں سخت شکستیں کھائیں اور اٹلی اتحادی فوجوں کی زد میں آ گیا، جس سے فاشسٹ پارٹی میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ فاشسٹوں کی مجلس عالیہ نے ۲۵ جولائی ۱۹۴۳ء کو مسولینی کی حکمت عملی مسترد کر دی اور بادشاہ نے اُسے وزارت سے برطرف کر کے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ دو ماہ بعد جرمن اسے رہا کرا لے گئے اور شمالی اٹلی میں ایک حکومت بنا دی جس کی حیثیت کٹھ پُتلی کی تھی۔ جب جرمنی بھی لڑائی میں بے بس ہو کر رہ گیا تو مسولینی نے بھاگ کر سوئٹزرلینڈ پہنچنے کی کوشش کی، مگر کومو کے نزدیک پکڑا گیا اور سرسری تحقیقات کے بعد اُسے گولی مار دی گئی۔ اس کی نعش میلان میں پہنچی تو پاؤں میں رستے ڈال کر چوک میں اُلٹا لٹکا دیا گیا۔ پھر کسی گمنام جگہ دفن کر دیا گیا۔



پنسلین ایجاد ہوتی ہے

اتّفاق اور ذہن رسا کی فتح کا ایک شاندار کارنامہ سر الیگزانڈر فلیمنگ[1] کے ہاتھوں سینٹ میری کے ہسپتال (لندن) میں انجام پایا اور پنسلین ایجاد ہوئی۔ جسے دُنیا کی عجیبُ الاثر دوا سمجھا جاتا ہے سر الیگزانڈر پہلی عالمگیر جنگ میں برطانیہ کی میڈیکل کور کا رکن تھا۔ اسے یہ دیکھ کر حد درجہ قلق ہوتا کہ اگرچہ زخمیوں کے لیے بروقت اعلیٰ درجے کی طبی امداد کا انتظام کر دیا جاتا تھا پھر بھی خون میں زہریلے جراثیم پھیل جانے سے بے شمار موتیں واقع ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ میدانِ جنگ ہی میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ باقی زندگی ان جراثیم کی تحقیقات میں گزار دے گا جو زخمیوں کی موت کا باعث ہوتے ہیں۔

ایک روز وہ اپنی تجربہ گاہ میں کام کر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ پیپ پیدا کرنے والے جراثیم پھپھوندی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اس نے خوردبین سے دیکھا تو جراثیم مر رہے تھے پھر اس نے پھپھوندی کے اثرات کا خوب تجربہ کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انسانی جسم میں زہر پیدا کرنے والے جراثیم کی اکثر قسمیں اسی سے ہلاک ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی تجربہ کر لیا گیا کہ پھپھوندی سے تیار کی ہوئی دوا انسانی جسم پر کوئی مضر اثر نہیں ڈالتی۔ اس تاریخی دریافت نے طبی دُنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔

دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو آکسفورڈ میں سائنس دانوں کی ایک جماعت نے سر الیگزانڈر فلیمنگ کی دریافت کے متعلق باقاعدہ تجربات شروع کر دیئے۔ ۱۹۴۱ء میں تجربات کامیابی کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ پھر امریکہ کے تعاون سے وسیع پیمانے پر پنسلین کی تیاری شروع ہو گئی اور جنگ میں بے شمار جانیں اس کی بدولت بچ گئیں۔

آج تمام ڈاکٹر اس سے وسیع پیمانے پر کام

۱- Alexander Fleming

لے رہے ہیں۔ یہ جسموں کو زہریلے اثرات سے محفوظ رکھنے میں بھی مؤثر ہے اور اگر کسی جسم میں سمیّت سرایت کر جائے تو اسے بھی جلد دُور کر دیتی ہے۔ اس کے بعد اسی قسم کی اور دوائیں بھی ایجاد ہوئیں، مثلاً ایرومائیسین، سٹرپٹومائیسین۔ سمیّت کو دُور کرنے والی زیادہ دوائیں اس وجہ سے خیر مقدم کی مستحق ہیں کہ بعض بیماروں کو پنسلین سے کوئی فائدہ نہ پہنچا، بلکہ اس کے استعمال سے انھوں نے سخت تکلیفیں اُٹھائیں۔ ڈاکٹر ایک دوا کو مؤثر نہیں دیکھتے تو دوسری استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً تنفّس کی بیماریوں میں سمیّت کو دُور کرنے والی ایک دوا دُوسری کے مقابلے میں بہتر ثابت ہوئی ہے۔

پنسلین شروع میں ہمارے ہاں بھی کثرت سے استعمال ہونے لگی تھی، اب پہلے کا سا زور نہیں رہا اور دوسری دوائیں مثلاً ایرومائیسین، سٹرپٹومائیسین وغیرہ زیادہ استعمال کی جاتی ہیں۔ پنسلین کی اور بہت سی چیزیں تیار کر لی گئی ہیں جو بڑی مفید ثابت ہوئی ہیں، یعنی پنسلین مرہم پھوڑوں پھنسیوں کے لیے، پنسلین آنکھوں یا دُوسرے اعضا کی بیماریوں کے لیے۔ نئی نئی چیزوں کی دریافت کے لیے مختلف ملکوں کے سائنس دان اور ڈاکٹر دن رات تجربات کر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں خبر ملی تھی کہ دانتوں کو محفوظ رکھنے کی ایک دوا تیار ہو چکی ہے۔ جس کے اثرات کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ جرّاحی میں حیرت انگیز مہارت حاصل کی جا چکی ہے۔ اس طرح کچھ عجب نہیں کہ بہت جلد خطرناک بیماریوں پر قابو پایا جا سکے۔ یہ سب کچھ خلقِ خدا کی خدمت کے لیے ہو رہا ہے اور جو لوگ اس کام میں مصروف ہیں، وہ یقیناً نوعِ انسان کے بڑے محسن ہیں۔





ہٹلر پولینڈ پر ہلّہ بولتا ہے

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے اپنی امن جوئی کے سارے دعوے بالائے طاق رکھ دیئے اور پولینڈ پر وہ خوفناک یورش شروع کر دی جسے "بلٹز کریگ" کا نام دیا گیا' یعنی ایسا حملہ جس میں بجلی کی سی تیزی اور شدت ہو اور سمجھا جائے کہ دُوسرے پر پے در پے بجلیاں گرائی جا رہی ہیں۔ اس یورش نے پولینڈ کی فوجیں تباہ کر دیں۔ ملک کے بچاؤ کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔ نازیوں نے فتح کے بعد لطف وکرم سے کام لینے کی بجائے خوفناک ظلم وستم شروع کر دیئے۔ اس یورش نے ان لوگوں کی بھی آنکھیں کھول دیں، جو پیش نظر خطرات کے بارے میں بے پروائی برت رہے تھے۔ خود امریکہ کی کانگریس کے تقریباً نصف ممبر اگست ۱۹۴۱ء تک یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس جنگ میں ان کے ملک کے لیے بھی واقعی خطرہ ہے۔

پولینڈ کے لیے وہی ایک راستہ تھا جس پر وہ گامزن ہوا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اس کے لیے ایک گزرگاہ تجویز کی گئی تھی جو جرمنی کے سابقہ مقبوضات میں سے گزرتی تھی۔ پولینڈ کو ساحل بحر تک پہنچانے کی اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ ہٹلر نے اس گزرگاہ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس بارے میں سیاسی گفت وشنید برائے نام ہی ہو رہی تھی کہ نازیوں کے ہوائی جہاز، ٹینک، مسلح دستے اور اعلیٰ تربیت پائی ہوئی پیادہ فوجیں طوفان کی طرح اُٹھیں اور پُرانی وضع کے پولستانی رسالوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ ہٹلر ان اسلحہ کو ہسپانوی خانہ جنگی کی تجربہ گاہ میں خوب آزما چکا تھا (۱۹۳۶ء۔ مارچ ۱۹۳۹ء)۔ یہ سب کچھ اس تیزی سے عمل میں آیا کہ برطانیہ اور فرانس بمشکل اعلانِ جنگ کر سکے اور ادھر روس نے دوسری جانب سے پولینڈ پر ہلّہ بول دیا۔ موسم سرما میں جنگ کی تیزی باقی نہ رہی، البتہ رُوس فن لینڈ سے اُلجھا رہا۔ فرانس نے اپنی فوجیں میجنولائن کے استحکامات سے ہٹا دیں جنھیں ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ برطانیہ نے معمول کے مطابق دشمن

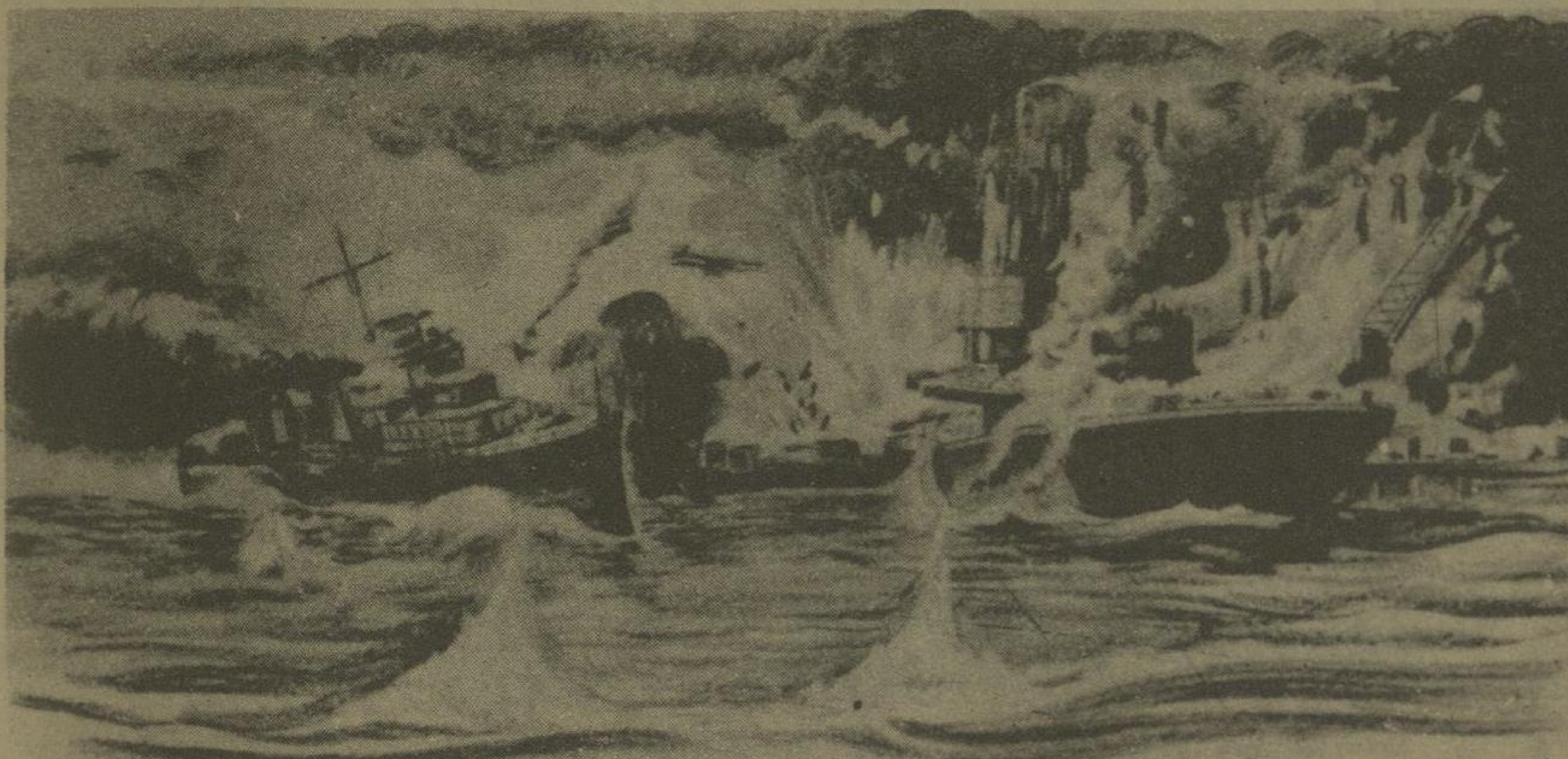
کے ملک کی ناکہ بندی کر لی۔ ہٹلر موقع کے انتظار میں بیٹھ گیا، گویا کہ جنگ محض دکھاوے کے لیے رہ گئی تھی۔

اپریل ۱۹۴۰ء کے اوائل میں تیز نقل و حرکت کی نئی جنگ کے مہلک ممکنات آشکارا ہوئے۔ جرمنوں نے ڈنمارک اور ناروے پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ کی بحری قوّت نے ناروے میں دفاع کا حق ادا کر دیا، لیکن اس کی کوششیں بے سود رہیں۔ مئی میں جرمن فوجیں لکسمبرگ، ہالینڈ اور بلجیم کو پامال کرتی ہوئی حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ میجنولائن کے ایک طرف سے چکّر کاٹ کر آگے بڑھیں اور رودبارِ انگلستان کے ساحل پر پہنچ گئیں۔ برطانیہ ڈنکرک سے فوجیں نکالنے پر مجبور ہو گیا اور چرچل کو بُری طرح پٹائی کا سامنا ہوا۔ دُوسرے لفظوں میں اتحادی برّاعظم سے نکالے جا چکے تھے۔ نہ ان کے پاس فوج تھی، نہ سامانِ جنگ لہٰذا فرانس نے ۲۲ر جُون کو جرمنی کے ساتھ عارضی صلح نامے پر دستخط کر دیئے۔

اس کے بعد جرمنوں نے برطانوی شہریوں پر وحشیانہ اور انسانیت سوز ہوائی حملے شروع کر دیے۔ ان سے کوئی فوجی مقصد تو پُورا نہ ہُوا، البتہ غیر مصافی آبادی کو جو جانی و مالی نقصان پہنچا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ پے در پے ضربوں نے برطانوی عوام میں مزاحمت کا عزم مستحکم کر دیا اور برطانیہ کے لڑاکا ہوائی جہازوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ دُشمن کے جہازوں کو فنا کے گھاٹ اُتارنے کی صورتیں کیا کیا ہیں۔ اس اثناء میں جرمن آبدوزیں بھی اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔

۲۲ر جون ۱۹۴۱ء کو ہٹلر نے نپولین کی غلطی دُہرائی اور رُوس پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ وہی نکلا جو نپولین کو پیش آیا تھا۔ ابتدا میں ہٹلر کو زبردست کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ جرمن پسپا ہوتی ہوئی رُوسی فوجوں کا تعاقب کرتے رہے۔ پھر لینن گراڈ جیسے محاصروں کی کھینچ تان شروع ہوئی۔ انجام کار روسیوں نے بے پناہ جوابی حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اسی سال ہٹلر کے حلیف جاپان نے مشرقِ بعید میں اور بھی بدتر غلطی کا ارتکاب کیا اور ۷ر دسمبر کو پرل ہاربر پر اچانک حملہ کر دیا جس کی وجہ سے امریکہ کو جنگ میں شامل ہونا پڑا اور اس میں کوئی شبہ نہ رہا کہ چرچل جیسے آدمیوں کی استقامت ضرور رنگ لائے گی۔ حق یہ ہے کہ انگریزوں نے بے درد اور اخلاق سوز جابرانہ قوّت کے خلاف جس حوصلہ مندی سے کام لیا تھا وہ یقیناً اجرِ جزیل کی مستحق تھی۔



جاپان، پرل ہاربر پر بم برساتا ہے

جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کا ایک خاص گُر یہ ہے کہ دشمن پر اچانک اور غیر متوقع حملہ کیا جائے وہ مقابلے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور پہلے ہی قدم پر سخت نقصان کا ہدف بن جاتا ہے جس کی تلافی آسان نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ سپہ سالار ہمیشہ اچانک حملوں کے لیے کوشاں رہے۔ جاپان نے ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو امریکہ کے مشہور بحری مرکز پرل ہاربر (جزیرہ ہوائی) پر جو حملہ کیا تھا، وہ بھی اسی قسم کا تھا اور اس میں جاپان کو جس بڑے پیمانے پر کامیابی حاصل ہوئی، وہ کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی۔ اتوار کا دن حملے کے لیے یقیناً اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا کہ بحری مرکز کے اکثر افسر اور ملاح معمول کے مطابق چھٹی منا رہے ہوں گے اور بڑا مزاحمت کرنا بھی چاہے گا تو نہ کر سکے گا۔

آپ اس حملے کے نتائج پر غور فرمائیں۔

بحرالکاہل کا امریکی بیڑا اپاہج بن چکا تھا۔ اگر جاپان آگے بڑھ کر کیلیفورنیا کے ساحل پر فوج اتار دیتا تو وہاں حقیقی حفاظت کا کوئی قابلِ ذکر سامان موجود نہ تھا۔ پھر اسی دن جاپان نے فلی پین، ویک[1] اور گوام[2] کے ہوائی مرکزوں پر یورشیں کیں۔ مشرق وسطیٰ میں برطانوی اور ولندیزی مقبوضات کے جنگی مرکزوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ بحرالکاہل کے وسیع سمندر میں برطانیہ اور ہالینڈ ہی امریکہ کے ساتھی بن سکتے تھے، وہ کوئی قابلِ ذکر مدد دینے کے قابل نہ رہے۔ امریکی فوجوں کے کمانڈر ڈگلس میک آرتھر[3] نے بطان[4] (فلی پین) میں مقابلہ کرنے کا بہت کچھ شور مچایا تھا۔ لیکن وہ آبدوز میں سوار ہو کر بچ نکلنے پر مجبور ہوا، تاکہ اس فوج کی تیاری کا کام انجام دے جس کے بغیر وہ جاپان کے خلاف جوابی قدم نہ اٹھا سکتا تھا اور واپس فلی پین نہ پہنچ سکتا تھا۔

۱- Wake بحرالکاہل میں ایک امریکی جزیرہ۔ ۲- Guam بحرالکاہل میں ایک امریکی جزیرہ۔
۳- Douglas MacArthur ۴- Bataan

چیانگ کائی شک سے مدد کی امید ہو سکتی تھی، لیکن وہ خود جاپان کی ضربوں سے سنبھل نہ سکا تھا۔

بے شک امریکہ کے لیے یہ بڑی پریشانی کا وقت تھا۔ اگر زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ بھی فوجی تیاریاں شروع کر دی جاتیں تو ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ پہلے زیادہ سے زیادہ سامان اور فوجیں ہٹلر کے مقابلے پر بھیجنی ضروری تھیں جو جاپان کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ خطرناک تھا اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے انتظامات مکمل کیے بغیر جاپان پر پوری توجہ نہ کی جا سکتی تھی۔ لہٰذا جاپان کو جوابی حملے کا بھی زیادہ اندیشہ نہ تھا۔ تاہم خود جاپان پر بہت جلد واضح ہو گیا کہ وہ اتنے علاقے ہتیا چکا ہے، جنھیں ہضم کر لینا بہت مشکل تھا۔

ظاہر ہے کہ جاپانی مرکزوں پر براہ راست اقدام نہ کیا جا سکتا تھا، بلکہ جزیرہ بہ جزیرہ چھلانگیں لگاتے ہوئے بھی قریب پہنچنا ممکن تھا۔ تاہم جب تیاریاں ہو گئیں اور بری، بحری اور ہوائی قوت نے ہم آہنگی سے اقدامات کی صلاحیت بہم پہنچا لی تو نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔

جاپان نے پہلی عالمگیر جنگ اور دوسری عالمگیر جنگ کے درمیان اربوں روپے خرچ کر کے جو مرکز بنائے تھے، وہ بہت مستحکم سمجھے جاتے تھے۔ انھیں یا تو ایک طرف چھوڑ دیا گیا یا امریکی بیڑے نے انھیں رسد سے محروم کر کے طبعی موت مرنے دیا یا ہوائی، بری اور بحری حملے اس شدت سے کیے گئے کہ جاپانی کمانڈر کے سارے منصوبے اُلٹ پلٹ ہو گئے۔ بعض مقامات پر بڑی خوفناک اور خونریز لڑائیاں پیش آئیں، جیسا کہ جزیرہ آیوجیما[1] میں۔ جنگلات کے اندر نوجوان امریکیوں کو بڑی مشکلات سے سابقہ پڑا۔ آخر میک آرتھر لوزان (فلی پین) پہنچ گیا اور ویسی ہی کھلی لڑائیاں شروع ہو گئیں جیسی یورپ میں ہو رہی تھیں۔ امریکی سپاہی سمجھے بیٹھے تھے کہ منیلا[2] میں وہ تمام سامان موجود ہوں گے جو آج کل کے متمدن شہروں میں ہوتے ہیں، لیکن شہر اس درجہ تباہ ہو چکا تھا کہ ہٹلر کے بمباروں نے بھی ایسی تباہی کہیں نہ پھیلائی تھی۔

اب جاپان پر براہ راست وار کرنے کا مرحلہ آ گیا تھا جہاں لاکھوں سپاہی مقابلے کے لیے موجود تھے اور اس میں جلد کامیابی کی امید نہ تھی، اچانک امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا دیے۔ جن سے بے شمار غیر مصافی آبادی موت کے گھاٹ اُتر گئی اور جاپان مزید لڑائی کے بغیر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح لاکھوں امریکی سپاہیوں کے لیے خلاف توقع بہت جلد وطن واپس جانے کی صورت نکل آئی۔ لہٰذا بہت کم سپاہیوں کو اُس غیر مصافی جاپانی آبادی سے ہمدردی کا خیال پیدا ہو سکا جو ایٹم بم کا ہدف بنی تھی۔

۱- Iwo Jima ۲- Manila فلپینز کا دارالحکومت۔



جرمنی ہتھیار ڈال دیتا ہے

جرمنی کی جس جنگی قوت کے متعلق عام خیال یہ ہوگیا تھا کہ اسے توڑا نہیں جا سکتا، وہ روس، شمالی افریقہ، سسلی، اٹلی اور بلقان میں بہت بُری طرح پسپا ہوئی اور جرمنی کے قلب پر ضرب لگانے کا وقت آگیا۔ یہ ان عظیم الشان جنگی استحکامات پر براہِ راست حملہ تھا جو جرمنوں نے برّاعظم یورپ کی حفاظت کے لیے تیار کیے تھے۔ اس کے لیے فرانس میں فوجیں اُتارے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ۶؍ جون ۱۹۴۴ء کو اس یورش کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ جنرل آئزن ہاور تمام افواج کے سپہ سالار مقرر ہُوئے۔

جرمن آبدوزوں کی قوت ۱۹۴۳ء کے اواخر ہی میں توڑ دی گئی تھی۔ بے اندازہ سامان امریکہ سے برطانیہ پہنچا دیا گیا تھا۔ ہوائی جہازوں کے بیڑے جرمنی کے جنگی اور صنعتی مرکزوں کو بُری طرح تباہ کر چکے تھے، لیکن نارمنڈی کے ساحلی علاقے کے ساتھ ساتھ ایسے استحکامات بدستور موجود تھے جن کے متعلق باہر سے صحیح اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ ان کے پیچھے بےشمار توپیں، مسلح جنگی دستے اور زبردست فوجیں تھیں۔ یہ بہت ہی خوفناک جنگی قوت تھی۔

اتحادیوں نے چھ جون کو آدھی رات کے وقت ہوائی جہازوں کے ذریعے تین ڈویژن فوج جرمن استحکامات کے پیچھے اُتار دی۔ اس میں ایک ڈویژن برطانوی تھا اور دو امریکی۔ سُورج نکل آیا تو امریکہ کی پہلی فوج جنرل بریڈلے کی سرکردگی میں اور برطانیہ کی دُوسری فوج جنرل منٹگمری کی سرکردگی میں ساحل فرانس پر اُترنے لگیں اور کس اہتمام کے ساتھ؟ چار ہزار جہاز فوجیں اور سامان لانے لے جانے کے لیے رودبار میں مسلسل چکّر لگا رہے تھے۔ آٹھ سو جنگی جہازوں نے ان کی حفاظت کے لیے فولادی دیوار قائم کر رکھی تھی اور گیارہ ہزار ہوائی جہازوں نے سر پر سائبان تان رکھا تھا۔ جنگی قوّت کا یہ ایسا نظارہ تھا جسے ۶؍ جون ۱۹۴۴ء سے پیشتر سُورج کی آنکھ نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ابتدائی لنگرگاہیں حاصل کرنے میں بڑی خوفناک

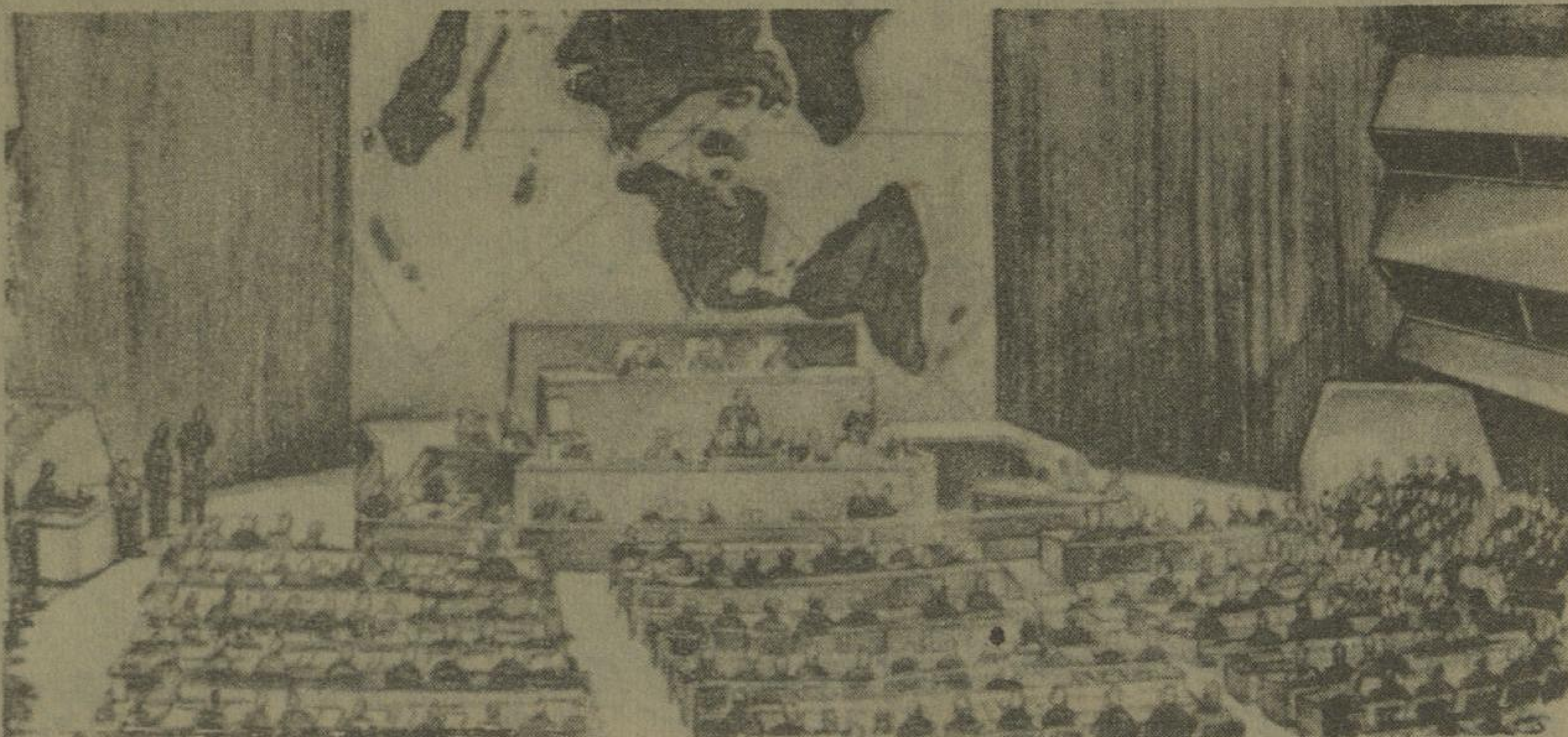
لڑائیاں ہوئیں اور سخت جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ پھر شر بورگ اور رود بار کی دُوسری بندرگاہوں پر قبضہ جمانے میں شدید مشکلات پیش آئیں، لیکن نارمنڈی پر قبضہ ہوگیا تو اتحادی فوجیں سیل کی طرح فرانس پر پھیل گئیں۔ پیرس کو خود وہاں کے رضاکار عساکر نے آزاد کرا لیا۔

مشرقی جانب سے سٹالن کے طوفانی لشکر بڑھے چلے آ رہے تھے۔ اٹلی میں بھی اتحادیوں کی پیش قدمی جاری تھی، اگرچہ اس کی رفتار تیز نہ تھی۔ ہٹلر نے ایک مقام پر جوابی حملے کا انتظام کیا اور جرمن فوجیں دُور تک بلجیم کے اندر گھس گئیں۔ اس اثنا میں ہوائی بموں کی بارش ان بندرگاہوں پر جاری تھی جہاں سے اتحادی فوجوں کو سامان رسد بھیجا جا رہا تھا، لیکن یہ حملہ ناکام بنا دیا گیا اگرچہ اس میں چار ہزار امریکی جانوں کی قربانی دینی پڑی۔

آخر کار روسی برلن تک پہنچ گئے جہاں ہٹلر دیر تک لڑتا رہا، حالانکہ اب ایسی مزاحمت میں کوئی معقولیت نہ رہی تھی۔ پھر اُس نے خودکشی کر لی۔ اتحادی فوجوں نے برلن پہنچنے میں کسی قدر دیر کی۔ رُوسی فوجوں نے برلن اور اس کے مشرقی علاقوں پر قبضہ کر کے قدم جما لیے۔ "اتحادی" اب تک اس دیر کے لیے پچھتاتے ہیں۔

جرمنی نے ۷، مئی ۱۹۴۵ء کو ہتھیار ڈال دیئے تھے۔





اقوامِ متحدہ کا منشور تیار ہوتا ہے

پہلی عالمگیر جنگ ختم ہوئی تو دُنیا میں امن قائم رکھنے کی غرض سے جمعیّت اقوام کی بنیاد رکھی گئی، لیکن یہ حکومتوں کی جمعیّت تھی اور حکومتیں اپنی خاص مصلحتوں کو انسانوں کی عام مصلحتوں کے لیے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا کرتیں۔ دُوسری عالمگیر جنگ میں ہٹلر اور مسولینی شکست کھا چُکے تو ۲۶ جون ۱۹۴۵ء کو سان فرانسسکو میں "انجمن اقوام متّحدہ" کے منشور پر دستخط ہوئے۔ یہ دُوسرا انظام تھا جو امن عالم کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا۔ جمعیّت اقوام کے مقابلے میں اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے واقعی قوموں کی انجمن بنایا گیا تھا۔

جمہوریہ امریکہ کے صدر فرینکلن روزویلٹ نے اقوامِ متحدہ کا جملہ پہلے پہل ان ملکوں کے لیے استعمال کیا تھا جو ایک دُوسرے کے دوش بدوش کامل یکجہتی سے ہٹلر، مسولینی اور جاپان کے خلاف لڑ رہے تھے لیکن دَوران جنگ کے یہ ساتھی بعد میں ہم خیال نہ رہ سکے اور ان میں اختلافات پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے یہ بین الاقوامی انجمن پُوری کامیابی سے کارفرما نہ رہی اور دنیا کی قوموں نے اس کے ساتھ جو امیدیں وابستہ کی تھیں، وہ پُوری نہ ہو سکیں، لیکن سیاسی ماہرین کی رائے میں اختلافات کے باوجود یہ انجمن جو عملی کام اب تک انجام دے چکی ہے، بڑا ہی قابل قدر ہے اور وہ تمام قوموں کو بنی نوع انسان سمجھ کر ان کی ضرورتوں اور اُمیدوں کی طرف توجہ کر رہی ہے۔

بے شک اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ دنیا میں امن قائم رہے، لیکن اس کے ابتدائی ممبروں نے قواعد میں بعض ایسے تحفّظات کا بندوبست کر لیا، جن کے مطابق بڑے ملکوں کے مفاد کی حفاظت ہو سکے۔

جن مدبّروں نے انجمن اقوام متّحدہ کا تاریخی منشور مرتّب کیا، وہ جانتے تھے کہ محض سیاسی تدبیروں سے کام لے کر امن قائم نہیں رکھا جا سکتا، اس لیے کہ جو علاقے اقتصادی لحاظ سے پس ماندہ تھے اور ان کی عام

حالت بہت پست تھی، وہاں جنگی جراثیم کی پرورش کے پُورے سامان موجُود تھے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ رُوئے زمین کے جن حصّوں میں انسانوں کے لیے ترقّی کے معقول ذریعے موجُود نہ تھے، وہاں درجۂ معیشت کو بلند کرنے پر خاص توجّہ مبذول کی جاتی۔ اس غرض سے انجمن اقوام مُتّحدہ نے کئی مستقل شعبے قائم کیے مثلاً بین الاقوامی مزدوروں کی بہتری اور بہبود کا کام، نیز خوراک اور زراعت کا کام الگ الگ شعبوں کے حوالے کر دیا گیا۔ بچّوں کی بہبود کے لیے ایک شاخ قائم ہوگئی۔ حفظانِ صحت کے لیے ایک جُداگانہ نظام بنا دیا گیا۔ یہ اور اسی قسم کے دُوسرے رفاہِ عام کے شعبوں نے تھوڑی ہی مدّت میں جو کارنامے انجام دیے وہ یقیناً قابلِ قدر ہیں۔

حفظانِ صحت کے نظام نے نگرانی اور حفظ ماتقدم کا ایک عالمگیر جال بچھا دیا ہے۔ کہیں وبا پھُوٹنے کا اندیشہ ہو تو فوراً انسدادی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں اور تمام ملکوں کو قبل از وقت آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ بعض خطرناک بیماریوں کے علاج کا انتظام جا بجا شروع کر دیا گیا ہے۔ بین الاقوامی پرواز کے شعبے نے سمندر میں جا بجا جہاز متعین کر دیے ہیں جو سب کو موسموں کی خبریں پہنچاتے رہتے ہیں اور اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو فوراً بچاؤ اور امداد کے لیے قدم اٹھاتے ہیں۔ خوراک اور زراعت کے شعبے نے مختلف ملکوں میں ان اجناس کی کاشت کا بندوبست کر دیا ہے جو وہاں پہلے کاشت نہ ہوتی تھیں، حالانکہ ان کی ضرورت تھی۔ ڈاک کی عالمگیر یونین نے خطوط کو کم سے کم خرچ پر جلد سے جلد پہنچانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ گویا قوموں میں نہیں، بلکہ انسانوں میں ہمدردی اور تعاون کا کام وسیع پیمانے پر شروع ہو چکا ہے، البتّہ نتائج کے لیے ہمیں کچھ دیر اور انتظار کرنا ہوگا۔

غرض انجمن اقوام متّحدہ اب تک جس رستے پر گامزن رہی ہے اس کے بارے میں نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مشکلات سے بالکل خالی تھا اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سفر سراسر خوشگوار تھا، لیکن اس حقیقت سے غالباً کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اس راستے پر سفر جاری رکھا جا سکتا ہے اور امید کا یہ چراغ برابر روشن چلا آتا ہے کہ اس امید پر کہ انجام کار یہ راستہ امن کی منزلِ مقصود پر پہنچا دے گا۔

جن ملکوں نے ابتدا میں منشور پر دستخط کیے تھے ان کے نام یہ ہیں: ارجنٹینا، آسٹریلیا، بلجیم، بولیویا، برازیل، سویت یونین، کینیڈا، چلّی، چین، کولمبیا، کاسٹاریکا، کیوبا، چیکوسلواکیا، ڈنمارک، جمہوریہ سانٹو ڈومنگو، ایکواڈور، مصر، سالواڈور، حبشہ، فرانس، یونان، گواٹی مالا، ہیٹی، ہانڈوراس، ہندوستان، ایران، عراق، لبنان، لائبیریا، لکسمبرگ، میکسیکو، ہالینڈ، نیوزی لینڈ، نکاراگوئے، ناروے، پاناما، پیراگوئے، پیرو، فلپینز، پولینڈ، دولت عربیہ سعودیہ، شام، ترکی، یوکرین، جنوبی افریقہ، جمہوریہ بیلوروس، برطانیہ، ریاست ہائے متّحدہ امریکہ، یوراگوئے، وینزویلا، یوگوسلافیا[1]۔

ا۔ ان میں پاکستان کا ذکر نہیں، لیکن یاد رہے کہ جُون ۱۹۴۵ء میں پاکستان بنا ہی نہ تھا۔ یہ ملک ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیمِ ہند سے معرضِ وجُود میں آیا اور پھر انجمن کا ممبر بن گیا۔



ہیروشیما پر ایٹم بم گرتا ہے

۶/ اگست ۱۹۴۵ء نے جاپان کے چھوٹے سے شہر ہیروشیما کے نام کو اس لحاظ سے بقائے دوام کا لباس پہنا دیا کہ ایٹم بم پہلی مرتبہ اسی شہر پر استعمال ہُوا اور تین روز بعد ناگاساکی پر دُوسرا بم گرا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے اور دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوگئی۔

مادّے کے چھوٹے سے چھوٹے ذرّے کو توڑ کر اس کی ظاہری قوت سے کام لینے کا خیال نیا نہ تھا۔ طبیعیات کے ماہر مدّت سے اس کام میں لگے ہُوئے تھے۔ آئن سٹائن نے بعض ایسے نظریات قائم کیے جن کے مطابق عملی تجربوں سے ایٹم بم تیار کرنے کی صورت نکل آئی۔ آئن سٹائن ہی نے پریزیڈنٹ روزویلٹ کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ اس کام کے لیے جتنا بھی روپیہ درکار ہو بے دریغ خرچ کیا جائے، اس لیے کہ ہٹلر کے سائنس دانوں کو شکست دینے کی اس کے سوا کوئی صُورت نہ تھی۔ چنانچہ سائنس دانوں کی ایک جماعت کو اس کام پر لگا دیا گیا۔ ان کی مجموعی کوششوں سے ذرّے کو پھاڑنے کی تدبیر کامیاب رہی اور قوت کا وہ خوف ناک ذخیرہ ہاتھ آ گیا، جس کا یقین سب کو تھا کہ ضرور دستیاب ہوگا۔

ایٹم بم تیار ہوگیا، لیکن اسے استعمال کرنے کا فیصلہ امریکہ کے پریزیڈنٹ ہیری ٹرومین پر موقُوف تھا اور اس کے استعمال کے لیے کوئی معقول وجہ درکار تھی۔ جاپان کی بحری اور ہوائی قوت پُوری طرح تباہ ہو چکی تھی، لیکن اس کی برّی قوت بہ دستور قائم تھی۔ جب تک جاپان پر حملہ کر کے اس برّی قوّت کو ختم نہ کیا جاتا، جنگ ختم نہ ہو سکتی تھی۔ خدا جانے اس میں کتنی دیر لگتی اور جاپان کے علاوہ خود اتّحادیوں کو کتنا کثیر جانی نقصان برداشت کرنا پڑتا۔ چنانچہ پریزیڈنٹ ٹرومین نے ایٹم بم کے استعمال کی اجازت دے دی اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، یہ بم پہلے ہیروشیما پر، پھر ناگاساکی پر گرایا گیا۔

ہیروشیما میں ایک بم نے جو قیامت برپا کی، اس کا سرسری اندازہ یُوں ہو سکتا ہے کہ کم و بیش ڈیڑھ لاکھ افراد مارے گئے یا زخمی ہوئے یا پاگل ہو گئے۔ شہر کی تین چوتھائی عمارتیں ملبے کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہیروشیما کی آبادی میں سے جو لوگ بچے، ان کے بچّوں، پوتوں، پڑپوتوں پر اس بم کے اثرات کن کن صورتوں میں رُونما ہُوئے یا ہوں گے۔



پاک و ہند سے یورپ کا تعلق پیدا ہوتا ہے

ہندوستان کے ساتھ یونان کے رابطے کی ابتدا اسکندر اعظم کے حملے سے ہوتی ہے ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کے بعد یونانیوں نے ہندوستان کے بارے میں جو کچھ لکھا وہی اس وسیع ملک کی پرانی تاریخ کا سرمایہ ہے ۔ خود یہاں کے لوگوں کو نہ تاریخ سے چنداں دلچسپی تھی اور نہ ان کی کتابوں میں تاریخی تفصیلات ملتی ہیں۔

سکندر بیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا ۔ اس وقت تک مقدونیہ کو بھی یونان میں کوئی خاص حیثیت حاصل نہ تھی ۔ یونان اور ایران کے درمیان مدت سے لڑائیاں جاری تھیں ۔ سکندر نے شروع ہی سے ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ ایران کی قوت کو مٹائے بغیر چین نہ لے گا ، چنانچہ فوج لے کر نکلا اور درہ دانیال کے پاس سے سمندر کو عبور کر کے ایشیا میں داخل ہو گیا ۔ روانگی سے پہلے اپنا سارا مال دوستوں میں بانٹ دیا ۔ جب پوچھا گیا کہ اپنے لیے کیا رکھا تو کہا " امید " یہ سنتے ہی دوستوں نے بھی سب کچھ یہ کہتے ہوئے لٹا دیا کہ ہمارے لیے بھی امید ہی کافی ہے ۔

ایشیائے کوچک ، شام ، مصر اور ایران کو جب اسکندر فتح کر چکا تو اس کے دل میں دنیا بھر کو مسخر کرنے کا جذبہ ابھرا ، چنانچہ ترکستان ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہو گیا ۔ خدا جانے ہندوستان اس وقت کتنی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا ۔ جس علاقے کو ہم پنجاب کہتے ہیں ، اس میں کم از کم آٹھ ریاستیں قائم تھیں ۔ ان میں سے بعض نے مقابلہ مناسب نہ سمجھا اور اطاعت قبول کر لی ۔ صرف راجا پورس نے مقابلے کی ٹھان لی ۔ وہ دریائے

جہلم اور دریائے چناب کے درمیانی علاقے کا حاکم تھا۔

پورس نے اپنی فوج کے پرے اس طرح جما دیئے تھے کہ سکندر دریائے جہلم کو عبور نہ کر سکے، لیکن وہ لمبا چکر کاٹ کر دریا کے پار اتر آیا اور ایسے وقت میں حملہ آور ہوا جب پورس کو لڑائی کا سان گمان بھی نہ تھا۔ راجا کی فوج نے شکست فاش کھائی اور وہ خود بھی لڑتے لڑتے زخموں سے چُور ہو گیا۔ یونانیوں نے اسے گرفتار کر لیا اور سکندر کے سامنے لے گئے۔ اس نے پُوچھا "کہو تم سے کیا سلوک کیا جائے؟" پورس نے بیباکی سے جواب دیا: "جیسا سلوک بادشاہ بادشاہوں سے کرتے ہیں۔" سکندر اس جواب سے بہت خوش ہوا اور پورس کی پوری ریاست بحال کر دی، بلکہ اور علاقے بھی اسے دے دیئے۔ پھر سکندر آگے بڑھا۔ دریائے بیاس پر پہنچا تو فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ مجبور ہو کر لوٹا اور بابل پہنچ کر تینتیس سال کی عمر میں اس دُنیائے فانی سے انتقال کر گیا۔

سکندر یہاں سے جاتے وقت پورس ہی کو تمام مفتوحہ علاقوں کی نگرانی کے لیے اپنا نائب بنا گیا تھا۔ پورس نے بھی جیتے جی وفاداری کا حق ادا کیا۔ سکندر کی فتح کا سب سے قابلِ قدر نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ اور ہندوستان کے درمیان جو پردہ پڑا ہوا تھا، وہ اُٹھ گیا اور باہم گہرے تعلقات کا دروازہ کُھل گیا۔

حق باطل پر غالب آتا ہے

ہر اچھے نظام سے فائدہ اٹھانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ انسان کے دل میں اس کی اچھائی کا یقین ہو اور وہ خوش دلی سے اس پر عمل بھی کرے۔ اسلام امن و سلامتی کا آخری پیغام، دُنیا اور آخرت کی زندگی کا بہترین نظام ہے۔ اس کے لیے بھی ضروری تھا کہ انسانوں میں یقین اور ایمان کی سچّی رُوح پیدا ہو جائے اور وہ اس پر کاربند رہیں۔ یقین اور ایمان کی رُوح جبر سے پیدا نہیں ہو سکتی، اس لیے اسلام کا بنیادی اصُول یہ قرار دیا گیا ہے کہ دین کے معاملے میں کسی پر جبر نہیں۔ ہدایت اور گمراہی کے راستے سب پر واضح ہو گئے ہیں۔ ہر شخص خدا کی دی ہوئی بصیرت سے کام لے کر خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اسے فائدے کی طرف لپکنا چاہیے یا آنکھیں بند کر کے ہلاکت کے غار میں جا گرنا چاہیے۔

حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسلام کی دعوت شروع کی اور لوگ اندھیرے سے روشنی کی طرف آنے لگے تو قریش نے، جنھیں مکّہ ہی میں نہیں، پُورے عرب میں سرداری اور عزّت کا مرتبہ حاصل تھا اس پیغامِ حق کی مخالفت شروع کر دی۔ وہ زور و قوّت سے کام لے کر غریب و مسکین مسلمانوں کو ظلم و جَور کا نشانہ بنانے لگے۔ کسی کو دوپہر کی تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر اس کے سینے پر بھاری پتّھر رکھ دیتے۔ کسی کے گلے میں رسّا باندھ کر بازاروں میں کھینچتے۔ کسی کو دہکتے ہُوئے انگاروں کے فرش پر لیٹ جانے کے لیے مجبُور کرتے۔ تیرہ سال تک مسُلمانوں نے ہر قسم کی سختیاں صبر کے ساتھ برداشت کر لیں، مگر قریش کے طور طریقے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ خود حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے خاندان کو تین سال تک ایک گھاٹی میں بند رہنا پڑا۔ طائف میں آپ پر پتّھروں کی بارش ہوئی۔ مجبور ہو کر آپ نے ساتھیوں کو مکّہ سے مدینہ جانے کی اجازت دے دی، جہاں کے باشندے مسلمانوں کی مہمانداری کے لیے تیار تھے۔ بعد میں آپ بھی وہیں تشریف لے گئے۔

لیکن قریش کے دل میں دشمنی کی آگ بدستور بھڑکتی رہی اور اُنھوں نے مدینے پر حملے شروع کر دیے اور مدینے کے یہودیوں کو ساتھ ملا کر مسُلمانوں کے لیے رہنا سہنا دوبھر بنا دیا۔ آخر کار مسُلمانوں کو بھی اپنی حفاظت کے لیے قدم اُٹھانا پڑا۔

بدر کے مقام پر مسلمانوں اور قریش کے درمیان ایک زبردست لڑائی ہوئی جسے قرآن مجید میں فیصلے کا دن کہا گیا ہے، اس لیے کہ اس دن حق اور باطل، نیکی اور بدی، راستی اور گمراہی، سچ اور جھُوٹ کے درمیان قطعی فیصلہ ہو گیا۔ مسلمان تین سو سے کچھ زیادہ تھے اور قریش ایک ہزار سے کم نہ تھے۔

پھر مسلمانوں کے پاس جنگ کا ساز و سامان بھی بہت کم تھا۔ ادھر قریش کے پاس نہ دولت کی کمی تھی نہ ساز و سامان کی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مسلمان لڑنا نہیں چاہتے تھے اور انھوں نے لڑائی کے لیے پہل ہرگز نہ کی تھی، البتہ قریش کی دراز دستیوں کا جواب دینے کے لیے ضرور تیار ہوئے۔ بدر کی جنگ بھی اس وجہ سے ہوئی کہ قریش نے تجارت میں گراں قدر رقم فراہم کر کے مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاریوں کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بہت بڑا تجارتی قافلہ شام بھیجا۔ مسلمان اس پر چھاپہ مارنے میں بالکل حق بجانب تھے۔ ابھی دیکھ بھال ہی جاری تھی کہ قافلۂ قریش کے سردار نے قاصد کے ذریعہ مکّہ پیغام بھیج دیا اور قریش کو بلا لیا۔ وہ خوب تیار ہو کر بڑے کرّوفر کے ساتھ دو سو میل کا فاصلہ طے کر کے بدر پہنچ گئے۔ اگرچہ اس وقت تک قافلہ بچ کر بدر سے آگے نکل گیا تھا اور حملے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا مگر قریش نے فیصلہ کر لیا کہ لڑے بغیر نہ جائیں گے۔ اس طرح جنگ ہوئی، قریش نے شکست فاش کھائی اور ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے یا قید ہو گئے۔

بدر کے مقام پر حق کی فتح و ظفر کا پھریرا پہلی مرتبہ کھُلا تھا۔ پھر یہ زیادہ سے زیادہ کھُلتا اور سربلند ہوتا گیا، یہاں تک کہ سات آٹھ سال کے اندر عرب کی پوری سرزمین اس کے سائے تلے آ گئی۔ تھوڑی ہی مدت میں پرانی دنیا کے تینوں برّاعظم تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھے اور اوقیانوس سے بحرالکاہل تک ہر خطّہ میں دینِ حق کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

بدر کا یہ معرکہ جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑی سے بڑی جنگ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، بروز جمعہ، ۱۷ر رمضان، ۲ ہجری مطابق مارچ ۶۲۴ء پیش آیا۔

اسلام فتحِ مبین حاصل کرتا ہے

اگرچہ جنگِ بدر نے قریش کا دم خم توڑ دیا تھا لیکن باطل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ چوٹ کھا کر اپنی ہٹ پر اور پکّا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قریش نے بدر کے بعد بھی مسلمانوں پر دو مرتبہ حملے کیے۔ ایک مرتبہ تو وہ مختلف قبیلوں سے سازباز کر کے اتنا بڑا لشکر لے آئے جتنا عرب کی سرزمین نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن ہر مرتبہ اُنھیں ناکامی و نامرادی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اس آخری حملے کو جسے "جنگ خندق" کہتے ہیں، مسلمانوں اور قریش کی کشمکش میں انقلابی نقطے کی حیثیت حاصل ہے، یعنی اس کے بعد سیل کا رُخ پلٹ گیا، گرد و غبار چھٹ گیا اور اسلام کی کامیابی کے سورج سے ساری فضا جگمگا اٹھی۔

جنگِ بدر ہجرت کے دُوسرے سال ہوئی تھی۔ ہجرت کے چھٹے سال ذوالقعدہ کے مہینے میں (مارچ ۶۲۸ء) حضرت رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کعبے کی زیارت کا ارادہ فرمایا۔ چودہ سو حق پرست آپ کے ہمرکاب تھے۔ اس مہینے میں عربوں کے قدیم دستور کے مطابق سب کو مکّہ شریف جانے کی عام اجازت ہوتی تھی اور لڑائیاں بالکل بند کر دی جاتی تھیں، مگر قریش مسلمانوں کی آمد کو برداشت نہ کر سکے اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ و سلّم نے مکّہ شریف سے تھوڑے فاصلے پر حدیبیہ[1] کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے اور کوشش کی کہ صلح سے معاملہ طے ہو جائے۔ حضرت عثمانؓ کو بات چیت کے لیے قریش کے پاس بھیجا۔ تھوڑی دیر میں افواہ پھیل گئی کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا ہے۔ یہ گویا جنگ کا اعلان تھا۔ چنانچہ حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر چودہ سو ساتھیوں سے بیعت لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ افواہ غلط تھی۔

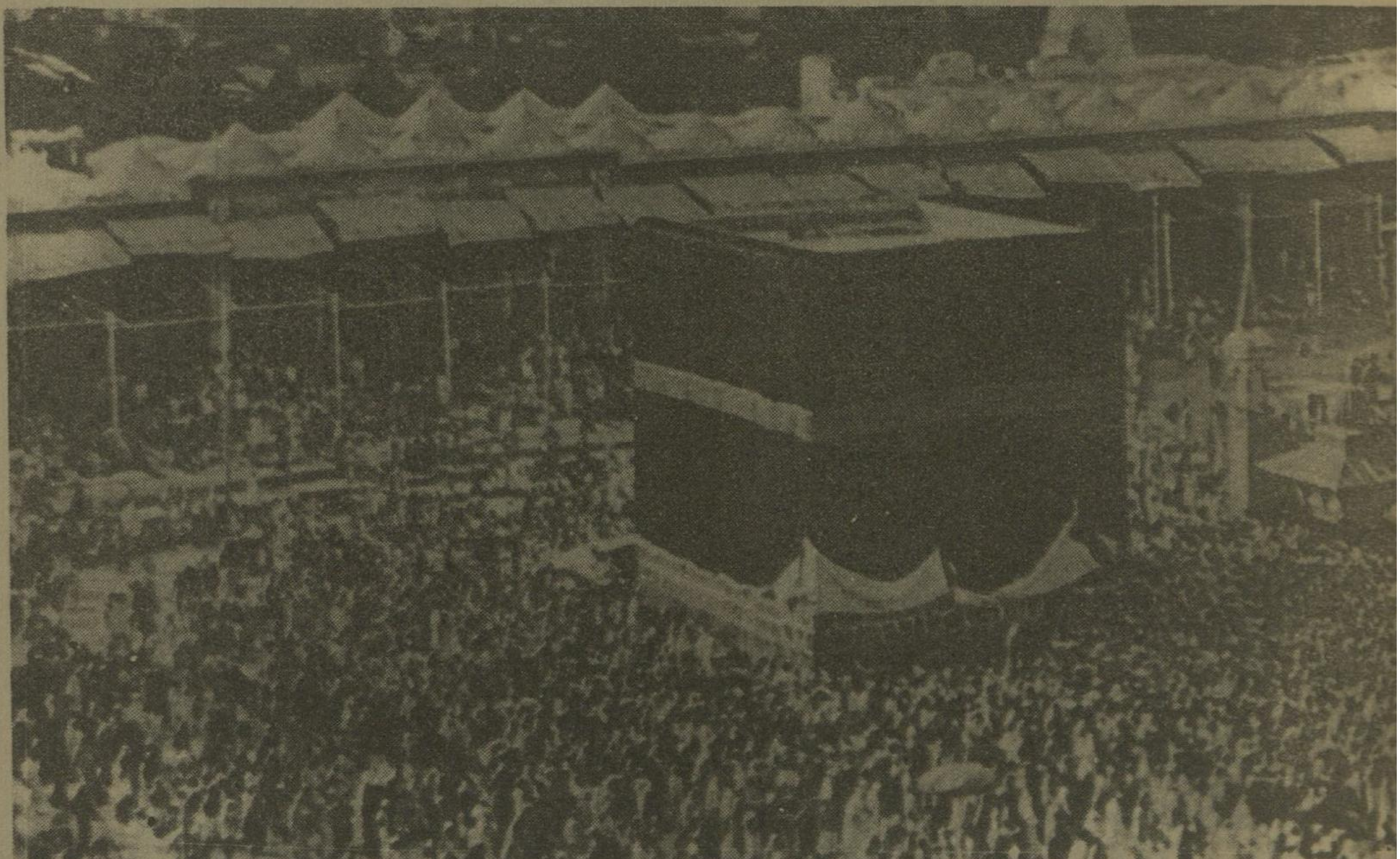
قریش کو مسلمانوں کے ارادۂ جنگ کی خبر ملی تو ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی اور انھوں نے صُلح کی بات چیت شروع کر دی۔ غرض دس سال کے لیے صُلح ہو گئی۔ جو شرطیں طے ہوئیں ان میں بظاہر مسلمانوں کا پہلو دبا ہوا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ اس سال واپس چلے جائیں اور اگلے سال آئیں تو کعبے کی زیارت کا موقع دے دیا جائے گا۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں اور تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں۔ مکّے سے کوئی شخص پناہ کی غرض سے مدینہ جائے گا تو وہ واپس بھیج دیا جائے گا۔ لیکن کوئی شخص پناہ کی غرض سے مدینے

۱۔ یہ مقام اب چنداں مشہور نہیں اور اس کے پاس کا ایک مقام شمیسی کے نام سے شہرت پا گیا ہے۔

سے مکے آئے گا تو وہ واپس نہ کیا جائے گا۔

ان شرطوں پر بعض صحابہؓ کو تعجب ہوا لیکن حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرائط منظور فرمالیں۔ قرآن مجید نے اس صلح کو کھلی ہوئی فتح" قرار دیا اور مسلمانوں کو ایک اور قریبی فتح کی خوشخبری بھی دے دی کوئی شبہ نہیں کہ یہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی کھلی ہوئی فتح تھی۔ لڑائیاں حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں، بلکہ قریش نے شروع کی تھیں۔ اسلام دین کے معاملے میں جبر کا روادار نہ تھا۔ قریش نے لوگوں کو دینِ حق سے جبراً روکنے کی کوشش کی اور تیرہ سال تک مکے میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کرتے رہے اور جب مسلمان مدینہ شریف چلے گئے تو وہاں بھی چھ سال تک مسلمانوں کو سکھ کا سانس نہ لینے دیا اور یہ یقیناً اسلام کی کھلی ہوئی فتح تھی کہ قریش کم سے کم دس سال کے لیے جبر و ظلم سے دست بردار ہو گئے۔ لڑنے میں ہمیشہ پہل انھوں نے کی، مگر اب خود ہی لڑائی ترک کر رہے تھے۔ اسلام رائے اور عقیدے کی آزادی کا حامی تھا۔ رائے اور عقیدے کی آزادی حدیبیہ کے صلح نامے کی بنیاد تھی۔ اس سے زیادہ روشن اور کھلی ہوئی فتح اور کیا ہو سکتی تھی؟

پھر یہی صلح نامہ تھا جس کی بدولت حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی کشمکش سے فراغت مل گئی اور آپ آزادی اور اطمینان سے اسلام کا پیغام پہنچانے لگے۔ جو قبیلے اور گروہ قریش کے خوف سے اسلام قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے، وہ جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہونے لگے۔ یقیناً یہ "فتح مبین" تھی اور دوسری قریبی فتح جس کی خوشخبری دی گئی تھی، فتح مکہ کی شکل میں رونما ہوئی۔



مکّہ شریف فتح ہوتا ہے

صُلح حُدیبیہ کو تقریباً دو سال گزر چکے تھے۔ اس کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو قبیلے چاہیں مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں اور جو چاہیں قریش کے ساتھی بن جائیں۔ انھیں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو صُلح کرنے والے فریقوں کو حاصل ہیں۔

مکّہ معظّمہ کے پاس دو قبیلے آباد تھے جن میں باہم لڑائی تھی۔ ان میں سے ایک مسلمانوں سے مل گیا اور دُوسرا قریش کا ساتھی بن گیا۔ اچانک قریش کے ساتھی قبیلے نے مسلمانوں کے ساتھی قبیلے پر حملہ کر دیا۔ قریش نے بھی اپنے ساتھیوں کو مدد دی، اور مُسلمانوں کے ساتھیوں پر سخت ظلم کیا، یہاں تک کہ حرم میں بھی اُنھیں امان نہ ملی، جہاں کسی پر اُنگلی تک نہ اُٹھائی جا سکتی تھی۔ یہ دردناک خبر مدینہ منوّرہ پہنچی تو حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ و سلّم نے قریش کے سامنے فیصلے کی تین صُورتیں پیش کیں:-

۱۔ مظلوموں کا جو جانی اور مالی نقصان ہوا ہے اُس کی تلافی کر دی جائے۔

۲۔ قریش اپنے ساتھی قبیلے کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں۔
۳۔ یہ اعلان کر دیا جائے کہ حُدیبیہ کا صُلح نامہ باقی نہیں رہا۔

ایک جلد باز نے کہہ دیا کہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے۔ یہ سُنتے ہی حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ شریف کی تیاری شروع کر دی۔ اب دس ہزار جانباز آپ کے ساتھ تھے۔ مکّہ شریف سے چند میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ دس ہزار آدمی دُور تک پھیل گئے اور رات کو الگ الگ آگ روشن کی تو دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ فوج کوہ و وادی پر چھائی ہوئی ہے۔

قریش کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ان کے ایک سردار ابوسفیان نے دربارِ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا اور اپنی قوم کے لیے امان چاہی۔ دُوسرے روز آپ نے اعلان فرما دیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے یا اپنے گھر میں بیٹھا رہے یا کعبے میں چلا جائے یا اُبوسفیان کے گھر میں پناہ لے، اُسے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اس طرح مکّہ شریف بغیر جنگ اور خونریزی کے فتح ہو گیا۔

آپ نے اہلِ مکّہ کو جمع کیا۔ ان میں وہ سب لوگ شامل تھے، جن کی تلواریں اور برچھیاں اکّیس سال تک مُسلمانوں پر برستی رہی تھیں۔ اس موقع پر آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ کسی فاتح کی زبان سے نہ پہلے سُنا گیا اور نہ بعد میں۔ فرمایا:

"ایک خُدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پُورا کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور مخالفوں کے تمام منصوبوں کو اکیلے توڑ کر رکھ دیا۔ ہاں سُن لو فخر کی تمام باتیں، مال اور خون کے سارے دعوے میرے قدموں کے نیچے ہیں۔

اے قریش! خُدا نے جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹّی سے بنے تھے۔"

ساتھ ہی قرآن مجید کی ایک آیت تلاوت فرمائی، جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"لوگو، میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دُوسرے سے پہچان لیے جاؤ۔ خدا کے نزدیک زیادہ عزّت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ خُدا دانا اور واقف کار ہے۔"

نسل کے غرور، نسب کے گھمنڈ اور دولت و عزّت کے فخر کو مٹا کر انسانی مساوات کا یہ پہلا پاکیزہ اعلان تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان ہونے کے لحاظ سے عرب و عجم، امیر و غریب، شاہ و گدا، حاکم و محکوم سب برابر ہیں۔ خُدا کے ہاں اُونچ نیچ کا پیمانہ صرف ایک ہے اور وہ ہے عمل، اخلاق، نیکی۔ وہ ہے خُدا کے حکموں کی پیروی۔

آخر میں فرمایا:۔

"جانتے ہو میں تم سے آج کیا سلُوک کرنے والا ہوں؟"

پھر خود ہی فرمایا:۔

"تم پر آج کچھ الزام نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

آپ نے یوں قریش کے پچھلے ہزار ظلم و جور پر عفو کا ایک ہی خط کھینچ دیا اور سب کو موقع دے دیا کہ ماضی کو بھول کر آیندہ کے لیے اپنا طرزِ عمل درست کریں۔ تاریخ کے تمام دفتر کھنگال ڈالو، عفو و رحمت کی ایسی ایک بھی مثال نہ پاؤ گے۔

دُنیا کو امن وسلامتی کا آخری پیغام ملتا ہے

حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ہجرت کے دسویں سال حج کیا۔ اس موقع پر کم و بیش ڈیڑھ لاکھ مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے ان کے سامنے ایک سے زیادہ خطبے ارشاد فرمائے۔ ان میں زیادہ تر وہ باتیں تھیں، جو صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پُوری نوعِ انسان کے لیے چراغِ ہدایت تھیں۔ بعض ارشادات یہاں پیش کیے جاتے ہیں:-

توحید اور انسانی مساوات کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے فرمایا:-

"لوگو! بیشک تمھارا خُدا ایک ہے اور بیشک تمھارا باپ ایک ہے۔ جان لو کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔"

بے شک سب کا خدا ایک ہے۔ وہی پیدا کرتا ہے۔ وہی رزق دیتا ہے۔ وہی عبادت کے لائق ہے۔ اگر ایک باپ کے بیٹوں میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہو سکتا تو آدم کی اولاد کے درمیان کیوں فرق کو راہ دی جائے؟ انسانوں کی بڑائی عمل کی نیکی اور اخلاق کی اچھائی پر موقوف ہے۔ رنگ، نسل، خاندان، قوم، وطن، دولت یا ایسی ہی کوئی دوسری چیز کسی کو کیوں کر بڑا بنا سکتی ہے؟ دیکھو اس چھوٹے سے ارشاد نے انسانیت کے فکر و نظر میں کتنا بڑا اور بنیادی انقلاب پیدا کر دیا۔ ہر شے سے توجہ ہٹا کر صرف نیکی اور حسنِ اخلاق کو انسانوں کا نصب العین بنا دیا۔ کیا اس ایک ارشاد پر کاربند ہو جانے سے انسانیت کے وہ سارے دُکھ دُور نہیں ہو سکتے جو آج شرق و غرب کو پریشان کیے ہُوئے ہیں؟

اجتماعی زندگی اصولاً تین چیزوں پر قائم ہے: جان کی حفاظت، مال کا پاس اور آبرو کا احترام۔ مذہب نے جن باتوں کو گُناہ اور قانون نے جُرم قرار دے رکھا ہے، غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سب انھی تین اصُول کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ ہیں یا ایسے کام ہیں جو انسانوں کو ان حدوں سے بے پروائی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:-

"تمھاری جانیں، تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں ایک دُوسرے پر قیامت تک کے لیے اس طرح حرام ہیں جس طرح تم آج کے دن (یومِ حج) اس شہر (مکہ شریف) اور

اس مہینے (ماہ حج) کی حُرمت کرتے ہو۔"

عربوں میں دو بڑے عیب تھے: ایک یہ کہ کسی کے ہاتھ سے کوئی مارا جاتا تو بدلے کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ دُوسرا یہ کہ دولتمندوں نے سُود خوری اور مہاجنی کے ذریعے ضرورتمندوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان دونوں باتوں کو اسلام سے پیشتر کے دَور کی گمراہیاں قرار دیا اور دونوں کو ختم کر دیا۔

پھر مختلف ضروری اُمُور کی تاکید فرمائی۔ مثلاً:

۱۔ میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دُوسرے کی گردن کاٹنے لگو۔

۲۔ ہر مسلمان دُوسرے کا بھائی ہے اور تمام مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

۳۔ عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو اور غلاموں کا خیال رکھو۔ جو خود کھاؤ انھیں کھلاؤ جو خود پہنو انھیں پہناؤ۔

۴۔ دین میں حد سے نہ بڑھو۔ تم سے پہلی قومیں حد سے بڑھ جانے ہی کے باعث برباد ہوئیں۔

۵۔ مجرم اپنے جُرم کا خود ذمہ دار ہے۔ نہ باپ کے جُرم کے لیے بیٹا جواب دہ ہے نہ بیٹے کے جُرم کے لیے باپ۔

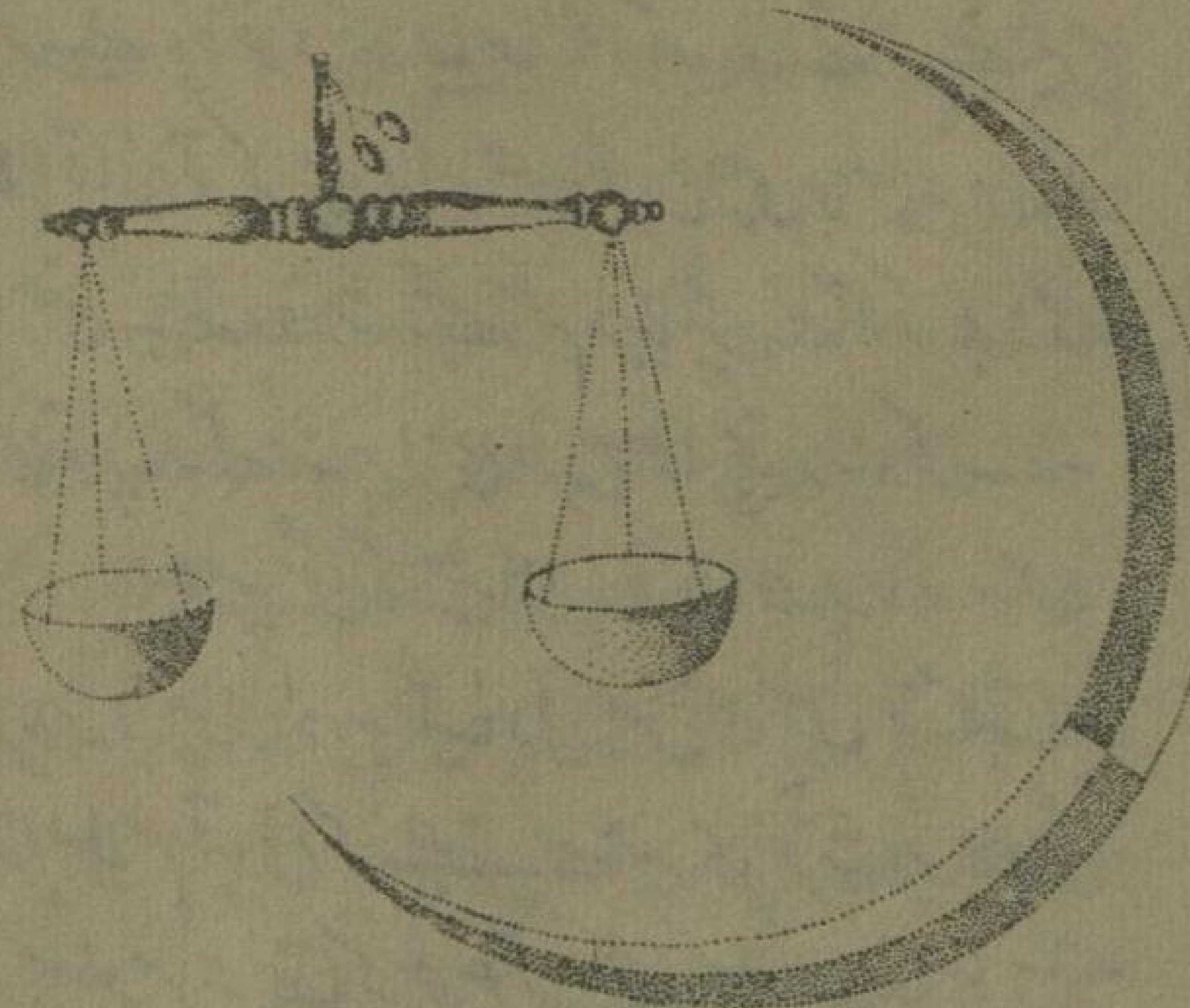
۶۔ تم پر ایک نکٹا حبشی بھی امیر بنا دیا جائے اور وہ تمھیں خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کا حکم سُنو اور اس کی فرمانبرداری کرو۔

۷۔ لوگو! نہ میرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ تمھارے بعد کوئی اُمّت پیدا ہونے والی ہے۔

خطبہ ارشاد فرما چکے تو حاضرین سے پُوچھا کہ خُدا کے ہاں تم سے میری نسبت پُوچھا جائے گا تو کیا کہو گے؟ سب نے بیک وقت جواب دیا کہ ہم کہیں گے آپ نے خُدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ یہ جواب سُن کر آپ نے آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھائی اور تین بار فرمایا۔ اے خدا! گواہ رہنا۔

اس طرح انسانیت کو خُدا کا پیغام پہنچایا جا چُکا تو تقریباً تین ماہ بعد خدائے پاک کا آخری رسول دوشنبہ، ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ (مطابق جون ۶۳۲ء) کو دنیا سے رُخصت ہو گیا۔ اُس پر ہمیشہ ہمیشہ دُرود اور سلام ہو۔

عدل کی بُنیاد اُستوار ہوتی ہے



اِسلام کا اِبتدائی دور اور حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ حجاز کے شمال میں عربوں کے ایک خاندان بنی غسّان نے ایک سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ شام میں رومیوں کا اقتدار قائم ہُوا تو یہ غسّانی سلطنت ان کے زیرِ اثر آگئی۔ جبلہ اس کا آخری تاجدار تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ عرب کے تمام قبیلے اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے ہیں اور نئی اسلامی حکومت نے رُوم و ایران کی شوکت پر بھی لرزہ طاری کر دیا ہے تو وہ خود بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا اور حضرت عمرؓ کو اپنے ارادے کی اطلاع دے دی کہ مدینہ منوّرہ میں حاضر ہو کر اسلام لانا چاہتا ہوں۔ حضرت عمرؓ یہ اطلاع پاکر بہت خوش ہُوئے اور فرمایا کہ بہت شوق سے آؤ۔ قبولِ اسلام کے بعد تمھیں وہ تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور تمھارے ذمّے وہی فرض عائد ہو جائیں گے جو ہم پر عائد ہیں۔

جبلہ پانسو سواروں کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچا۔ اس نے تمام سواروں کو زربفت کی قبائیں پہنا رکھی تھیں۔ خود بھی زرنار لباس زیب بدن کر رکھا تھا اور سر پر مرصّع سنہرا تاج جگمگا رہا تھا۔ اہل مدینہ نے اس ٹھاٹھ کا جلوس پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

غرض جبلہ حضرت عمرؓ کے دست مبارک پر اسلام لایا۔ حج کا موسم قریب تھا اور حضرت عمرؓ ہی کے ساتھ وہ بھی حج کے لیے مکہ معظمہ پُہنچا۔ ایک روز خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ اتّفاق سے ایک بدوی کا پاؤں نادانستہ جبلہ کے چُغے کے دامن پر پڑ گیا۔ جبلہ کے دماغ سے شاہی غرور ابھی زائل نہ ہُوا تھا، اس نے بدوی کے منہ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ ناک کا بانسہ پھُوٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ بدوی نے جبلہ سے تو کچھ نہ کہا اور دادخواہی کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس پہنچ گیا۔

خلیفۂ اسلام نے شکایت سُن کر جبلہ کے پاس آدمی بھیجا اور دریافت کیا کہ اس بے گناہ کو کیوں مارا ہے؟ جبلہ نے جواب دیا کہ اس نے سخت گستاخی کی۔ میرے لباس پر پاؤں رکھ دیا۔ یہ تو طمانچہ ہی تھا، اگر خانۂ خُدا کی حرمت کا پاس نہ ہوتا تو اس کا سر اُڑا دیتا۔

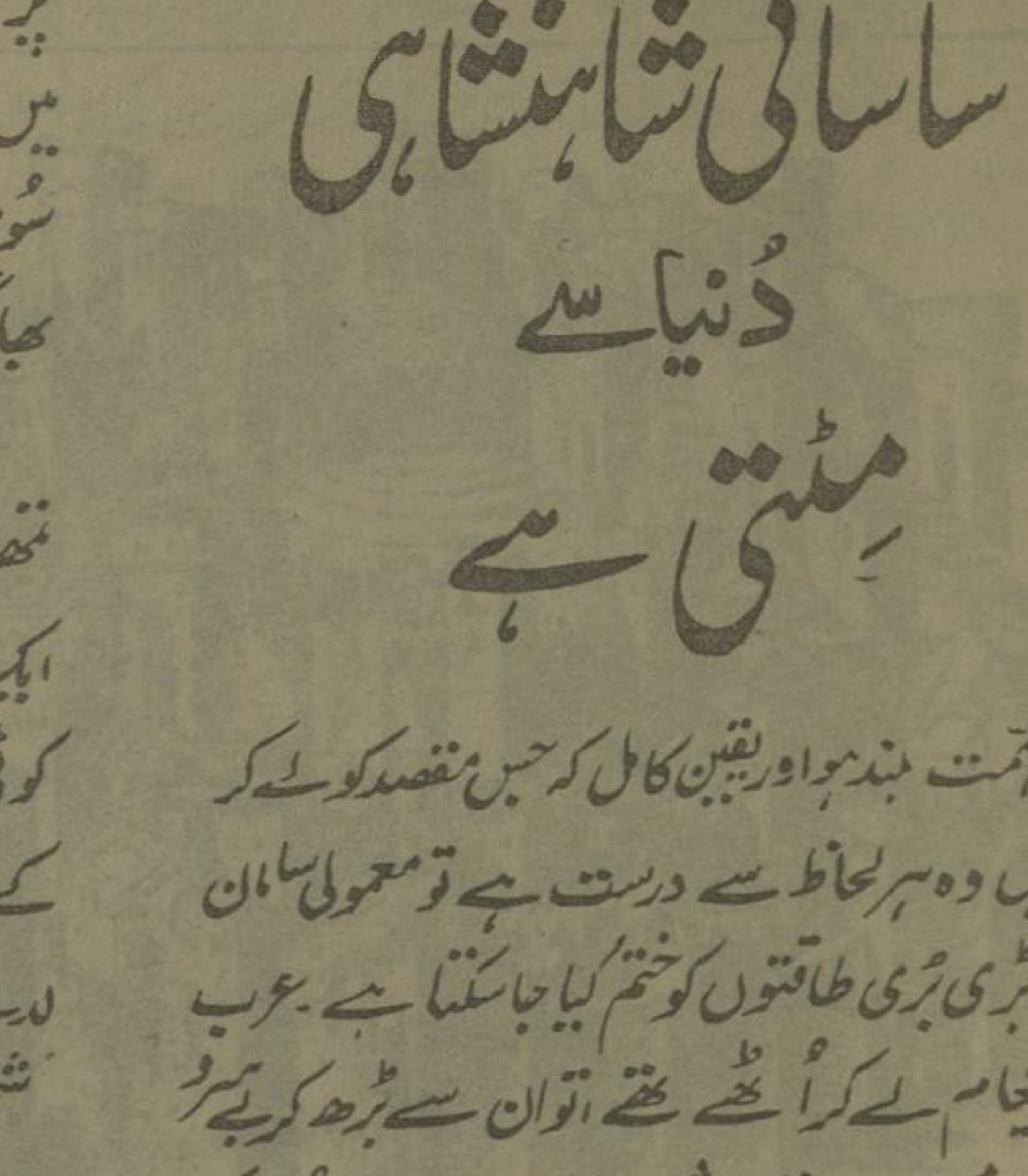
حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خیر اور جو کچھ آپ کرتے وہ تو دیکھ لیا جاتا، آپ نے اپنے جرم کا اقبال تو کر ہی لیا، جس طرح بھی ہو اس بدوی کو راضی کیجئے، ورنہ مجھے حکم دینا پڑے گا کہ بدوی بھی آپ کے منہ پر اسی طرح طمانچہ رسید کرے۔

جبلہ یہ سُن کر حیران رہ گیا اور بولا کہ میں فرمانروا ہوں اور یہ ایک ادنیٰ شخص ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے میری عزت بڑھے گی۔ یہ معلوم نہ تھا کہ جو عزت مجھے پہلے سے حاصل ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اسلام نے تمھیں اور اس شخص کو برابر کر دیا ہے فضیلت میں بڑا وہ ہے جو نیک اعمال میں بڑا ہو۔ تمھاری عزت یقیناً بڑھ گئی، وہ اس طرح کہ تم میں اور تمام مسلمانوں میں اخوت و برادری کا رشتہ پیدا ہو گیا۔

آخر جبلہ نے ایک رات سوچنے کی مہلت مانگی۔ اندھیرا چھا گیا تو وہ اپنے سواروں کو لے کر چپ چاپ مدینہ سے نکل گیا۔ وہ اپنے وطن میں بھی نہ ٹھہرا، بلکہ رُومی بادشاہوں کے علاقے میں جا پہنچا اور باقی زندگی وہیں عیش و آرام سے بسر کی، لیکن آخری وقت تک اسلام سے پھر جانے پر پچھتاتا رہا وہ خود کہا کرتا تھا کہ کاش میری ماں مجھے نہ جنتی اور کاش میں وہ بات مان لیتا جو حضرت عمرؓ نے فرمائی تھی۔

دیکھو حضرت عمرؓ نے چھوٹے بڑے کا لحاظ کیے بغیر سلطانی عدل کا فیصلہ سُنا دیا اور جبلہ کی خاطر اصول میں ردّ و بدل گوارا نہ کیا۔ حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا تھا کہ پہلی قومیں اس لیے ہلاک ہوئیں کہ غریبوں پر شریعت کا حکم لگا دیا جاتا تھا اور امیروں سے کچھ نہ کہا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے دُنیا کو اسلامی عدل کا نمونہ دکھا دیا۔





ساسانی شاہنشاہی دُنیا سے مِٹتی ہے

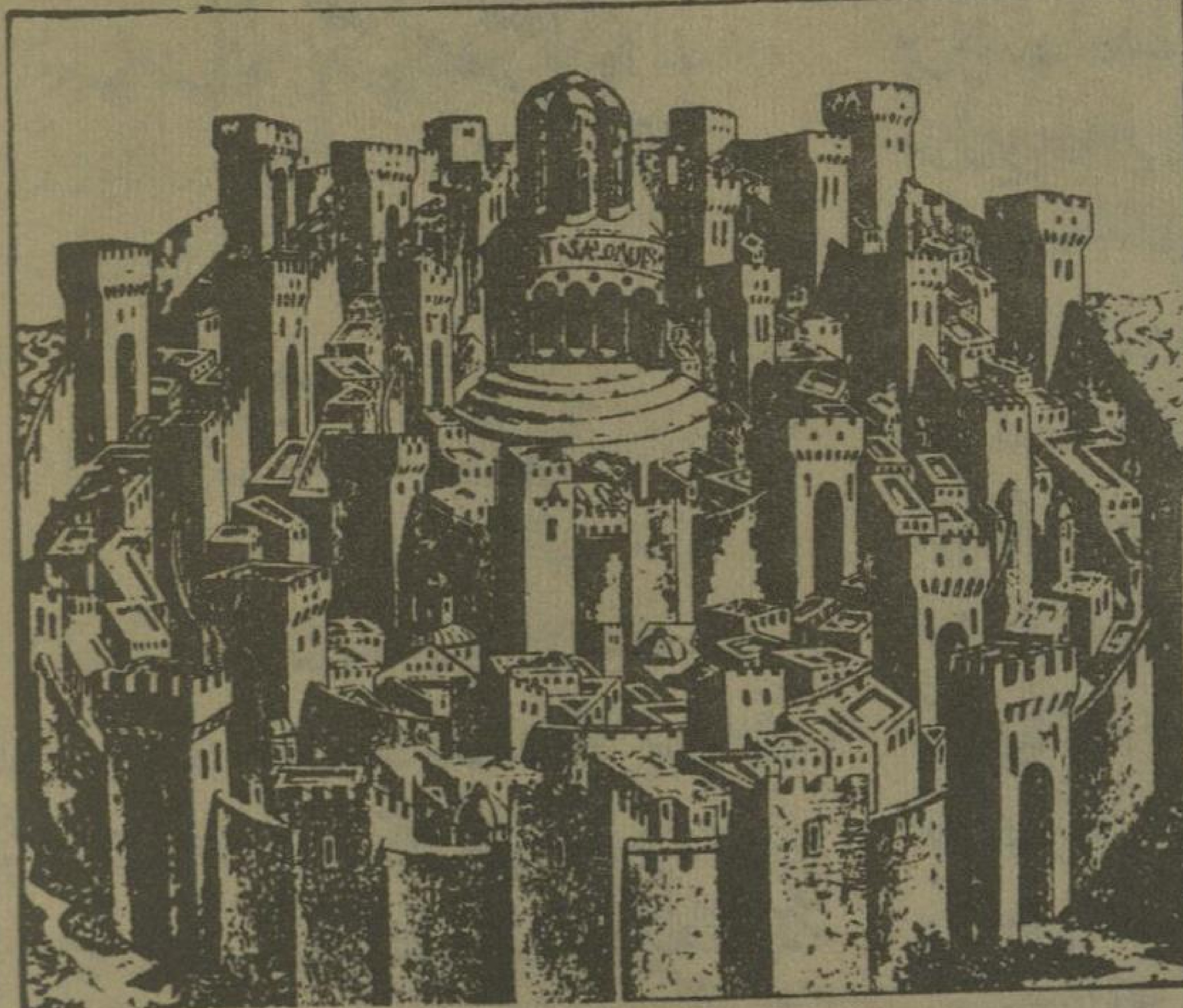
ہمت بلند ہو اور یقین کامل کہ جس مقصد کو لے کر اُٹھے ہیں وہ ہر لحاظ سے درست ہے تو معمولی سامان سے بھی بڑی بڑی طاقتوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ عرب خدا کا پیغام لے کر اُٹھے تھے تو ان سے بڑھ کر بے سرو سامان کوئی قوم نہ تھی۔ شروع ہی میں انھیں دُنیا کی دو بڑی شاہنشاہیوں سے مقابلہ پیش آیا تھا۔ ایک رُومی شاہنشاہی اور دُوسری ساسانی شاہنشاہی عربوں نے بے سامانی کے باوجود ان دو شاہنشاہیوں کو اس طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا، گویا وہ مٹی کے بُت تھے۔

عربوں اور ساسانیوں کے درمیان پہلی بڑی لڑائی قادسیہ کے میدان میں ہوئی۔ (۱۶ھ / ۶۳۷ء) اسی نے ساسانی سلطنت کی کی قسمت پر قضا و قدر کی آخری مہر لگا دی۔ یہ لڑائی چار دن جاری رہی۔ ساسانیوں کو اپنے جنگی ہاتھیوں پر بڑا بھروسا تھا۔ ہاتھی آگے بڑھتے تھے تو عربوں کے گھوڑے ان متحرک چٹانوں کو دیکھ کر بدکتے اور پیچھے کی طرف بھاگ نکلتے تھے۔ عربی لشکر کے سپہ سالار کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہاتھیوں کی بلا سے نجات نہ ہو گی کامیابی کی کوئی اُمید نہ رکھنی چاہیے۔ چنانچہ اس نے من چلے جوانوں کی ایک جماعت کے ذمے یہ کام لگا دیا کہ ہاتھیوں کی آنکھوں میں نیزے ماریں اور ان کی سُونڈیں کاٹ دیں۔ یہ جوان گھوڑوں سے اُتر کر ہاتھیوں پر پل پڑے۔ اُنھوں نے تاک تاک کر ہاتھیوں کی آنکھوں میں نیزے مارے اور ساتھ ہی چابک دستی سے ان کی سُونڈیں اُڑا دیں۔ ہاتھی چنگھاڑتے ہوئے پیچھے کی طرف بھاگے اور ساسانی لشکر کو روندتے ہوئے نکل گئے۔

ساسانی سپہ سالار نے اپنی سپاہ کو للکار کر کہا "دیکھو تمھارے دشمن کتنی جانبازی دکھا رہے ہیں، حالانکہ وہ ایک بھوکی ننگی قوم کے سپاہی ہیں اور ان کو بہادری کا کوئی صلہ ملنے کی اُمید نہیں۔ تم ایک عظیم الشان سلطنت کے سپاہی ہو۔ تمھارے بادشاہ نے سونے چاندی سے لدے ہوئے خچر بھیج دیے ہیں۔ تم میں سے جو شخص بہادری دکھائے گا، اسے مالا مال کر دیا جائے گا۔" لیکن یہ للکار بے سُود رہی۔ انعام اور عہدے کا لالچ ان لوگوں کے مقابلے میں کیا کام دے سکتا تھا جن کی تلواریں صرف حق اور انصاف کی خاطر بلند ہوئی تھیں؟ جو دُنیا کی ہر شے کو ٹھکرا چکے تھے اور خدا کی راہ میں موت اُنھیں زندگی سے بڑھ کر عزیز تھی۔

ساسانیوں نے رات کے وقت چھاپا مارنے کی تیاری کی۔ عربوں نے اُونٹوں کی ایک قطار تیار کی جن پر خشک گھاس کے گٹھے مضبوط باندھ کر لاد دیے پھر ان گٹھوں کو آگ لگا کر اونٹوں کو ساسانی لشکر کی طرف دوڑا دیا۔ آگ کی اس دیوار نے جدھر کا رُخ کیا ساسانیوں کے گھوڑے باگیں تڑا تڑا کر بھاگ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سارا ساسانی لشکر ریت کے ذروں کی طرح بکھر گیا۔

اس شکست کے بعد ساسانی کہیں بھی نہ ٹھہر سکے۔ چند سال میں پوری ساسانی سلطنت عربوں کے قبضے میں آگئی اور اسلامی فتوحات کا سیل ہند و چین کی جانب پھیلنے لگا اور دُوسری طرف اس کی لہریں اوقیانوس تک پہنچ گئیں۔



بیتُ المقدس اسلامی خلافت کی پناہ میں آتا ہے

"خُدا نے ہمیں جو عزت دی ہے، وہ اسلام کی وجہ سے ہے اور ہمارے لیے یہی کافی ہے۔" یہ الفاظ حضرت عمر فاروقؓ نے اس وقت فرمائے جب بیتُ المقدس کے سفر میں عرب سوار ان کی سواری کے لیے ترکی گھوڑا اور پہننے کے لیے عمدہ قیمتی پوشاک لائے تھے۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ انسان کا رُعب داب اور جلال و شکوہ، زرق برق لباس یا اچھی سواری پر موقوف ہے۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک انسان کی ساری عظمت اس کی عمدہ سیرت اور اچھے اخلاق میں اور اس بات میں تھی کہ پُوری زندگی خدا کی رضا کے مطابق بسر کی جائے اور اس کے بندوں کی خدمت کا حق ادا کیا جائے۔

عرب فوجیں شام اور فلسطین کے اکثر شہر فتح کر چکی تھیں اور وہ بیت المقدس کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں۔ محصورین کو جب باہر سے کسی امداد کی اُمید باقی نہ رہی تو انھوں نے صلح کی درخواست کی، لیکن شرط یہ لگائی کہ خلیفہ خود آئیں اور ان کے ہاتھ سے عہد نامۂ صلح لکھا جائے۔

حضرت ابو عبیدہؓ عرب فوجوں کے سالارِ اعظم تھے۔ اُنھوں نے بیت المقدس والوں کی شرط کے متعلّق دربارِ خلافت میں اطلاع دی تو حضرت عمرؓ صحابہ کے مشورے سے رجب ۱۶ھ (اگست ۶۳۷ء) میں مدینہ منوّرہ سے روانہ ہُوئے۔ جانتے ہو اس فرمانروا کا سامانِ سفر کیا تھا، جس کی فوجیں ساسانی و رُومی شاہنشاہوں کو ہر میدان میں شکست دے چُکی تھیں؟ نہ نقارہ و نوبت، نہ لاؤ لشکر نہ خیمہ و خرگاہ۔ سواری میں ایک گھوڑا تھا اور چند مہاجرین و انصار ہمراہ تھے۔ سفر کا پُورا سامان جس میں رسد بھی شامل تھی، ایک اُونٹ پر لدا ہُوا تھا۔

یرموک کے شمال میں جابیہ ایک مقام تھا، سالاروں نے وہاں پہنچ کر ملاقات کی اور تمام حالات سُنائے۔ وہیں بیت المقدس کے نمائندوں سے صلح کی شرطیں طے ہوئیں۔ عہد نامے پر دستخط ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے بیتُ المقدس کا قصد کیا۔ آپ کی

سواری میں جو گھوڑا تھا اس کے سُم گھِس کر خراب ہو گئے تھے اور وہ رُک رُک کر چلتا تھا۔ سواری کے لیے دُوسرا گھوڑا پیش کیا گیا جو شوخ اور چالاک تھا۔ وہ کلیلیں کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ یہ کہتے ہُوئے اُتر پڑے کہ کم بخت یہ غرور کی چال تو نے کہاں سے سیکھی اور پیادہ پا چل پڑے۔ بیت المقدس میں وہ تمام مقامات دیکھے جو مقدس مانے جاتے تھے۔ عیسائیوں کا بڑا گرجا بھی دیکھا۔ نماز کا وقت آیا تو عیسائی کہنے لگے کہ آپ گرجے میں نماز ادا کرلیں، مگر حضرت عمرؓ نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ مبادا مسلمان میرے اس عمل کو حجّت بنا کر کل گرجوں میں نمازیں ادا کرنے لگیں۔

بیت المقدس کے باشندوں کو جو عہد نامہ لکھ کر دیا تھا وہ اس لیے یہاں درج کیا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کی یہ ایک نہایت اہم تاریخی دستاویز ہے۔

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے بندے امیر المومنین عمرؓ نے ایلیا کے لوگوں کو دی۔ یہ امان جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام ہم مذہبوں کے لیے ہے۔ نہ ان کے گرجوں میں سکونت کی جائے گی، نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کے احاطوں کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔ نہ ان کی صلیبوں اور مالوں میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر ہرگز جبر نہ کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو گزند پہنچایا جائے گا۔ ایلیا والوں کا فرض ہے کہ وہ دُوسرے شہروں کے باشندوں کی طرح جزیہ دیں اور رُومیوں کو نکال دیں۔ رُومیوں میں سے جو شخص نکل جائے گا، اس کی جان اور مال کو امن ہے، تا آنکہ وہ اپنی جائے پناہ میں پہنچ جائے۔ جو رُومی ایلیا میں رہنا اختیار کرے، اُسے بھی امن ہے، البتہ اسے جزیہ دینا ہوگا ایلیا والوں میں سے جو لوگ اپنے مال لے کر رُومیوں کے ساتھ چلے جانا چاہیں تو انھیں اور ان کے گرجاؤں اور صلیبوں کو بھی امان ہے تا آنکہ وہ جائے پناہ میں پہنچ جائیں۔ جو کچھ اس عہد نامے میں لکھا ہے، اس پر اللہ، اس کے رسُول، خلفاؑ اور تمام مسلمانوں کی ذمّہ داری ہے۔"

قیصر شام سے رخصت ہوتا ہے

"الوداع اے شام! تو کتنا اچھا ملک ہے، جسے دشمن کے حوالے کرنا پڑا۔" یہ الفاظ مشرقی رُومی سلطنت کے شہنشاہ نے اس وقت کہے تھے، جب یرموک کی لڑائی میں اسے شکست فاش ہو چکی تھی اور اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ کم از کم شام کا علاقہ ضرور چھوڑنا پڑیگا۔

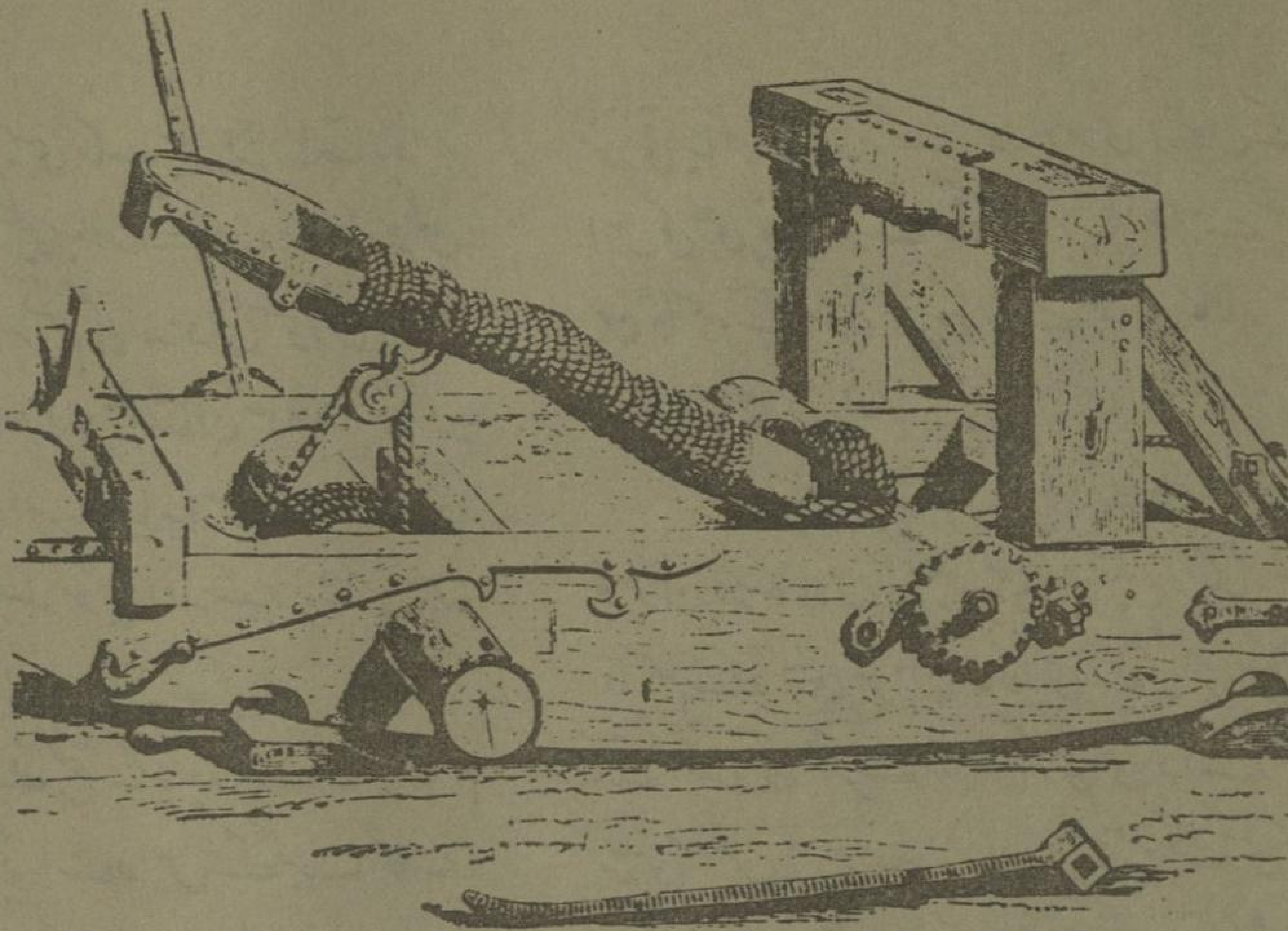
جنگ یرموک دُنیا کی چند فیصلہ کُن لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ عربوں کے عروج اور رُومیوں کے زوال میں اسے سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ عرب دمشق کو فتح کر لینے کے بعد تیزی سے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اس اثنا میں رُومی شاہنشاہ نے فوجیں جمع کرنے کے لیے عام حکم دے دیا اور تھوڑی ہی دیر میں فوجوں کا طوفان اُمنڈ آیا جن کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان کے مقابلے میں عرب تیس پینتیس ہزار ہوں گے اور وہ بھی مختلف محاذوں پر بکھرے ہُوئے۔ اس حالت میں دانشمندی کا تقاضا یہی تھا کہ تمام سالاروں کو پیچھے ہٹ کر ایک موزوں مقام پر جمع ہو جانے کا حکم دیا جائے، تاکہ وہ متحد ہو کر لڑ سکیں اور دشمن کے علاقوں میں جا بجا محصُور نہ ہو جائیں۔ اس غرض سے دریائے یرموک کا کنارا مناسب سمجھا گیا۔ یہ دریا اُردن کی پہاڑیوں سے نکل کر بحیرۂ طبریہ کے نیچے دریائے اُردن میں مل جاتا ہے اور آج کل اُردن میں واقع ہے۔

عربوں نے جن جن مفتوحہ علاقوں سے خراج کی رقم وصُول کی تھی اور وہ کئی لاکھ کی تھی، پُوری کی پُوری مقامی لوگوں کو اس لیے واپس کر دی کہ وہ حفاظت کی غرض سے لی گئی تھی اور اب عرب جنگی حالات سے مجبور ہو کر پیچھے ہٹ رہے تھے اور حفاظت کا فرض انجام نہ دے سکتے تھے۔ اس واقعے کا اثر اہل شام پر یہ ہُوا کہ وہ لوگ رو رہے تھے اور عربوں کی فتح کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایک شہر کے یہودیوں نے تو توریت پر حلف اُٹھایا کہ جب تک ہم زندہ ہیں رُومی ہمارے شہر پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ یہ فیصلہ کن معرکہ قادسیہ سے ایک سال پہلے ۱۵ھ/۶۳۶ء میں لڑا گیا۔

عربوں کی فوج اگرچہ کم تھی، مگر رومیوں کو ان کی جانبازی کا پُورا اندازہ تھا۔ اس لیے اُنھوں نے کوشش کی کہ عرب صلح پر راضی ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت خالدؓ کے سامنے تجویز پیش کی کہ سپہ سالار کو دس ہزار دینار، افسروں کو ایک ایک ہزار دینار، اور سپاہیوں کو ایک ایک سو دینار دیئے جائیں گے، عرب واپس چلے جائیں۔ حضرت خالدؓ نے انکار کر دیا اور کہا جو شخص اسلام قبول کر لے وہ ہمارا بھائی ہے۔ اگر یہ منظور نہ ہو تو جزیہ دینے کا اقرار کرو تو ہم حمایت و حفاظت کا ذمّہ لیتے ہیں۔ یہ بھی منظور نہ ہو تو لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔

رُومی فوج بہت زیادہ تھی اور جوش کا یہ عالم تھا کہ تیس ہزار آدمیوں نے پاؤں میں بیڑیاں پہن لی تھیں، تاکہ ہٹنا چاہیں بھی تو ہٹ نہ سکیں۔ لڑائی بڑی سخت ہوئی۔ کئی مرتبہ عربوں کے مختلف دستوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ آخرکار رومی ستّر ہزار جانوں کا نقصان اُٹھا کر بھاگ نکلے۔ عربوں میں سے صرف تین ہزار شہید ہوئے۔

اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں شام کے تمام شہر عربوں کے قبضے میں آ گئے اور رومی ہمیشہ کے لیے وہاں سے رُخصت ہو گئے۔ اتنے تھوڑے عرصے میں شام و فلسطین جیسے اہم علاقوں کی تسخیر نے دُنیا بھر میں عربوں کی دھاک بٹھا دی اور وہ وہ بھی پُورے اعتماد سے اپنی تقدیر کی شاہراہ پر گامزن ہو گئے۔



سندھ میں اسلام کا پہلا قدم پہنچتا ہے

"تمھیں اپنی فوج، سازوسامان اور ہاتھیوں پر ناز ہوگا مگر ہمارا بھروسہ صرف خدا پر ہے۔ ہار جیت اسی کے ہاتھ میں ہے۔" یہ اس خط کا ایک حصّہ ہے جو نوجوان سپہ سالار محمدّ بن قاسم نے سندھ کے راجا داہر کو بھیجا۔ یہی محمدّ بن قاسم تھا جسے ۹۱ھ / ۷۱۰ء میں پانچ ہزار بہادروں کے ساتھ اس غرض سے سندھ بھیجا گیا تھا کہ داہر کو مسلمانوں کے جہازوں پر حملہ کرنے کی سزا دے اور جن نہتّے لوگوں کو قید کر رکھا ہے اُنھیں رہائی دلائے۔ اِس وقت محمدّ بن قاسم کی عمر ستّرہ (۱۷) سال سے زیادہ نہ تھی۔

نوجوان سپہ سالار نے سندھ پہنچتے ہی سب سے پہلے دیبل کو فتح کیا، جہاں جہازوں پر حملہ ہوا تھا اور قیدیوں کو چھُڑایا۔ پھر تھوڑے ہی عرصے میں دریائے سندھ کے مغرب کا پُورا علاقہ مسخّر کر لیا۔ راجا داہر کی فوج دریا کے مشرقی جانب بالکل صحیح و سالم موجود تھی اور اس کی موجودگی میں دریا کو عبُور کرنا آسان کام نہ تھا۔ محمد بن قاسم نے مغربی کنارے پر دریا کے پاٹ کے برابر کشتیاں جمع کیں اور انھیں لمبائی میں ایک دُوسرے کے ساتھ بندھوا دیا۔ پھر ان میں ایسے تیرانداز بٹھا دیئے جن کے نشانے کبھی خطا نہ ہوتے تھے۔ کشتیوں کے ایک سرے کو مضبوط رسّوں سے کنارے پر بندھوا دیا اور دوسرے سرے کو دریا میں دھکیل دیا۔ یہ پانی کے دھارے میں پہنچا تو خود بخود دُوسرے کنارے پر جالگا۔ اگلی کشتیوں کے تیرانداز بجلی کی سی تیزی سے اُترے اور کنارے پر مورچے بنا کر بیٹھ گئے۔ باقی لوگوں نے اگلے سرے کو دوسرے کنارے پر کس کر باندھ دیا۔ یُوں پُل بن گیا جس سے پُوری فوج صحیح سلامت دُوسرے کنارے پر اُتر گئی۔

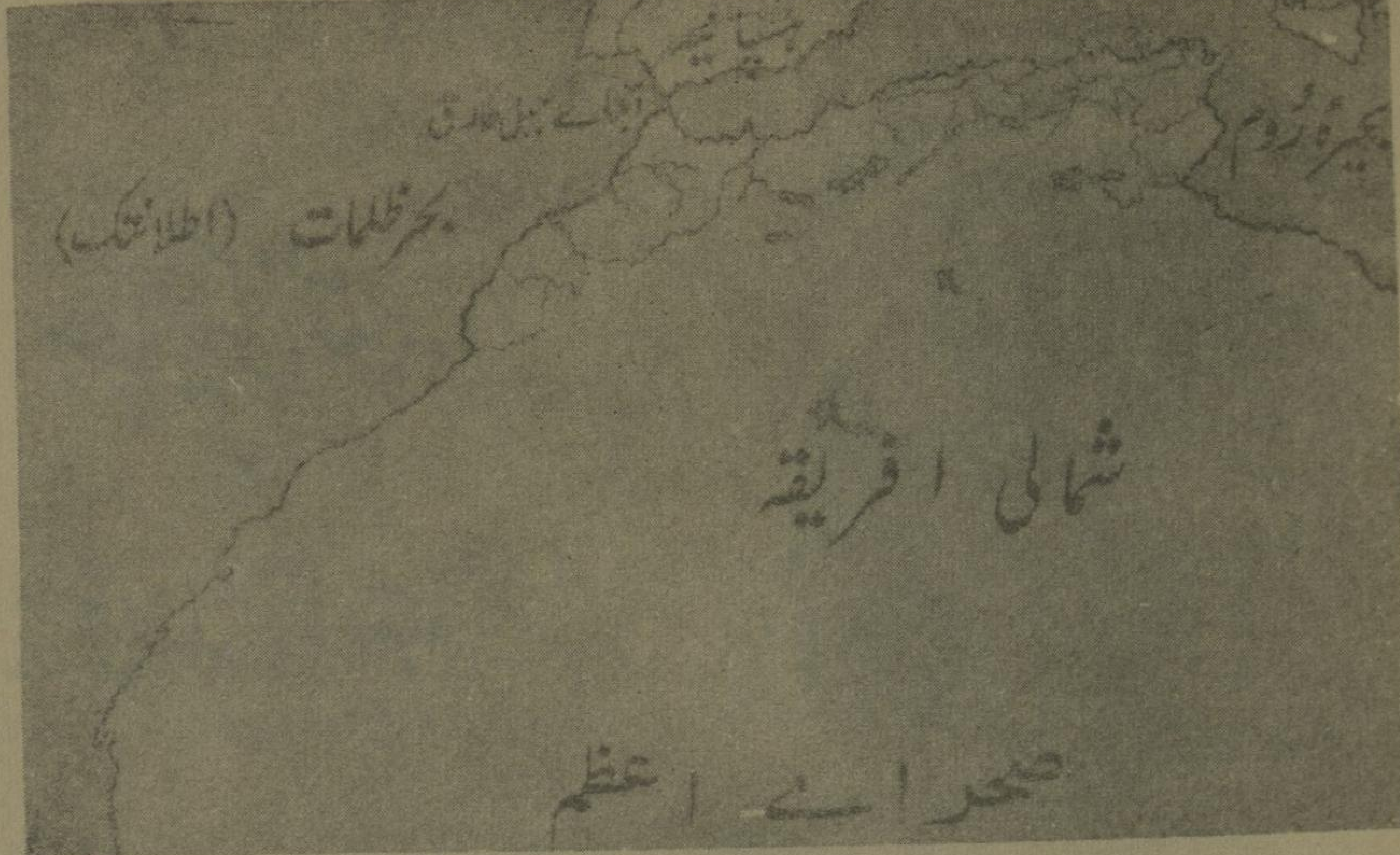
یہاں داہر اور محمد بن قاسم کے درمیان ایک فیصلہ کُن جنگ ہوئی جو دس روز جاری رہی۔ محمد بن قاسم کے ساتھ صرف بارہ ہزار فوج تھی اور وہ اپنے

مرکز سے بہت دُور اجنبی ملک میں لڑ رہا تھا۔ داہر کے ساتھ ساٹھ ہزار جنگجو بہادر تھے اور وہ اپنے وطن میں تھا، جہاں اسے ہر قسم کی امداد مل سکتی تھی۔ دسویں دن ۲۰ رجون ۷۱۲ء (۱۰ رمضان ۹۳ھ) کو غروب آفتاب کے وقت داہر مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سندھ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔

محمد بن قاسم نے فتح کے بعد ملک کا انتظام اس خُوبی سے کیا کہ پُورا سندھ اس کے گیت گانے لگا۔ پنڈتوں اور پروہتوں کو سرکاری خزانے سے جو رقمیں مندروں کی دیکھ بھال کے لیے ملتی تھیں، بدستور جاری رکھیں۔ عام محکمے سندھیوں ہی کے ہاتھ میں رہے، البتہ نگرانی کے لیے جا بجا مسلمان افسر مقرر کر دیے۔ غریب کسانوں کی حالت خراب تھی۔ جاٹوں کے ساتھ بُرا سلوک ہوتا تھا۔ اُنھیں جوتا پہننے یا زین ڈال کر گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت نہ تھی۔ محمد بن قاسم نے ایسے تمام قاعدے منسُوخ کر دیے جو مختلف طبقوں میں امتیاز پیدا کرتے تھے۔ سندھی اتنے خوش ہُوئے کہ ایک شہر کے لوگوں نے محمد بن قاسم کی مُورتی بنا کر مندر میں رکھ لی اور دوسری مورتیوں کے ساتھ اس کی بھی پُوجا کرنے لگے۔ یہ ایسا اعزاز ہے جو محمد بن قاسم کے سوا کسی دُوسرے مسلمان سالار کے حصّے میں نہیں آیا۔

غور فرمائیے کہ ہمارے زمانے کا سترہ سال کا نوجوان درسگاہوں کی تعلیم بھی مکمل نہیں کر سکتا۔ محمد بن قاسم نے اتنی عمر میں سالاری کے گُر بھی سیکھ لیے تھے، بلکہ اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ اسے تسخیرِ سندھ جیسی مشکل مہم پر بہ طور سالار بھیجتے وقت کسی کو تامل نہ ہُوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب کو یقین تھا کہ محمد بن قاسم اس مہم کی ذمّہ داری کے تقاضے بہتر سے بہتر طریق پر پُورے کر سکتا ہے۔ اس نے ملک اس تیزی اور جوانمردی سے مسخر کیا کہ بڑے بڑے سالاروں کے لیے بھی اس پر رشک کرنا بجا ہے۔ پھر ملک کا انتظام اس خُوبی سے کیا کہ اس کی مثالیں تاریخ میں آسانی سے نہیں مل سکتیں۔ اسے صرف تین چار سال کی مہلت ملی پھر سیاسی تغیرات کی وجہ سے معزول اور قید کر دیا گیا۔ جوانی ہی میں اس نے وفات پائی مگر ایسا نام چھوڑ گیا جو مسلمانوں کے لیے تیرہ سو سال سے باعثِ فخر اور دوسروں کے لیے ایک مثال چلا آتا ہے۔

نقشہ افریقہ



بحرِ ظلمات میں دَوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

"اے خدا! اگر سمندر بیچ میں نہ آجاتا اور زمین ختم نہ ہو جاتی تو میں برابر فتح کے پھریرے اُڑاتا اور تیری توحید کے نعرے بلند کرتا چلا جاتا۔" یہ الفاظ تھے جو عقبہ بن نافع نے اس وقت کہے جب وہ شمالی و مغربی افریقہ کو فتح کرتا ہوا اوقیانوس کے کنارے پر جا پہنچا اور اس نے بے اختیار گھوڑا سمندر میں ڈال دیا، لیکن مَوجوں نے آگے نہ بڑھنے دیا۔ یہی وہ سمندر تھا جسے پرانے زمانے میں غالباً اس لیے بحرِ ظلمات کہا جاتا تھا کہ کوئی نہ جانتا تھا کہ اس سمندر کے آگے کیا ہے۔ عقبہ بن نافع اسلام کے ابتدائی دَور کا نامور فاتح اور بڑا باتدبیر سپہ سالار تھا۔

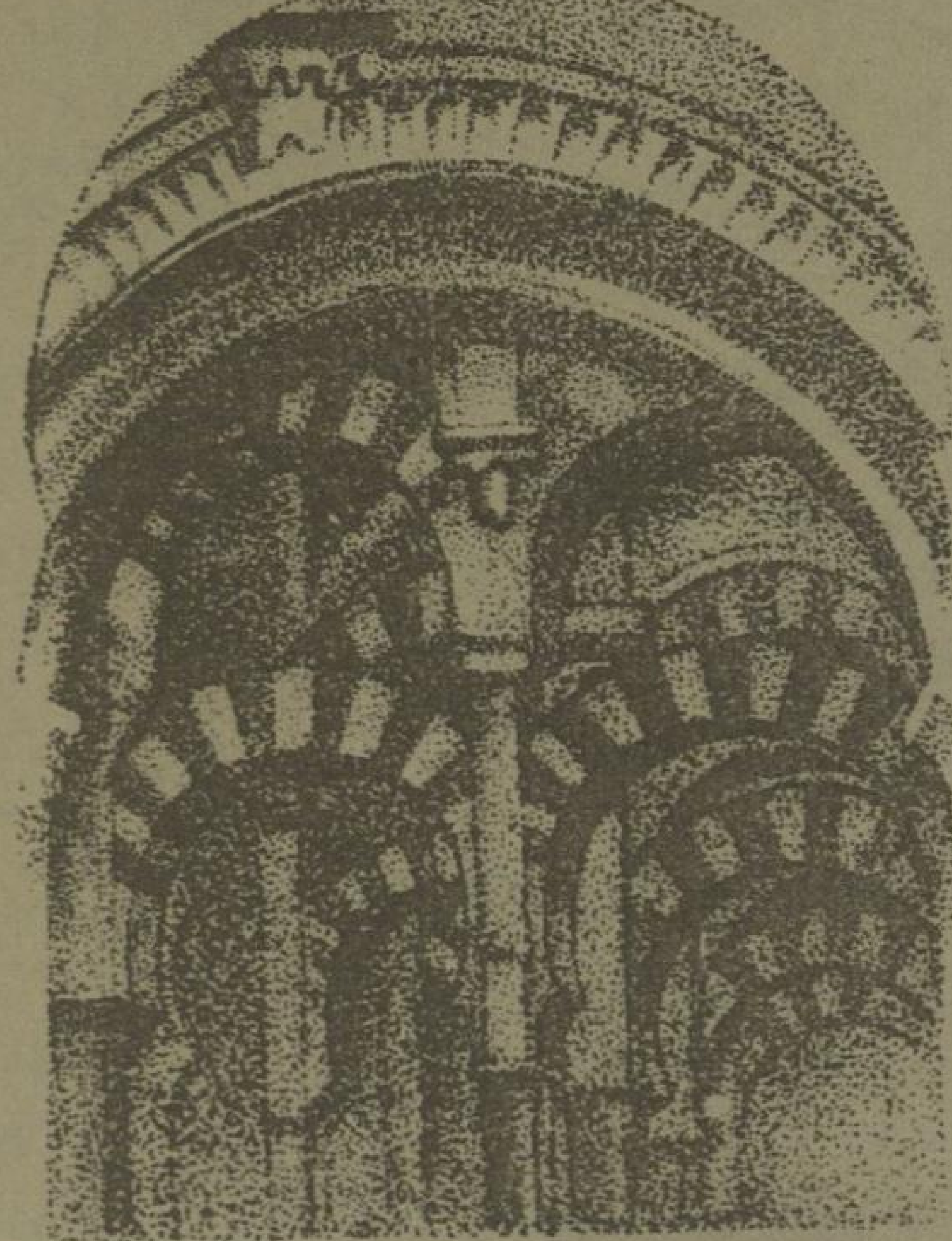
شمالی افریقہ میں مصر حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں فتح ہو چکا تھا۔ اس کے بعد عربوں نے لیبیا پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے آگے بربر آباد تھے جن کے ساتھ سخت لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ حضرت امیر معاویہؓ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو عقبہ کو منتخب کیا کہ وہ بربروں کا خرخشہ مٹا دے اور اسلامی حکومت کے مغربی حصّے میں امن و امان قائم کرے۔

عقبہ نے سب سے پہلے تونس میں ایک مناسب مقام تجویز کر کے ایک چھاؤنی قائم کر دی، اسے فوجی مرکز بنا کر آگے قدم بڑھانا تھا۔ بعد میں وہاں وہ شہر آباد ہوا، جس نے قیروان کے نام سے عالمگیر شہرت پائی۔ عقبہ نے نئے مرکز سے پیش قدمی شروع کی تو بربر کہیں مقابلہ نہ کر سکے۔ عقبہ شہروں پر شہر فتح کرتا ہوا شمالی افریقہ کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ وہیں اس نے وہ الفاظ کہے تھے جن سے تاریخ کا ایوان ہمیشہ گونجتا رہے گا۔ علّامہ اقبالؒ نے "شکوے" میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ؎

"دشت تو دشت ہیں، صحرا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دَوڑا دیئے گھوڑے ہم نے"

۶۸۳/۵۶۵ء میں بربروں کے ایک سردار نے جو بظاہر مسلمان ہو چکا تھا، دھوکے سے عقبہ کو الجزائر کے مشہور مقام بسکرہ میں شہید کرا دیا، مگر اس نے نوکِ شمشیر سے جن خطّوں پر نقش کھینچے تھے، وہ ہمیشہ کے لیے دُنیائے اسلام کے اجزا بن گئے۔ عقبہ کا مشہد ابھی تک شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی قومی زیارت گاہ ہے۔

ہسپانیہ کی تقدیر
کا
فیصلہ ہوتا ہے



۲۴ جولائی ۷۱۱ء (۳ شوال ۹۲ھ) کو ہسپانیہ میں دریائے برباط کے کنارے جولڑائی ہوئی اس میں ایک طرف گیارہ بارہ ہزار اسلامی فوج تھی جس کا سالار طارق ابن زیاد تھا، دُوسری طرف ہسپانیہ کا بادشاہ راڈرک تھا، جس کی فوج دُگنی سے کم نہ تھی لیکن راڈرک نے شکست کھائی اور مارا گیا۔ ہسپانیہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا، جہاں اُنھوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ یہی حکومت تھی جس نے صدیوں تک یورپ میں علم و حکمت اور تہذیب و دانش کا چراغ روشن رکھا۔ اسی چراغ کی لَو سے یورپ کے اندھیرے میں اُجالے کا سامان ہوا۔

مسلمان شمالی افریقہ پر قابض ہو چکے تھے اور ہسپانیہ ان کے سامنے تھا۔ وہاں ایک طرف تاج و تخت کے جھگڑے شروع تھے، دُوسری طرف راڈرک کے ظلم و جَور نے عوام کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ لوگ بار بار مسلمانوں سے امداد کی درخواستیں کر رہے تھے۔ آخر شمالی افریقہ کے حاکم نے طارق ابن زیاد کو بارہ ہزار فوج دے کر ہسپانیہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ اس کے پاس صرف چند جہاز تھے۔ جب پوری سپاہ اس مقام پر اُتر گئی جو بعد میں طارق کے نام پر جبل طارق مشہور ہُوا تو اس نے جہازوں کو جلوا دیا۔

جب پُوچھا گیا کہ ایسا کیوں کیا اور شریعت میں ترکِ اسباب کب جائز ہے! تو طارق نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا کہ ہر ملک ہمارا ہے، اس لیے کہ ہمارے خُدا کا ہے۔

برباط کے کنارے دو دن فریقین لڑتے رہے، مگر کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ تیسرے دن نماز کے بعد طارق نے ایک ولولہ افروز تقریر کی اور کہا: بھائیو! تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ اپنی حالت کا اندازہ کرو، طاقتور دشمن سے مقابلہ ہے جو طوفانی سمندر کی لہروں کی طرح تمھیں گھیر سکتا ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کا سامانِ جنگ موجود ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں بھی کم نہیں۔ تمھارے پاس تلواروں اور نیزوں کے سوا کیا ہے؟ لیکن یقین رکھو کہ فتح ہماری ہے۔ یہ لوگ ہماری تلواروں کی کاٹ کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے۔ خدا کے حکموں پر چلو گے اور دین کا جھنڈا اس سرزمین میں گاڑ دو گے تو خدا کی بارگاہ سے تمھیں بہت بڑا انعام ملے گا۔ خدا تعالٰی تمھیں دُنیا اور آخرت میں سُرخروئی بخشے گا۔

پھر خود سب سے پہلے آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ اسی روز جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی مُدت میں پُورا ہسپانیہ مسلمانوں کے زیرِ نگین آ گیا۔

بے وطن شہزادہ سلطنت قائم کرتا ہے

عربوں کے ہاتھوں ہسپانیہ کی تسخیر کا آغاز ۹۲ھ/۷۱۱ء میں ہوا، لیکن وہاں عربوں کی مستقل سلطنت کا سنگِ بنیاد عبدالرحمٰن نے ۱۳۸ھ/۷۵۶ء میں رکھا۔ وہ دمشق کے اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا پوتا تھا۔

عبدالرحمان پانچ برس کا تھا جب اس کے باپ معاویہ نے وفات پائی۔ دادا نے یتیم پوتے کو محبّت اور ناز و نعمت سے پالا۔ چونکہ اُسے ولی عہد بنانا چاہتا تھا، اس لیے بڑی اعلیٰ تعلیم دلائی۔ وہ بیس برس کا ہوا تو خاندان کے اقبال کا سُورج ڈوب گیا۔ حکومت عبّاسیوں کے قبضے میں چلی گئی۔ اموی خاندان کے بہت سے لوگ مارے گئے۔ عبدالرحمٰن جان بچا کر شام سے نکلا اور سخت مصائب و خطرات جھیل کر مراکش پہنچا۔ کوئی سامان پاس نہ تھا۔ ایک وفادار غلام کے سوا کوئی آدمی ساتھ نہ تھا، لیکن جوانمردی اور عالی ہمّتی کا یہ عالم تھا کہ نظر تاج و تخت کے سوا کسی چیز پر نہ جمتی تھی۔

ایک معمولی کشتی میں سوار ہو کر مراکش سے ہسپانیہ پہنچا۔ وہاں کچھ لوگ اُموی خاندان کے اس شہزادے کا نام سُن کر ساتھ ہو گئے۔ لیکن قرطبہ کے حاکم نے مقابلے کی ٹھانی۔ عبدالرحمان نے بے سروسامانی کے باوجود اسے شکست دی۔ پھر سارے اسلامی علاقوں کو ایک مرکز کے ماتحت لا کر اس بادشاہی کی بنیاد رکھی جو ساڑھے تین سو سال تک قائم رہی۔ یورپ اس کی ہیبت سے لرزتا تھا۔ اس اموی عہد میں جو عمارتیں بنیں اُن کی نظیر کوئی دُوسرا ملک آج تک پیش نہ کر سکا۔ ان میں سے صرف ایک مسجد باقی ہے۔ اگرچہ اس کی پُرانی شان و شوکت ماند پڑ چکی ہے، تاہم اب بھی وہ دُنیا کی عبادت گاہوں میں یگانہ مانی جاتی ہے۔

عبدالرحمٰن کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ باپ دادا کی سلطنت چھن گئی، کوئی بھی قابلِ ذکر چیز پاس نہ رہی، بمشکل جان بچا کر وطن سے نکلا اور بے سروسامانی کے باوجود نئی سلطنت کا مالک بن گیا، لیکن اس کی سیرت کا جو پہلو خاص توجّہ کا مستحق ہے، یہ ہے کہ بہت بڑی سلطنت کا فرمانروا ہوتے ہوئے بھی اُس نے عربی سادگی اور بے تکلفی قائم رکھی۔ ہمیشہ سفید لباس پہنتا اور سفید عمامہ باندھتا۔ شہر میں جن لوگوں کے بیمار ہونے کی خبر مل جاتی، وہ امیر ہوتے یا غریب، سب کی مزاج پُرسی کے لیے ان کے گھروں میں جاتا۔ ہر جنازے کی نماز آپ پڑھاتا اور ہر میّت کو دفن کرنے میں شریک ہوتا۔ جو شخص بھی ملاقات کے لیے آ جاتا، اس سے بے تکلف ملتا۔ ہر شکایت پر خود توجّہ کرتا اور انصاف کے تقاضے پُورے کرنے میں بڑے، چھوٹے یا طاقتور اور کمزور میں امتیاز کو روا نہ رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ سوار ہو کر باہر جا رہا تھا۔ ایک شخص نے اس کے گھوڑے کی باگ تھام کر روک لیا اور کہا کہ جب تک میرا انصاف نہ کرو گے، ہلنے نہ دوں گا۔ عبدالرحمٰن نے فوراً قاضی کو بُلوایا اور کھڑے کھڑے اپنے سامنے فریادی کا فیصلہ کروایا۔

ایک مظلوم خاتون کی فریاد سُنی جاتی ہے

ہارون الرشید کے بیٹے معتصم باللہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ (۲۱۸۔ ۲۲۸ھ = ۸۳۳۔ ۸۴۲ء) جسے عباسی خاندان کے عہدِ شباب کا آخری بڑا تاجدار مانا جاتا ہے۔ عبّاسی خلافت اور مشرقی رومی سلطنت کی حدیں ایشیائے کوچک میں ملتی تھیں۔ دونوں حکومتوں نے سرحدوں پر مضبوط قلعے تعمیر کر رکھے تھے اور ان کے درمیان وقتاً فوقتاً لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

عبّاسیوں کے زمانے میں جو فتنے بپا ہوئے، ان میں سے بابک خرّمی کا فتنہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس نے بیس سال میں کم و بیش ایک لاکھ پچپن ہزار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ معتصم نے بڑی سختی سے اس کی گوشمالی کی۔ جب اُسے بچاؤ کی کوئی صُورت نظر نہ آئی تو اپنے اُوپر خلافت کے لشکروں کا دباؤ کم کرنے کے لیے مشرقی رُومی سلطنت کے قیصر کو کہلا بھیجا کہ تمام فوجیں میرے مقابلے پر آئی ہوئی ہیں۔ اس وقت حملہ کرو گے تو علاقوں پر علاقے فتح کرتے ہوئے بغداد پہنچ جاؤ گے۔ قیصر نے فوراً حملہ کر دیا، لیکن اس اثنا میں بابک مارا گیا۔ اس کا فتنہ مٹ گیا اور عبّاسی فوجیں اس کی طرف سے مطمئن ہو گئیں۔

معتصم دربار میں بیٹھا تھا، کہ اُسے قیصر کے حملے کی خبر ملی۔ خبر دینے والے نے یہ بھی بتایا کہ دو اہم سرحدی قلعے قیصر کے قبضے میں جا چکے ہیں۔ معتصم کی پیشانی پر غیظ و غضب سے شکنیں پڑ گئیں، لیکن وہ چُپ چاپ بیٹھا ہوا سب کچھ سُنتا رہا۔ یکایک اس کے کان میں یہ الفاظ پہنچے کہ قیدیوں میں ایک ہاشمی خاتون بھی تھی۔ قیصر کے سپاہی اسے کشاں کشاں لے جا رہے تھے تو وہ بیچارگی کی حالت میں خلیفہ کو امداد کے لیے پکار رہی تھی۔ معتصم کی زبان پر ایک دم لبّیک (میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں) کے الفاظ جاری ہو گئے۔ فوراً تختِ خلافت سے اُترا اور گھوڑے پر سوار ہو کر کوچ کا نقّارہ بجوا دیا۔ فوج کا انتظار بھی نہ کیا اور جوش و اضطراب کے پروں سے اُڑتا ہوا اس مقام کی طرف روانہ ہو گیا، جہاں ہاشمی خاتون کی گرفتاری کا واقعہ پیش آیا تھا۔ فوجی دستے راستے میں اُس کے ساتھ جا ملے۔

اُس نے تیز رَو سوار آگے بھیج دیئے کہ جہاں جہاں قیصر کے آدمیوں کو دیکھیں، مار بھگائیں اور لوگوں کو اطمینان دِلائیں۔ قیصر تمام علاقے کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ معتصم نے عموریہ کو فتح کیا جو قیصر کا خاص مرکز تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اِس نے اس طرح دُنیا پہ آشکارا کر دیا کہ سچّا فرمانروا وہی ہے جو رعایا کے معمولی فرد کی پکار بھی دل کے کانوں سے سُنتا ہے۔



جلاوطن مالکِ مُلک بنتے ہیں

ہسپانیہ میں عبدالرحمان اوّل نے بنواُمیّہ کی حکمرانی کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ عبدالرحمان کے پوتے الحکم (۱۸۰۔ ۲۰۷ھ = ۷۹۶-۸۲۲ء) کے عہد حکومت میں قرطبہ کے اندر ایک خوفناک بغاوت کی آگ بھڑکی۔ باغیوں نے قصرِ شاہی پر ہلہ بول دیا۔ الحکم نے حسنِ تدبیر سے فوج جمع کی، بغاوت کو فرو کر دیا اور باغیوں کو حکم دے دیا کہ ہسپانیہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک جماعت مراکش پہنچ کر طنجہ اور فاس میں مقیم ہو گئی۔ باقی لوگوں نے، جن کی تعداد دس اور پندرہ ہزار کے درمیان بتائی جاتی ہے، جہازوں پر سوار ہو کر اسکندریہ کا رُخ کیا اور وہاں پہنچتے ہی شہر پر قبضہ کر لیا۔ وہ مصر میں کوئی ہنگامہ بپا کرنے کے خواہشمند نہ تھے۔ مصر اس زمانے میں عباسی خلافت کا ایک صُوبہ تھا اور مامونُ الرّشید تختِ خلافت پر متمکّن تھا۔ ان کی آرزو صرف یہ تھی کہ کوئی موزوں بحری مقام ہاتھ آجائے، جسے مرکز بنا کر وہ بحیرۂ روم کے ان جزیروں کو فتح کر سکیں، جو اس وقت تک رُومیوں اور یونانیوں کے قبضے میں تھے۔ اِنھی میں سے ایک جزیرہ کریٹ تھا جس کے بعض حصّوں میں ان جلاوطنوں نے عمل دخل کی صورت پیدا کر لی تھی۔

مامون الرّشید کیوں کر گوارا کر سکتا تھا کہ اس کے ایک بڑے بحری مرکز سکندریہ پر غیر لوگ قابض ہو جائیں۔ ان کے پاس کوئی خاص جنگی قوّت نہ تھی۔ اس نے اپنے مشہور سپہ سالار عبداللّٰہ بن طاہر کو مصر بھیجا اور اس نے جلاوطنوں کو سکندریہ چھوڑنے پر مجبُور کر دیا۔

اب ان لوگوں کے لیے خُدا پر بھروسا کرتے ہوئے لڑنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ اسکندریہ کو تو اُنھوں نے چھوڑ دیا، جو جہاز ہاتھ آئے انھیں لے کر سمندر میں نکل پڑے۔ ابوعمر حفص بن عیسیٰ ان کا سردار تھا۔ وہ سیدھے کریٹ پہنچے اور ایک ہی ہلّے میں رُومی فوج کو جزیرے سے بھگا دیا۔

وہاں جو حکومت قائم کی، وہ کم و بیش ایک سو سال تک کامیابی سے جاری رہی۔ عجیب بات یہ ہے کہ

اموی خلافت کے زمانے میں جب مسلمانوں نے پہلے پہل کریٹ پر حملہ کیا تو اُسے فتح نہ کر سکے تھے اور ان کی توجہ دُوسرے ملکوں کی طرف پھر گئی تھی، لیکن چند ہزار مسلمان جلاوطنوں نے نہ صرف اس جزیرے کو مسخر کر لیا، بلکہ وہاں پائدار اور کامیاب حکومت قائم کر لی۔

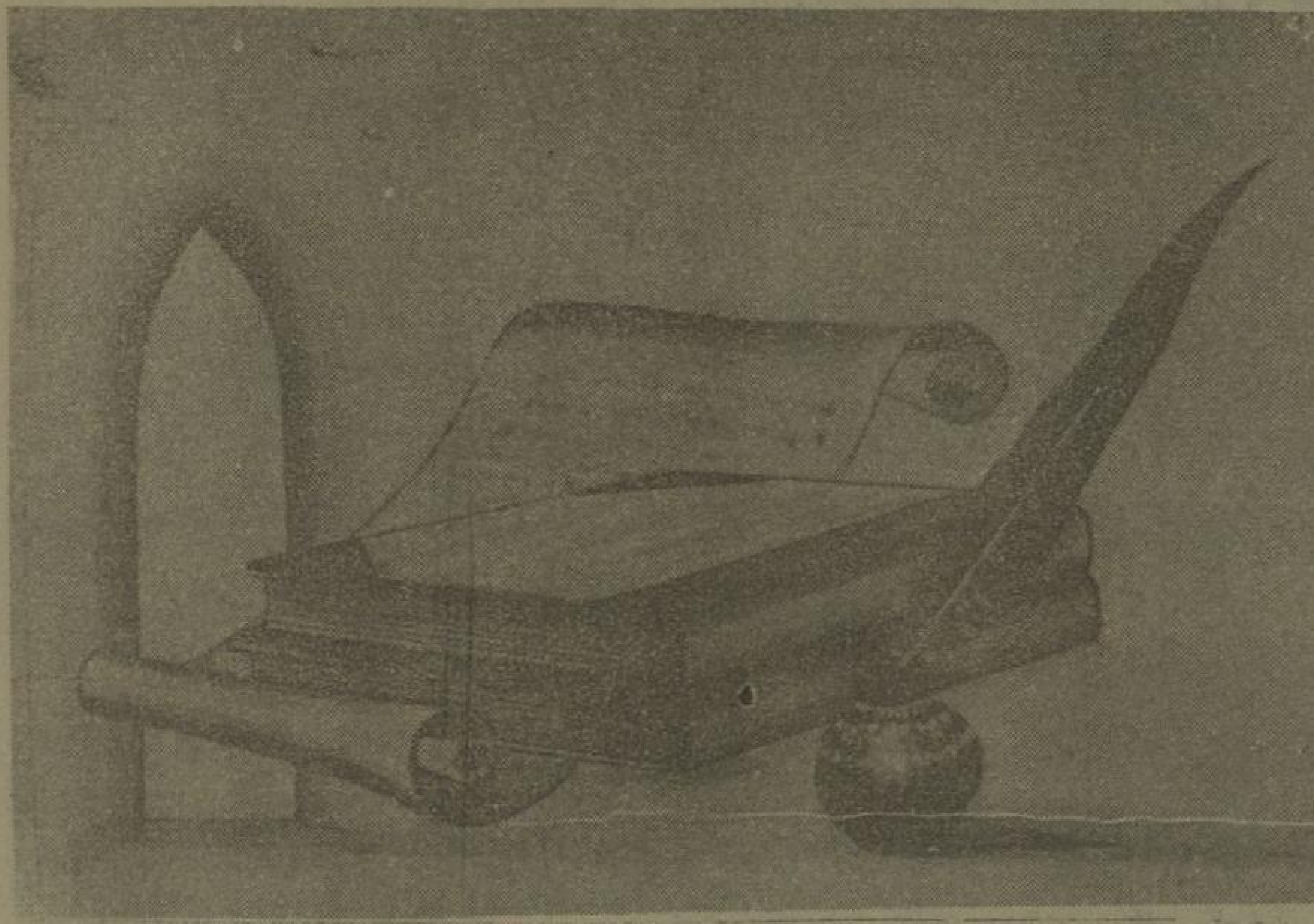
تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے کہ جو لوگ پہلے ہسپانیہ سے، پھر اسکندریہ سے جلاوطن ہوئے انھوں نے زورِ بازو سے ایک بہت بڑا جزیرہ فتح کر لیا۔ ابوحفص کریٹ پہنچا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"بتاؤ اب تمھارے لیے شکایت کا کون سا موقع ہے؟ میں تمھیں اس سرزمین میں لے آیا ہوں، جہاں دُودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ اسی کو اپنا وطن سمجھو، راحت و آسائش کی زندگی بسر کرو اور اپنے سابقہ وطن کو بالکل بھول جاؤ۔"

یہ مسلمان کریٹ کے ساحل پر جہاں اترے تھے، وہاں اپنی قیام گاہ کے اردگرد حفاظت کے لیے انھوں نے خندق کھود دی تھی۔ بعد میں اس مقام کا نام "الخندق" مشہور ہو گیا۔ اسی نام کو اہلِ یورپ نے بگاڑ کر 'کینڈیا' بنا دیا، جو کریٹ کا دُوسرا نام ہے۔

اسلامی تاریخ میں اس قسم کے حیرت انگیز واقعات کی کبھی کمی نہیں رہی۔ ایسے نادر واقعات بھی ملتے ہیں کہ مثلاً مسلمانوں نے ایک شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ محصورین نے ایک مرتبہ شہر کا دروازہ کھول کر مسلمانوں پر حملہ کیا۔ ایک جیش کا سالار مقابلے کے لیے آگے بڑھا اور محصورین کو شکست دے کر لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ ان کے پیچھے پیچھے خود بھی شہر کے اندر پہنچ گیا۔ وہ لڑائی میں اتنا محو تھا کہ بالکل خبر نہ ہو سکی کہ ساتھی باہر رہ گئے ہیں، لیکن اس صورتِ حال سے گھبرایا نہیں، تنہا شہر میں لڑتا رہا۔ ہر طرف سے اس پر تیروں اور پتھروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن جب تک زندگی نے ساتھ دیا، لڑائی نہ چھوڑی۔

جوانمردی کی اس یگانہ مثال نے ساتھیوں میں ایسا جوش پیدا کر دیا کہ وہ ہر خطرے سے بے پروا ہو کر شہر کے اندر داخل ہو گئے اور اسے فتح کر لیا۔



پُرانے علوم نئے سرے سے زِندہ ہوتے ہیں

نوعِ انسان کی ایک بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ مختلف زبانوں میں جو علمی کتابیں تصنیف ہوئیں، انھیں زمانے کی دستبُرد سے محفوظ کر دیا جائے اور ایسا بندوبست کر دیا جائے کہ آنے والی نسلیں ان سے فائدہ اُٹھاتی رہیں۔

اسلام دُنیا میں آیا تو قوموں کے درمیان تعصب اتنا بڑھا ہُوا تھا کہ کوئی کسی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا اور اپنے سوا ہر قوم کی ہر شے کو فنا کر دینا ہی سب سے بڑا کمال سمجھتا تھا، لیکن مسلمانوں نے اس تاریک زمانے میں بھی گزری ہوئی قوموں کے تمام علوم محفوظ کر دیئے۔ اگر یہ کام انجام نہ پاتا تو علم و تجربہ اور غور و فکر کا وہ پورا سرمایہ مٹ جاتا، جو پہلے لوگوں نے پیدا کیا تھا۔ حفاظت کے بعد مسلمانوں نے ان علوم کو ایسے انداز میں پھیلایا کہ ان میں زندگی کی نئی رُوح پیدا ہو گئی۔

سب سے پہلے ان کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہوئے جن کا تعلق علم ریاضی، ہندسہ، ہیئت، فلسفہ، کیمیا اور طب سے تھا۔ پھر اہل علم نے اپنے شوق سے اور حکومت نے دیگر علوم کی سرپرستی کرتے ہوئے تمام ضروری کتابوں کے ترجمے شروع کرا دیئے۔ اس غرض سے مفتوحہ علاقوں کے علم دوست لوگوں نے عربی میں مہارت حاصل کر لی۔

علوم کی سرپرستی میں عباسیوں کا درجہ سب سے بڑھا ہُوا ہے خصوصاً مامون الرشید کا نام تو اس سلسلے میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ترجمے کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کیا گیا تھا۔ مامون نے اسے بہت ترقی دی۔ تمام ملکوں میں آدمی بھیج کر اچھی اچھی کتابوں کے نسخے جمع کرائے۔ پھر قیصر کو لکھا کہ علوم و فنون کی جتنی یونانی کتابیں جمع ہو سکیں دارالخلافہ بغداد کو بھیج دی جائیں۔

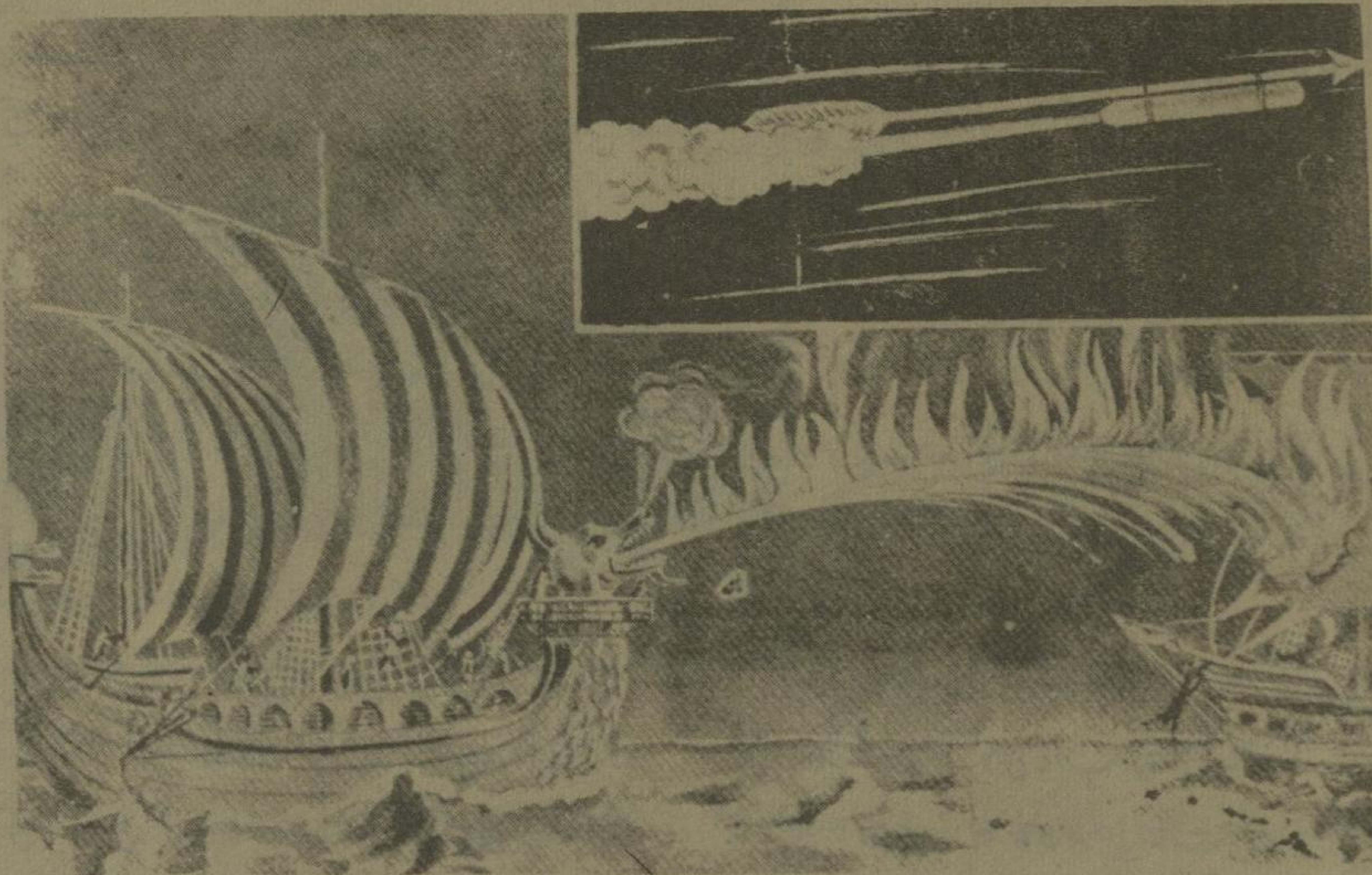
تمام مترجموں کے نام معلوم کرنے کا تو کوئی ذریعہ نہیں جو سیکڑوں سال اس محکمے میں کام کرتے رہے، صرف بعض لوگوں کے نام مختلف کتابوں میں درج ہوئے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تینتیس مترجم وہ تھے جو فارسی زبان کی کتابیں ترجمہ کرتے تھے۔ اسی طرح دس سُریانی زبان کے، پانچ سنسکرت زبان کے اور سینتالیس یونانی زبان کے مترجم تھے۔ اس زمانے کا کوئی علم نہ تھا جسے اُنھوں نے چھوڑا ہو۔ مشہور حکیموں، فلسفیوں اور طبیبوں

کی ایک ایک کتاب اور ایک ایک رسالہ فراہم کر کے اسے عربی کا لباس پہنا دیا گیا۔ اگر مسلمان یہ خدمت انجام نہ دیتے تو آج اکثر کے نام بھی کسی کو معلوم نہ ہو سکتے۔ پھر مسلمانوں نے خود مختلف علوم پر ایسی اعلیٰ کتابیں لکھیں کہ اہل یورپ نے ان کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ بو علی سینا کی کتاب "قانون" کا لاطینی ترجمہ پانسو سال تک یورپ کی طبّی یونیورسٹیوں میں بطور نصاب پڑھایا جاتا رہا۔

بعض اہم کتابوں پر شرحیں لکھیں۔ اکثر قدیم یونانی علماء مشکل زبان میں لکھتے تھے۔ اس وجہ سے خود یونانیوں کو ان حکیموں کا مطلب سمجھنے میں مشکلیں پیش آئیں اور وہ تشریح میں غلطیاں کرتے تھے۔

مسلمانوں میں سے ابو نصر فارابی نے افلاطون اور ارسطو کے اندازِ تحریر پر ایک رسالہ لکھا اور ان تمام مقامات کی تشریح کر دی، جن میں مختلف علمی طبقوں نے ٹھوکریں کھائی تھیں۔ صرف بغداد یا ایشیا و افریقہ کے بڑے بڑے علمی مرکزوں ہی میں نہیں، بلکہ ہسپانیہ کی اسلامی حکومت کی سرپرستی میں بھی پرانے علوم کی حفاظت، تشریح اور تجدید انتہائی اہتمام سے ہوئی۔ اگر افلاطون، ارسطو، سقراط، بقراط، جالینوس وغیرہ کے نام بچے بچے کی زبان پر جاری ہیں تو یہ سب انہی مسلمانوں کی علمی خدمات کا کرشمہ ہے، ورنہ ان لوگوں کے علوم زمانے کی قدر ناشناسی کے ہاتھوں ان کے ساتھ ہی مر چکے ہوتے اور آج ان کا کہیں سراغ نہ ملتا۔





عرب "اٹیم بم" تیّار کرتے ہیں

اٹیم بم موجودہ زمانے کا نہایت خوفناک ہتھیار ہے۔ اسے صرف دو مرتبہ جاپان کے دو شہروں پر استعمال کیا گیا جس سے ہزاروں آدمی ہلاک ہو گئے۔ کئی کئی مربع میل زمین پر بربادی کی جھاڑو پھر گئی۔ پہلے زمانے میں بھی ایسی چیزیں ایجاد ہوتی رہیں جن کے متعلق لوگوں کا وہی خیال تھا جو آج کل اٹیم بم کے متعلق ہے۔ ان میں سے وہ آتش گیر روغن "نفطہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے جو عربوں نے بنایا تھا اور صلیبی جنگوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اہلِ فرنگ نے اس کا نام "گریک فائر" یعنی "یونانی آگ" رکھا۔ شاید اس لیے کہ اس روغن کے آگ پکڑنے کا نظارہ پہلے پہل قسطنطنیہ میں انھوں نے دیکھا تھا اور قسطنطنیہ اس وقت یونانی شہر تھا۔

اس روغن کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا۔ کبھی بڑی بڑی پچکاریوں میں بھر کر دور دور پھینکتے یا بھالوں اور تیروں کے پھلوں پر یہ روغن مل دیتے۔ ہوا لگتے ہی یہ بھالے اور تیر آگ پکڑ لیتے۔ کمان کی شکل کا ایک آلہ بنا لیا گیا تھا جسے توپ کی طرح زمین میں نصب کر لیتے۔ اس کی مار منجنیق سے بھی زیادہ تھی۔ اس کے ذریعے سے روغن نفطہ دور دور تک پھینکا جا سکتا تھا۔

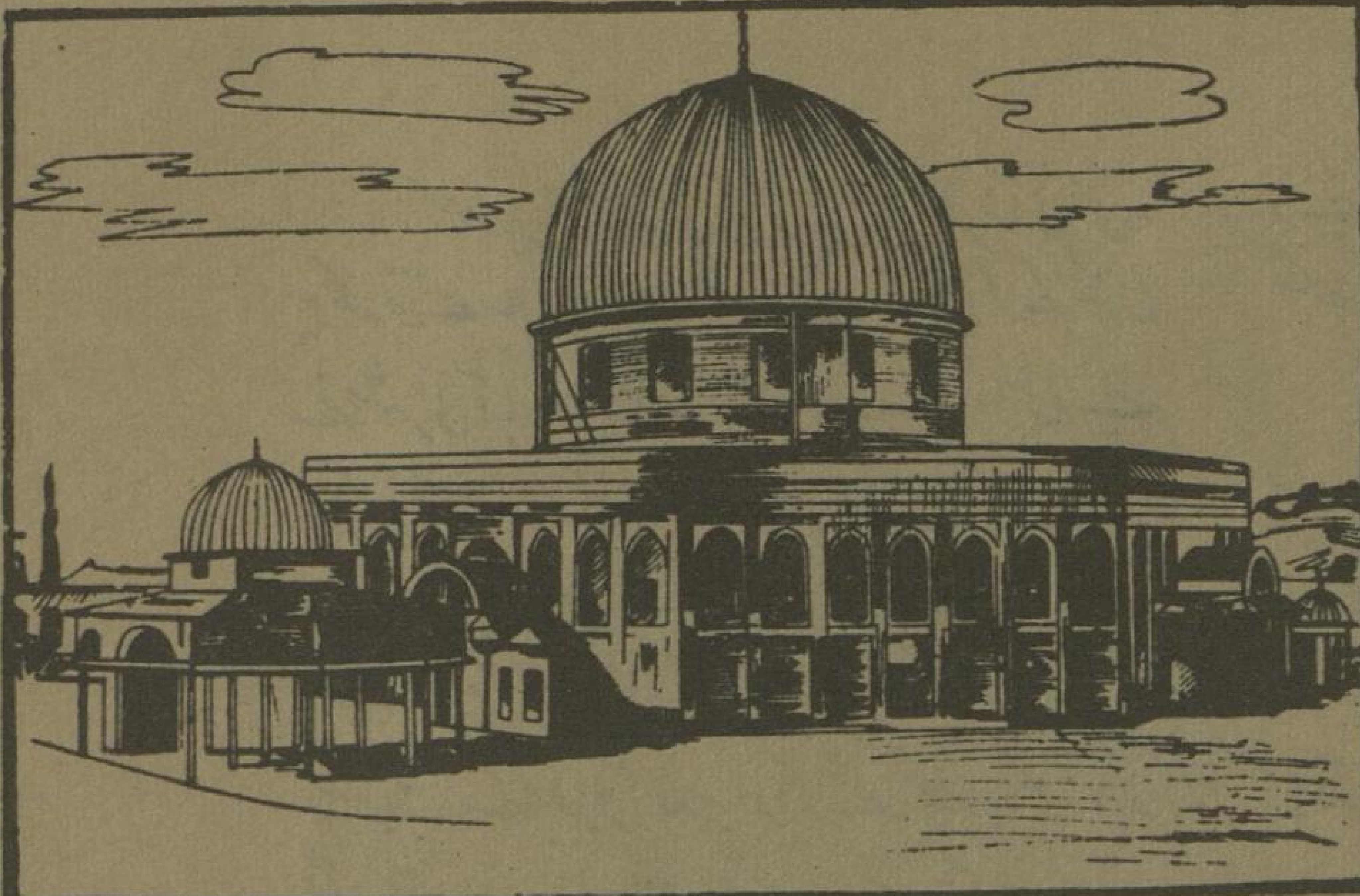
تیروں کے ذریعے آتش بازی کا سلسلہ تو عربوں نے پہلے دور ہی میں شروع کر دیا تھا۔ محمد بن قاسم نے سندھ کی جنگ میں ایسے تیر اندازوں سے کام لیا تھا جن کے تیر کمانوں سے نکلتے ہی سراپا آگ بن جاتے تھے۔ بعد ازاں آتش گیر روغن سے کام لینے کا فن بہت ترقی کر گیا۔ صلیبی جنگوں میں عربوں نے یہ روغن استعمال کیا تو اہلِ فرنگ پر ہیبت طاری ہو گیا۔ وہ اس قدر دہشت زدہ ہو گئے کہ اس آگ کو دیکھتے

ہی پناہ کے لیے بُرجوں کے اندر گھُس جاتے لیکن آگ ایسی خوفناک ہوتی کہ بُرج بھی اس کی جلن اور تپش سے بچانے میں بے کار ثابت ہوتے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آگ کو پانی سے فوراً بُجھایا جا سکتا ہے، لیکن اس آگ پر پانی ڈالا جاتا تو یہ اَور بھڑکتی۔ یہ روغن مٹی کے تیل سے تیار کیا جاتا تھا، لیکن اس میں کئی مسالے ایسے ملا دیئے جاتے تھے جن سے اس کی تیزی اور حرارت بے پناہ بن جاتی تھی۔

یہ روغن برّی اور بحری دونوں قسم کی لڑائیوں میں یکساں اِستعمال ہوتا تھا۔ عربوں نے اپنے جہازوں میں جابجا بڑی بڑی پچکاریاں لگا رکھی تھیں جن میں سے کسی کی شکل اژدہے کی سی ہوتی، کسی کی شیر یا گھڑیال کی سی۔ دشمن کے جہازوں پر یہ روغن پڑتے ہی ان میں آگ لگ جاتی اور وہ جل جاتے تھے۔

ہوا میں تیر یا روغن پھینکنے سے خط قوسی جیسی حرکت پیدا ہوتی تو ساتھ ہی روغن آگ پکڑ لیتا۔ پہلے ایک دھماکا سا ہوتا۔ پھر سیاہ دھواں نکلتا۔ اسی میں سے شعلے نمودار ہو جاتے۔ ایک یورپی مؤرخ نے لکھا ہے کہ یہ آگ رات کو برسائی جاتی تو سارا کیمپ روشن ہو جاتا۔ لوگ گھبرا گھبرا کر اوندھے منہ گر جاتے اور آستینوں سے سر چھپا لیتے۔ آگ ہوا میں اُڑتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ لمبی دُم والا پر دار آتشیں اژدہا اُڑا چلا آرہا ہے۔ رَعد کی کڑک اور بجلی کی چمک دونوں چیزیں اس میں موجود ہوتیں۔ یہ آج سے سات آٹھ سو سال پیشتر کا ایٹم بم تھا جو عربوں نے ایجاد کیا تھا۔

اس کے بعد سائنس نے دوسری خوفناک چیزوں کی ایجاد شروع کر دی۔ اب کسی کو "یونانی آگ" کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ حالانکہ چھ سات سو سال پیشتر تک یہ آگ لڑائیوں میں سب سے بڑھ کر تباہی خیز سمجھی جاتی تھی۔ حق یہ ہے کہ ایجاد وہی قابلِ قدر ہے جس سے انسانوں کے بڑے سے بڑے حصّے کو فائدہ پہنچے۔ اس ایجاد کو کون اچھا سمجھ سکتا ہے جو بڑی بڑی آبادیوں کو آنکھ جھپکتے ہی روئے زمین سے محو کر ڈالے۔



بیتُ المقدس پر اسلامی پرچم لہراتا ہے

صلیبی جنگوں میں ایک مرتبہ فلسطین کا کچھ علاقہ مُسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گیا تھا جس میں بیتُ المقدس بھی شامل تھا۔ صلیبی سرداروں نے وہاں اپنی بادشاہت قائم کر لی تھی۔ جن مسلمان بادشاہوں نے چھنے ہوئے علاقے کو واپس لیا، ان میں سلطان نورُ الدّین محمُود زنگی اور سُلطان صلاحُ الدّین ایوّبی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

صلیبیوں کے خلاف جنگی تیاریوں کا آغاز موصل کے ترک امیر عماد الدین زنگی (متوفّی ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء) کے زمانے میں ہُوا۔ سرداروں میں سے نجم الدین اور شیر کوہ عماد الدین کے دست و بازُو تھے۔ نجم الدین ایّوب ہی کے گھر (۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء میں) وہ بچّہ پیدا ہُوا، جو آگے چل کر شُہرت کے آسمان پر چمکنے والا تھا۔ نام اگرچہ یُوسف رکھا گیا، لیکن وہ صلاح الدین کے لقب سے مشہور ہُوا۔

عماد الدین کے جانشین نور الدین نے صلیبیوں سے لڑائی کی پوری تیاریاں کر لی تھیں صرف ایک خدشہ باقی رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ مصر میں فاطمیوں کی حکومت تھی۔ اگر وہ صلیبیوں کے ساتھ اتحاد کر لیتے تو نُورالدین کے تمام منصوبوں پر پانی پھر جاتا۔ خطرے کے اس دروازے کو بند کرنے کے لیے سلطان نے شیر کوہ کو مصر بھیج دیا۔ وہ اپنے نوجوان بھتیجے صلاحُ الدّین کو بھی ساتھ لے گیا شیر کوہ نے جاتے ہی مصر کے انتظامات کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ جب وہ فوت ہُوا تو اس کا منصب صلاح الدین کو تفویض ہُوا۔

ابھی صلیبیوں کے خلاف کوئی فیصلہ کُن قدم نہ اُٹھایا گیا تھا کہ سُلطان نوُرالدّین محمُود نے وفات پائی۔ (۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء) اس کا فرزند کم عمر تھا اور سخت لڑائیاں درپیش تھیں جن کے لیے ایک قابل اور تجربہ کار سپہ سالار کی ضرورت تھی۔ ملک کے مُدبّروں نے یہی مناسب سمجھا کہ بادشاہی صلاحُ الدّین کے حوالے کر دی جائے۔

صلاحُ الدّین نے تیاری مکمل کی اور لڑائی شروع کر دی۔ صلیبیوں نے ہر مقام پر شکست کھائی اور انجام کار بیت المقدس میں محصُور ہو کر بیٹھ گئے۔ سُلطان نے رمضان ۵۸۳ھ مطابق ستمبر ۱۱۸۷ء کو شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مناسب مقامات پر فوجیں مورچے قائم کر کے بیٹھ گئیں۔ پیچھے پہاڑوں پر منجنیقیں لگا دی گئیں جو پتّھر کے گولے شہر پر پھینکتی تھیں۔ جگہ جگہ سُرنگیں لگنے لگیں، تاکہ ان میں بارُود بھر کر دیواروں کو اُڑایا جا سکے۔

محصورین کو کامیابی کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ چونکہ نوّے سال پیشتر بیت المقدس کو فتح کر کے انھوں نے شہر کی آبادی پر بہت ظلم کیے تھے، اس لیے اپنے پرانے گناہ کی یاد سے اُن پر کپکپی طاری تھی۔ جب ان کی تکلیفیں حد سے گزر گئیں تو شہر حوالے کر دینے پر مجبور ہو گئے۔ آخر طے پایا کہ تمام لوگ اپنی حیثیت کے مطابق فدیہ ادا کر کے چلے جائیں۔ جو لوگ شہر میں رہنا چاہیں اُن سے کچھ نہ کہا جائے۔ (۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء)

ساری کھینچ تان لڑائی تک تھی۔ لڑائی ختم ہو گئی تو کھینچ تان بھی نہ رہی اور سب کے ساتھ نرمی کا برتاؤ شروع ہو گیا۔ جو لوگ روپے دے سکے، وہ نکل گئے۔ جو باقی رہ گئے اُن میں سے بہتوں کو سلطان نے معافی دے دی۔ جو صلیبی مارے جا چکے تھے یا قید ہو گئے تھے ان کی عورتیں اور بیٹیاں شہر میں آگئی تھیں۔ وہ سلطان کے پاس پہنچیں تو اس نے نہ صرف سب کے فدیے معاف کر دیئے بلکہ حکم دیا کہ ان کے عزیزوں میں سے جتنے قیدی ہیں وہ سب رہا کر دیئے جائیں۔ چنانچہ وہ عورتیں جہاں جہاں پہنچیں، سلطان کی فیاضی کے ترانے گاتی رہیں۔

ایک یورپی مؤرخ نے لکھا ہے کہ صلیبیوں نے شہر پر قبضہ کیا تھا تو وہ اس بات کو بھول گئے تھے، کہ خدا کی سب سے بڑی صفت عدل ہے اور رحم، عدل کا تاج ہے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ صلاح الدین کے ہاتھوں ان پر رحم و کرم ہوا۔ سلطان کے کارناموں میں سے اگر صرف یہی کارنامہ دنیا کو معلوم ہوتا تو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ سلطان نہ صرف اپنے زمانے کا، بلکہ تمام زمانوں کا بڑا ہی عالی حوصلہ اور بامروّت انسان تھا۔

غرض نوّے برس کے بعد بیت المقدس دوبارہ فتح ہوا اور یہ فتح اس وجہ سے تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ جس زمانے میں ظلم و جور عام تھا، مفتوحوں پر ہر قسم کی سختیاں روا رکھی جاتی تھیں، صلاح الدین نے اس زمانے میں نرمی، رحم اور شفقت کا ایسا برتاؤ کیا، جس کی مثال اس دور ہی میں نہیں، بلکہ اکثر دوروں میں نہیں ملتی۔



جوانمردوں کا جھنڈا اپنی حفاظت خود کرتا ہے

آپ نے شاید کبھی نہ سنا ہوگا کہ حکومت کا جھنڈا کسی مقام پر نصب ہے اور اس کی حفاظت کے لیے کوئی سپاہی موجود نہیں، لیکن دشمن کو اس کے پاس آنے اور اکھاڑنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ ہسپانیہ کی اسلامی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ بھی مذکور ہے جو دسویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ اس وقت ابن ابی عامر محمد "منصور باللہ" ہسپانیہ کی اموی سلطنت کا سپہ سالار تھا۔

یہ منصور بڑی عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ بالکل غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے معمولی حیثیت سے زندگی شروع کی مگر بہت جلد ایسا اقتدار حاصل کر لیا کہ جو کچھ چاہتا کرتا۔ اس زمانے میں ہسپانوی ریاستوں سے لڑائیاں جاری تھیں۔ منصور خود سال میں دو مرتبہ فوج کشی کے لیے نکلتا۔ چنانچہ اپنے عہدِ حکومت میں اس نے کم و بیش چھپّن حملے کیے۔

ایک مرتبہ منصور ایسی وادی میں جا پہنچا، جہاں آمد و رفت کے لیے صرف ایک تنگ درّہ تھا۔ ہسپانویوں نے سوچا کہ شیر پنجرے میں آگیا ہے، اب اُسے یہیں ختم کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ اُنھوں نے درّہ کی ناکہ بندی کر لی۔ منصور نے یہ حالت دیکھی تو اپنی فوج کو دو حصّوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصّے کو مناسب مقامات پر کھیتی باڑی کے لیے لگا دیا، تاکہ فوج کے لیے خورونوش کا سامان مہیّا ہوتا رہے، دوسرے حصّے کو لے کر ارد گرد کی آبادیوں پر چھاپے مارنے لگا۔ جتنے لوگ روزانہ قتل ہوتے، ان کی لاشیں اُٹھوا کر درّے میں رکھوا تا جاتا۔ چند روز کے بعد ہسپانویوں نے خود درخواست کی کہ آپ جو شرطیں پیش کریں ہمیں منظور

ہیں۔ درّے سے فوج ہٹالی ہے، آپ اطمینان سے تشریف لے جائیں۔

حفاظت کے اسباب سے محرُومی کسی کو بھی معلوم نہ ہوگی، لیکن جوانمردوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ جب شدید مُشکلات میں گھر جاتے ہیں تو پریشان ہونے کے بجائے مشکلات میں سے نئی کامرانیوں کا راستہ پیدا کر لیتے ہیں۔

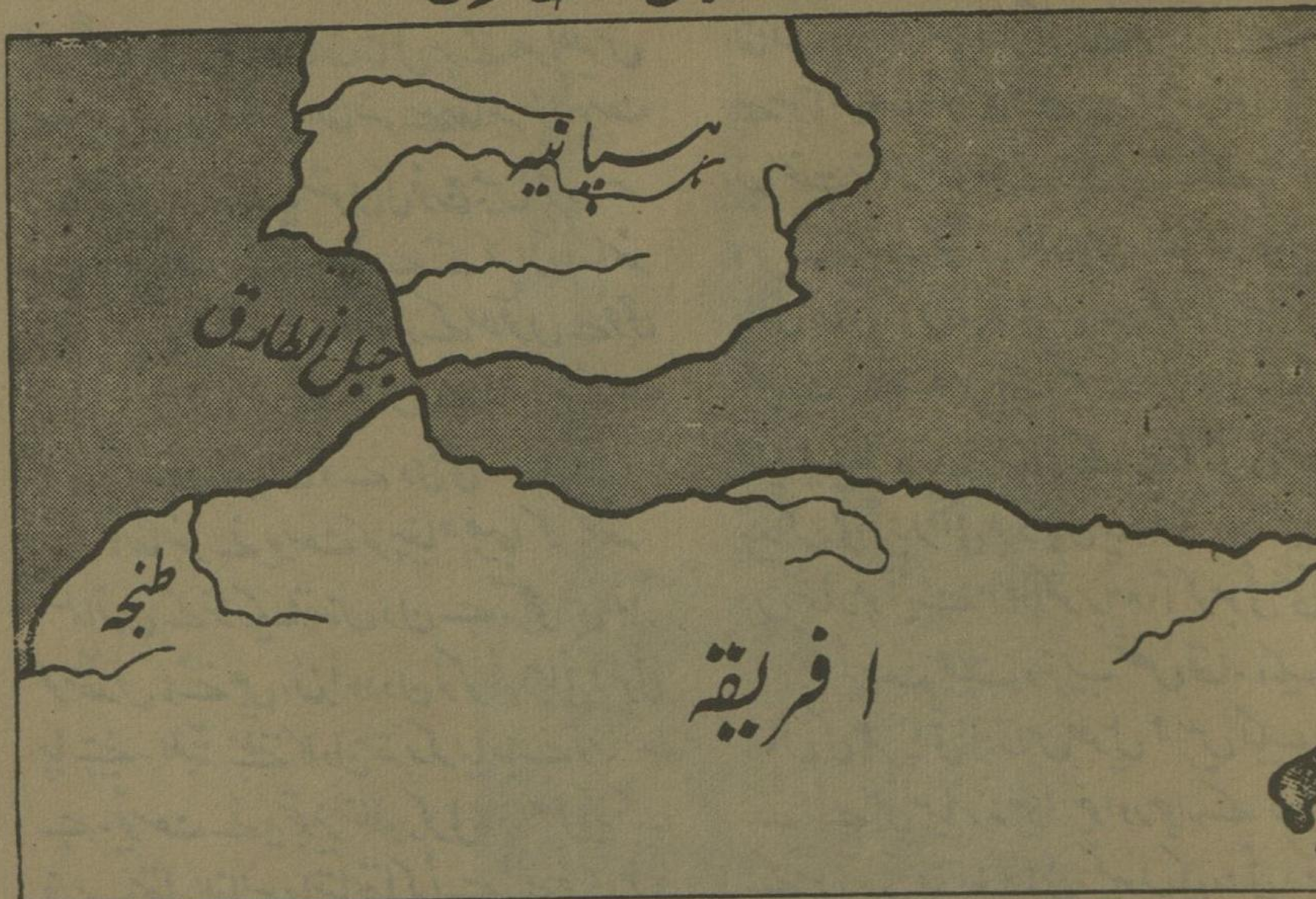
منصور نے ہسپانوی ریاستوں سے جو عہدنامے کر رکھے تھے، ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان کی حدود میں کوئی مسلمان قیدی نہ رہنے پائے۔ ایک مرتبہ اس کا ایلچی شمالی ہسپانیہ کی ایک ریاست میں گیا۔ سیرو سیاحت کرتے ہوئے اُسے معلوم ہوا کہ چند پادریوں نے ایک مُسلمان عورت کو قیدی بنا کر کلیسا کے کام پر لگا رکھا ہے۔ منصور کو یہ اطلاع ملی تو خود فوج لے کر اس صوبے میں پہنچ گیا۔ حاکم نے حاضر ہو کر حلف اُٹھایا کہ مجھے اس خاتون کی اسیری کا علم نہ تھا اور اس نے مجرموں کو سخت سزائیں دیں۔

یہی منصور ایک مرتبہ لڑائی کے لیے گیا۔ فوج کے دستوں نے جگہ جگہ اپنے جھنڈے نصب کر رکھے تھے۔ جنگ ختم ہوگئی اور فوج کو واپسی کا حکم ملا تو اتفاق سے ایک جھنڈا، جو پہاڑی پر نصب تھا بدستور وہیں لگا رہ گیا۔ اگرچہ پُوری فوج واپس چلی گئی تھی اور کوئی شخص جھنڈے کے پاس موجود نہ تھا، لیکن دشمن کو اسے اُکھاڑنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے یہی سمجھا کہ اگر اسے اُکھاڑ لیا تو منصور سخت سزا دے گا۔

جھنڈا کیا ہے؟ لکڑی کا ایک ڈنڈا اور دو گز کپڑا، لیکن جب وہ ایک فوج، ایک ملک اور ایک قوم کی عزّت کا نشان بن جائے، تو ہزاروں بہادر اس کے سائے میں اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ کس قدر خوش نصیب تھا وہ جھنڈا، جسے اپنے جانبازوں کی فیروزمندی کے طفیل وہ بلند مقام حاصل ہؤا کہ اگرچہ ایک بھی متنفّس اس کی حفاظت کے لئے موجود نہ تھا، تاہم کسی کا ہاتھ اس کی طرف نہ بڑھا۔ گویا غیرت و حمیّت کے پیکروں نے ایک بے جان جھنڈے میں ایسی روح پھُونک دی تھی کہ وہ اپنی حفاظت خود کرتا رہا۔

محمد "المنصور باللہ" کی آرزو تھی کہ میدان جنگ میں شہادت پائے۔ بیمار ہو کر گھر میں نہ مرے۔ خُدا نے اس مجاہد کی یہ آرزو پُوری کی۔ وہ قشتالیہ کی کامیاب مہم سے واپسی میں ۳۹۲ھ مطابق ۱۰۰۲ء میں فوت ہُوا اور اسی زرہ بکتر کے ساتھ دفن کیا گیا جس پر پچاس سے زیادہ غزوات کی گرد پڑی تھی!

نقشہ جبل الطارق



جو کچھ ہونے والا ہے تیرے سامنے آجائے گا

سلطنتوں پر زوال کا دور آتا ہے تو ان کی قوت مٹنے لگتی ہے اور ایک مرکزی حکومت کی جگہ کئی حکومتیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ ہسپانیہ میں عرب ساڑھے تین سو سال تک جاہ و جلال سے حکومت کر چکے تو ان کی سلطنت بھی کئی ریاستوں میں بٹ گئی جو اکثر آپس میں لڑتی رہتی تھیں اور بعض ایک دوسرے کے خلاف عیسائی بادشاہ الفانسو سے بھی مدد طلب کر لیتی تھیں۔ اس طرح الفانسو کو قدم آگے بڑھانے کا موقع ملتا رہا اور وہ تمام عرب ریاستوں کے لیے خطرہ بن گیا۔

ان میں سے ایک اشبیلیہ کی ریاست بھی تھی جس کے فرمانروا معتمد نے بادشاہی میں بلند مرتبہ حاصل کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن شعر و ادب میں اس نے لازوال شہرت پائی۔ ڈاکٹر اقبالؒ نے بھی اس کے عربی اشعار کو اردو کا لباس پہنایا ہے۔ معتمد کے مشورے سے تمام عرب ریاستوں نے مرابطی خاندان کے حکمران یوسف بن تاشفین کو اپنی امداد کے لیے افریقہ سے ہسپانیہ بلایا۔ وہ فوج لے کر پہنچا تو الفانسو نے اسے لمبا چوڑا خط لکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کیوں مرنے کے لیے ہسپانیہ آئے ہو۔ بہتر ہے چپ چاپ واپس چلے جاؤ۔ میں مراکش میں آ کر تمہارا شوقِ جنگ پورا کر دوں گا۔ یوسف نے اس خط کی پشت پر صرف تین لفظ لکھے اور اسے بجنسہٖ واپس کر دیا۔ ان لفظوں کا مفہوم یہ تھا کہ "جو کچھ ہونا ہے، تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

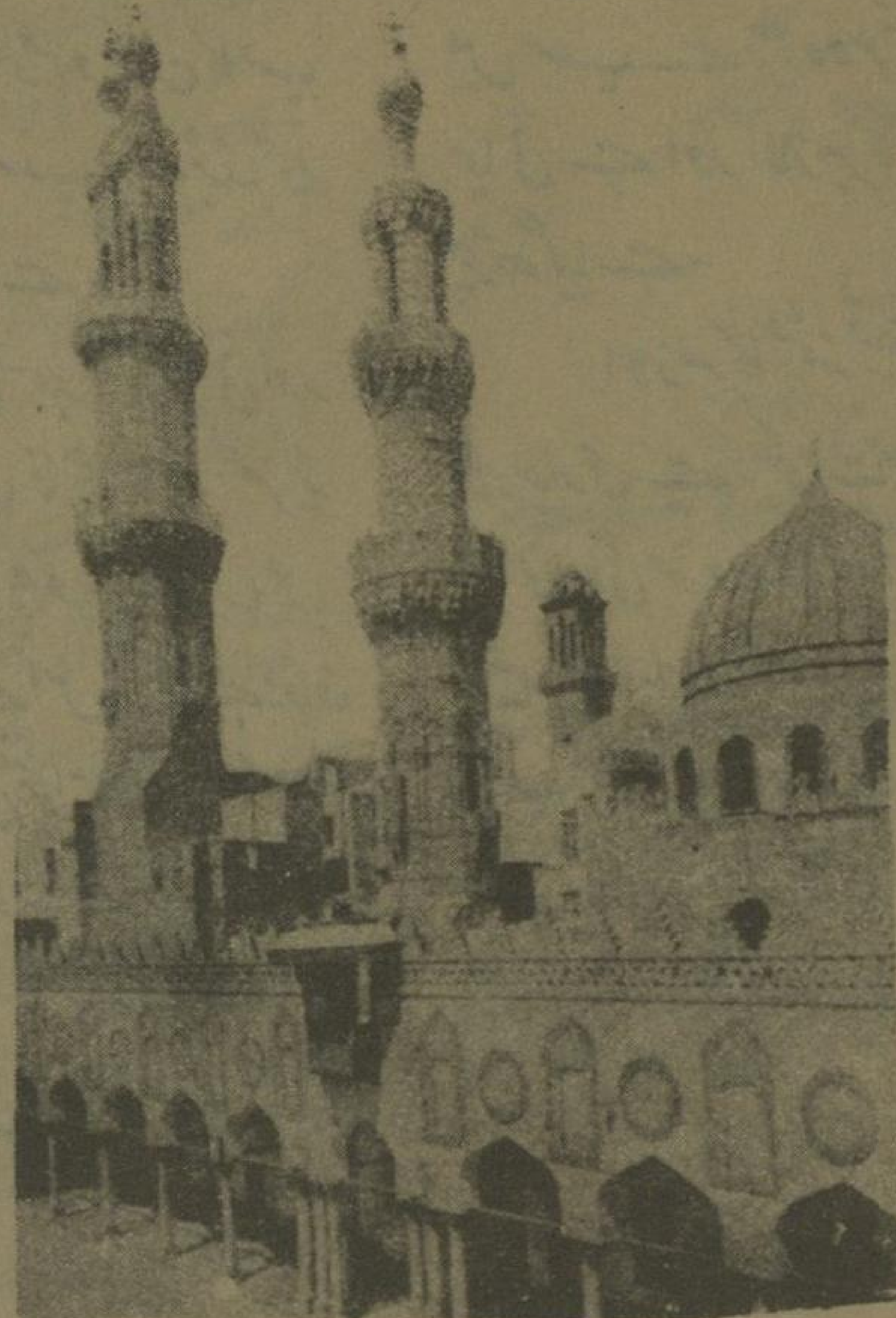
غرض فوج لے کر یوسف آگے بڑھا۔ عرب ریاستو

کے جنگجو بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ صوبہ بطلیوس کے ایک میدان زلاقہ میں الفانسو سے مقابلہ ہوا۔ یوسف بن تاشفین اور عرب ریاستوں کی فوج بیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ الفانسو کے جھنڈے تلے کم از کم ساٹھ ہزار آدمی تھے۔ اُن میں دُور دُور کے علاقوں سے فوجی دستے شامل ہو گئے تھے، اس لیے کہ عوام نے اسے قومی جنگ کی حیثیت دے دی تھی۔

الفانسو نے یوسف کو پیغام بھیجا کہ جُمعہ مُسلمانوں کے نزدیک مقدس دن ہے، مسیحی بھی اتوار کو مقدس مانتے ہیں، لہٰذا دو دن تو کوئی لڑائی نہ ہونی چاہیئے۔ البتہ ہفتے کا دن مقرّر کر لیا جائے تو مناسب ہے۔ یُوسف نے یہ تجویز منظور کر لی۔ دراصل یہ ایک فریب تھا۔ الفانسو چاہتا تھا کہ اُسے بے خبری میں مُسلمانوں پر ٹوٹ پڑنے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ مُسلمان جمعہ کی نماز ادا کر رہے تھے کہ اچانک الفانسو نے حملہ کر دیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ یوسف اپنی فوج کو لے کر ایک الگ مقام پر جا کھڑا ہوا اور عرب ریاستوں کی فوجیں الفانسو کے تیز و خونریز حملوں کا نشانہ بنی رہیں۔ جب یُوسف نے دیکھا کہ الفانسو کی فوج خاصی تھک گئی ہے تو پہاڑ کے عقب میں سے ہوتا ہُوا الفانسو کے پیچھے سے حملہ آور ہُوا۔ یہ حملہ ایسا سخت تھا کہ الفانسو کے چھکّے چھُوٹ گئے۔ ساتھ ہی اس کے کیمپ کو آگ لگا دی گئی۔ الفانسو نے شکست فاش کھائی۔ اُس کی فوج میں سے کم از کم بیس ہزار آدمی کھیت رہے۔ اس ایک فتح نے مسلمانوں کے لیے ہسپانیہ پر مزید چار سو سال کے لیے حکمرانی کی صورت پیدا کر دی۔ یہ لڑائی جو دُنیا کی چند فیصلہ کُن لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے ۲۳ اکتوبر ۱۰۸۶ء کو ہوئی تھی۔

یُوسف عجیب و غریب شخص تھا۔ ایک سو سال کی عمر پائی اور اس طویل عمر میں ایک دن کے لیے بھی بیمار نہ ہُوا۔ جَو اور جوار کے دلیے کے سوا کوئی غذا نہ کھائی۔ گیہوں کی روٹی، بکری کا گوشت یا گائے کا دُودھ کبھی نہ چکھا۔ صوف کا لباس پہنتا تھا اور زمین پر سوتا تھا۔ سینتالیس سال کی حکمرانی کے بعد ۴۹۹ھ مطابق ۱۱۰۶ء میں فوت ہُوا۔ مراکش میں اس کا مزار ہے۔ اس شہر کی بنا بھی اسی بادشاہ نے رکھی تھی۔





دُنیا کی عظیم یُونیورسٹی قائم ہوتی ہے

فاطمی خلافت کا بانی عبیدُ اللہ المہدی حضرت اسمٰعیل بن حضرت امام جعفر صادق کی اولاد میں ہونے کا دعوے دار تھا۔ عبیدُ اللہ کے ایک داعی ابوعبداللہ حسن نے تونس، الجزائر اور مراکش کے بربروں میں بڑے اہتمام سے اس کی مہدویت کی تبلیغ کی اور اپنے حامیوں کی ایک جمعیت پیدا کرلی۔ پھر قیروان پر حملہ کر کے اغلبیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ۲۹۶ھ/۹۰۹ء میں عبیداللہ المہدی کو خلیفہ بنا دیا۔ ساحلِ بحر پر مہدیہ کے نام سے نیا دارالحکومت بنایا جہاں سے فاطمی خلافت کا آغاز ہوا۔

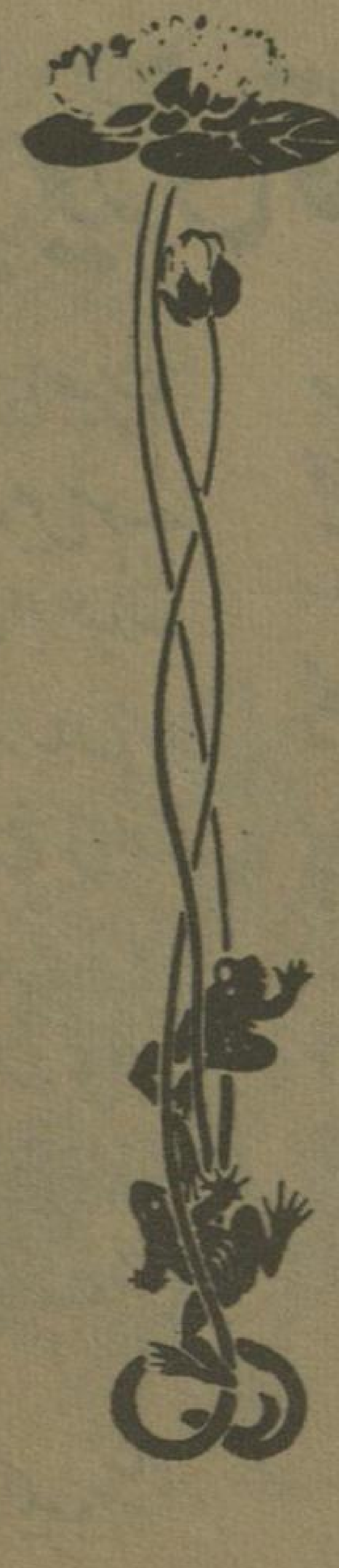
۳۵۸ھ/۹۶۹ء میں فاطمیوں کے ایک سپہ سالار جوہر صقلی نے جسے جوہر رومی بھی کہتے ہیں، مصر کو فتح کر لیا اور فسطاط کے پاس جو ابتدا سے عربی سلطنت کا مرکز چلا آتا تھا، ایک نئے شہر کی بُنیاد رکھی، جس کا نام قاہرہ تجویز ہوا۔ یہ شہر ایک ہزار سال سے مصر کا پایۂ تخت چلا آتا ہے۔ فاطمیوں، ایوبیوں، مملوکوں، ترکوں اور خدیویوں کے عہد میں اس کی عظمت درجۂ کمال پر پہنچ گئی اور آج بھی شرقِ اوسط میں تاریخی آثار کا نہایت بیش قیمت خزانہ اسی شہر میں محفوظ ہے۔

لیکن قاہرہ کی ساری عظمت مادّی تھی۔ وہاں جوہر رومی نے ایک ایسی عمارت بھی بنائی جو ایک

ہزار سال سے مشرقی اور اسلامی علوم وفنون کا سب سے بڑا سرچشمہ چلی آتی ہے۔ یہ سب سے بڑی علمی میراث ہے جو عالمِ اسلام کو ملی ہے۔

جوہر نے ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی اور اس کا نام "الازہر" رکھا۔ پانچویں فاطمی خلیفہ العزیز (۳۶۴-۳۸۶ھ = ۹۷۵-۹۹۶ء) نے اس میں دینی علوم کی تدریس شروع کر کے اس کے لیے اوقاف کا انتظام کر دیا، تاکہ اساتذہ کی تنخواہوں اور طالبعلموں کے وظیفوں کے مصارف ادا ہوتے رہیں۔ آہستہ آہستہ یہ جامعہ سارے عالم اسلام کے لیے ایک مرکزی درس گاہ بن گئی، جس کی سند مشرق و مغرب میں سب سے زیادہ عزّت و احترام کا وثیقہ سمجھی جاتی ہے اور الازہر کا نام بچّے بچّے کی زبان پر چڑھ گیا ہے۔

الازہر کا چشمۂ فیض ایک ہزار سال سے برابر جاری ہے۔ حکومتِ مصر نے مغربی علوم اور مغربی زبانوں کی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہُوئے قدیم تعلیم کے علاوہ علومِ جدیدہ کی تعلیم کا بھی انتظام کر دیا ہے۔ بیرونی طلبہ کے لیے اقامت خانے ہیں۔ لباس وطعام اور کتابوں کے اخراجات کے لیے بھی جامعہ کی طرف سے وظائف دیئے جاتے ہیں۔



قلبِ ہند
میں
اسلامی تخت بچھتا ہے

ہندوستان میں پہلی اسلامی حکومت محمدؐ بن قاسم نے قائم کی، لیکن وہ اس وسیع ملک کے صرف ایک گوشے تک محدود رہی۔ محمود غزنوی نے آندھی کی طرح دُور دُور تک ترکتازی کی لیکن پنجاب کے سوا کوئی حصہ اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔ جس شخص نے ہندوستان کے قلب میں تختِ سلطنت بچھایا اور پُورے برِّ عظیم میں اسلامی پرچم اُڑانے کا موقع پیدا کیا وہ شہاب الدّین محمدؐ غوری تھا۔

محمد غوری نے اپنے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین کے نائب کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ وہ پہلے غزنہ کا حاکم بنا۔ جب اُس نے دیکھا کہ لاہور کے غزنوی حکمران کمزور ہو چکے ہیں تو لاہور اور پنجاب پر بھی قابض ہو گیا۔ اس زمانے میں دہلی اور اجمیر کی ہندو ریاستیں مل کر ایک طاقت ور حکومت بن گئی تھی۔ اس کے فرمانروا پرتھوی راج نے غزنوی سلطنت کے کچھ سرحدی علاقے لے لیے تھے۔ محمد غوری نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو پرتھوی راج سے لڑائی چھڑ گئی۔

پہلی لڑائی ۱۱۹۱ء میں ہُوئی۔ محمد غوری کے پاس فوج کم تھی۔ پرتھوی راج کے ساتھ دو لاکھ سپاہی اور تین ہزار جنگی ہاتھی تھے۔ ایک حادثہ یہ پیش آیا کہ سلطان سخت زخمی ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گھوڑے سے گرنے ہی والا تھا کہ ایک وفادار خادم نے اُسے سنبھالا اور میدان سے باہر لے گیا۔ سُلطان کا گھوڑا فوج کو نظر نہ آیا تو وہ بھی میدان چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔

اس اتّفاقی شکست نے غوری کے دل کو اتنی ٹھیس لگائی کہ اس نے اپنے اُوپر ہر آسائش حرام کر لی۔ سال بھر تک نہ لباس بدلا اور نہ پلنگ پر سویا۔ ہر وقت یہی خیال رہتا تھا کہ جلد سے جلد تیاری کر کے شکست کا بدلہ لے۔ چنانچہ دوبارہ تجربہ کار فوج لے کر ہندوستان آیا۔ ۱۱۹۲ء میں اسی مقام پر پرتھوی راج سے دوبارہ جنگ کی، جہاں پہلے شکست کھا چُکا تھا۔ پرتھوی راج اب کے تین لاکھ سپاہ لایا تھا۔ نیز تین ہزار جنگی ہاتھیوں کے علاوہ اس کے ساتھ ڈیڑھ دو سو راجے اور رئیس بھی تھے۔

محمد غوری نے اپنی فوج کے پانچ حصے کیے۔ خود بارہ ہزار جانباز ساتھ لے کر ایک اونچے مقام پر بیٹھ گیا جہاں سے پُورا میدانِ جنگ نظر آتا تھا۔ باقی چار لشکروں کو حکم دیا کہ باری باری لڑیں۔ ایک لشکر تھک جاتا تو دُوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔ جب اس نے اندازہ کر لیا کہ دشمن کی ٹڈی دل فوج تھک گئی ہے تو خود بجلی کی طرح اس پر جا پڑا اور تھوڑی ہی دیر میں اسے تتر بتر کر دیا۔ ہزاروں مارے گئے، جن میں خود پرتھوی راج بھی تھا۔ دہلی اور اجمیر غوری کے قبضے میں آ گئے۔ تھوڑی ہی مدت میں اس کے سالار بنگال تک جا پہنچے اور شمالی ہند میں مسلمانوں کی وہ سلطنت قائم ہوئی جو ۱۱۹۲ء سے ۱۸۵۷ء تک باقی رہی۔

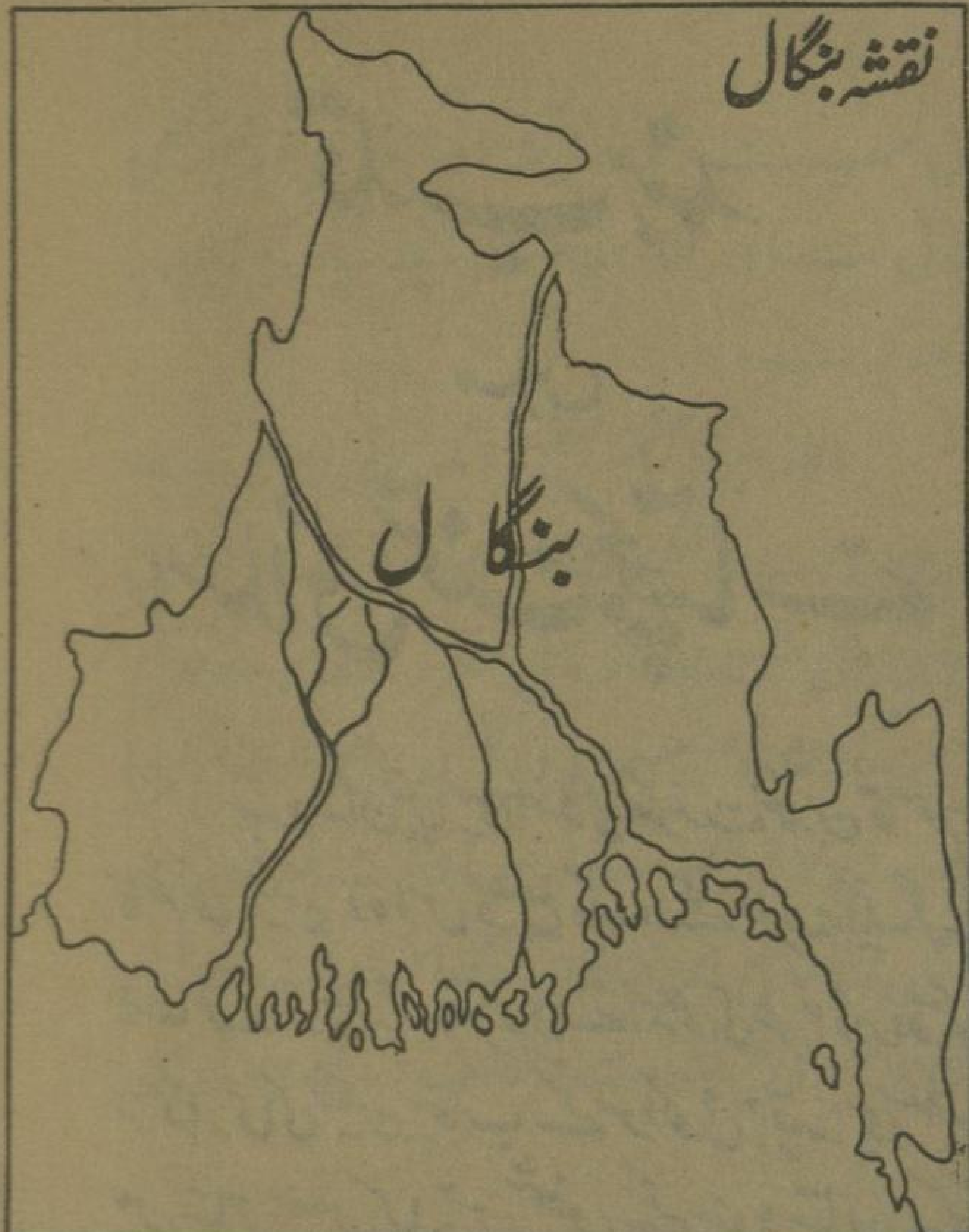
اٹھارہ آدمی ملک فتح کرتے ہیں

کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ صرف اٹھارہ آدمیوں نے ایک بہت بڑی حکومت کی راج دھانی پر قبضہ کر لیا ہو؟ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ بھی موجود ہے اور کسی دوسرے ملک کی تاریخ میں شاید ہی اس کی نظیر مل سکے۔ یہ محمد بن بختیار خلجی کا کارنامہ تھا جو ہندوستان کے پہلے مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک کا ایک سردار تھا۔

محمد بن بختیار کے کارنامے افسانوں سے بھی زیادہ عجیب ہیں۔ یہ ایک معمولی آدمی تھا۔ پہلے اس نے غزنی میں سپاہی بھرتی ہونے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوا، پھر دہلی پہنچا۔ یہاں بھی اسے کوئی جگہ نہ مل سکی تو بدایوں کی طرف چلا گیا۔ اسلامی حکومت کی مشرقی سرحد پر تھوڑی سی زمین مل گئی اور اس نے اپنے طور پر کچھ سوار بھرتی کر لیے۔

۱۱۹۷ء میں دو سو سواروں کو لے کر اس نے بہار پر ہلہ بول دیا اور تھوڑے ہی دنوں میں پورے علاقے پر قابض ہو گیا۔ قطب الدین ایبک اس زمانے میں بادشاہ نہ تھا، بلکہ سلطان محمد غوری کی جانب سے نائب السلطنت تھا۔ اسے محمد بن بختیار کے اس کارنامے کا علم ہوا تو اعلیٰ درجے کا خلعت عطا کیا اور اس کو فتح کیے ہوئے علاقے کا حاکم بنا دیا۔

اب محمد بن بختیار کو اپنی مردانگی اور کاردانی کے جوہر دکھانے کا پورا موقع ملا۔ اس نے ایک فوج تیار کی اور بنگال کے راجا رائے لکشمن سین کی راج دھانی ندیا کا رخ کیا۔ اس کی شہرت پہلے ہی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ نکلا تو اس تیزی سے چلا کہ ساری فوج پیچھے رہ گئی۔ صرف اٹھارہ آدمی ساتھ



تھے۔ اسی طرح وہ شہر میں راجا کے قلعے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ پہنچتے ہی پہرہ داروں پر حملہ کر دیا اور فوج کا انتظار نہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ ساتھیوں کی تھوڑی تعداد کا خیال کوئی نہ کرے گا، سب یہی سمجھیں گے کہ بہت بڑی فوج لے کر آیا ہے اسی لیے تو بیباکانہ لڑ رہا ہے۔ اس کا یہ خیال بالکل درست نکلا۔

راجا اس وقت کھانا کھا رہا تھا۔ باہر سے لوگوں کی چیخ و پکار کان میں پہنچی تو حواس باختہ ہو کر محل کے پچھلے دروازے سے ننگے پاؤں بھاگا اور سنار گاؤں پہنچ کر دم لیا جو کسی زمانے میں ایک بڑا شہر تھا اور اب بھی خاصا مشہور ہے۔ ڈھاکہ سے کوئی تیرہ میل کے فاصلے پر ہو گا۔ پہلے قدم پر شکست کے بعد راجا کے لیے کہیں جم کر لڑنے کی کیا صورت تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں محمد بن بختیار بہار کی طرح پورے بنگال پر قابض ہو گیا اور اپنے کارناموں کی ایک ایسی یادگار چھوڑ گیا جو بڑے آدمیوں میں سے بہت تھوڑے انجام دے سکے ہیں۔



تاتاری سَیل کا رُخ بدلتا ہے

تیرھویں صدی عیسوی ایشیا کے بڑے حصے کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً بڑی ہی مُصیبتوں اور آزمائشوں کا زمانہ تھا۔ اسی صدی میں تاتاریوں کا سیل منگولیا کے سنسان صحرائی علاقے سے نکلا، جس نے چنگیز خاں کی سرکردگی میں ان تمام خطّوں پر قتل و غارت کی بجلیاں گرا دیں، جنھیں آج چینی ترکستان، رُوسی ترکستان، افغانستان، ایران، عراق، جنوبی اور مشرقی ایشیائے کوچک اور شام کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے سات صدیوں میں علم و فضل اور تہذیب و تمدن کے جو بڑے بڑے مرکز بنائے تھے، وہ بہت سے انھی علاقوں میں واقع تھے۔ ان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ کُتب خانے تباہ ہو گئے۔ دولت لُٹ گئی، باشندے موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ تاتاری بحرالکاہل کے قریب سے اُٹھے اور موت و ہلاکت پھیلاتے ہوئے بحیرۂ رُوم کے کناروں تک پہنچ گئے۔ کوئی بھی اس تیز و تند سیل کو روک نہ سکا۔ شام کو پامال کر چکنے کے بعد اس سَیل کا رُخ مصر کی طرف پھر گیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اب یہ سَیل شمالی افریقہ میں سے ہوتا ہؤا شاید اوقیانوس کے کناروں تک جا پہنچے گا۔

مصر کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ ایوبیوں کی فرمانروائی ختم ہو چکی تھی اور وہ جنگجو سردار برسرِ اقتدار ہو گئے تھے جنھیں بحری مملوک کہتے ہیں۔ ان میں تفرقہ پڑا ہؤا تھا اور ان کے پاس اتنی فوج بھی نہ تھی جو تاتاریوں کے مقابلے پر آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی، لیکن جب قدرت کو کوئی کام لینا منظور ہوتا ہے تو اس کے لیے موزوں آدمی پیدا کر دیتی ہے۔ انھی دنوں بحری مملوکوں میں سے

سیف الدین قطز نے "الملک المظفر" کا لقب اختیار کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

چنگیز کے پوتے ہلاکو نے قطز کو پیغام بھیجا کہ فوراً اطاعت اختیار کر لو، ورنہ پچھتاؤ گے۔ آنسو بہانے والوں پر ہم نے کبھی رحم نہیں کیا۔ آہ و فریاد سے ہمارے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ تم بھاگ کر جہاں جاؤ گے ہم تمہارے پیچھے پہنچیں گے اور کوئی سرزمین تمھیں پناہ نہ دے سکے گی۔

قطز نے فیصلہ کر لیا کہ وہ تاتاریوں سے لڑیگا، خواہ نتیجہ کچھ ہی ہو۔ چنانچہ اس نے پیغام لانے والوں کو قتل کرا دیا، تاکہ صُلح کا سوال ہی باقی نہ رہے۔ پھر جتنی فوج فراہم کر سکا، اُسے لے کر شام کی طرف روانہ ہو گیا، تاکہ دشمنوں کو اپنی مملکت سے باہر روکے۔ اس کا غلام رکنُ الدین بیبرس ہراول کا کماندار تھا۔ شمالی فلسطین میں عین جالُوت کے مقام پر ۶ ستمبر ۱۲۶۰ء کو فیصلہ کُن لڑائی ہوئی۔ تاتاریوں کی فوج بہت زیادہ تھی اور منگولیا سے شام تک وہ برابر فتح و ظفر کے پھریرے اُڑاتے چلے آ رہے تھے۔ قطز کو پُورا احساس تھا کہ مقابلہ آسان نہیں۔ اس نے ایک نیک دل مسلمان کی طرح رو رو کر بارگاہِ الٰہی میں دعائیں مانگیں اور اپنے تمام سالاروں اور رفیقوں سے بھی کہہ دیا کہ اس مقام پر جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ رکنُ الدین بیبرس بڑی مردانگی سے لڑا، پھر قطز نے ایک زبردست حملہ کیا، جس میں اس کا گھوڑا مارا گیا اور وہ خود موت کے مُنہ میں پہنچ گیا۔ عین اس حالت میں ایک سپاہی نے اپنا گھوڑا پیش کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں تاتاریوں کا سالارِ اعظم مارا گیا اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ باقی بہت بڑی تعداد میں تہ تیغ ہُوئے۔ اس شکست نے تاتاریوں کے دل میں اِتنا ہراس پیدا کر دیا کہ وہ دمشق اور دُوسرے شہروں سے بھی نکل گئے۔

عین جالوت کی لڑائی اس لحاظ سے تاریخ میں بے حد اہم ہے کہ تیس برس کی مسلسل فتوحات کے بعد تاتاریوں کی یہ پہلی شکست تھی۔ ان کے سیل کا رُخ عین جالوت سے پلٹا اور شام و فلسطین کے علاوہ مصر، شمالی افریقہ اور مغربی یورپ بھی ان کی ترکتاز سے محفُوظ ہو گئے اور تاتاریوں کو پھر کبھی آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔



راشن
کا
بہترین نظام جاری ہوتا ہے

حکومت کا ایک بہت بڑا فرض یہ ہے کہ جن چیزوں کی ضرورت عوام کو ہوتی ہے، ان کا انتظام ایسے اچھے طریقے سے کرے کہ کسی کو ان کے حاصل کرنے میں کوئی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں سے کوئی انسان بھی بے نیاز نہیں۔ اگر ان کے نرخوں کی پُوری نگرانی نہ کی جائے تو سرمایہ دار لوگ نفع کے لالچ میں عوام کے لیے مُصیبت بن جاتے ہیں۔

عوام کو اس قسم کی تکلیفوں سے بچانے کے لیے حکومتیں بعض اوقات راتب بندی کا نظام جاری کر دیتی ہیں۔ ہندوستان میں یہ بندوبست سب سے پہلے سُلطان علاؤالدین خلجی نے جاری کیا تھا جو حد درجہ کامیاب رہا اور آج تک ایسی کامیابی کی مثال کوئی بھی حکومت پیش نہ کر سکی۔ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ منتظموں اور کارکنوں کی نالائقی یا سہل انگاری کے باعث راتب بندی عوام کے لیے پریشانیوں کا باعث بنتی رہی ہے۔

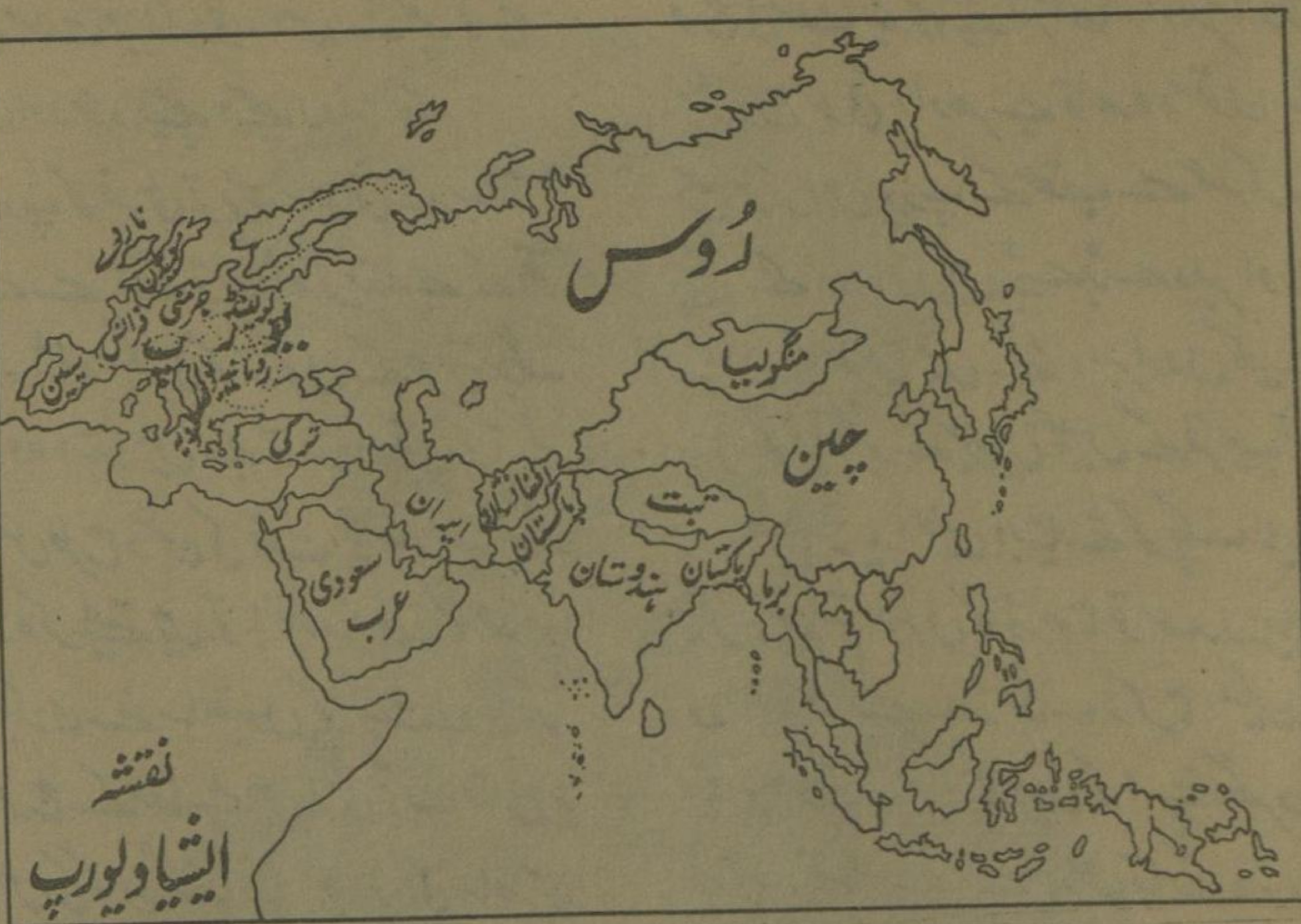
سُلطان علاؤالدّین نے تمام ضروری جنسوں کی مناسب قیمتیں مقرر کر دیں۔ جگہ جگہ غلّے کے سرکاری ذخیرے بنوا دیئے۔ ہر ضروری مقام پر منڈیاں قائم کر دیں اور ہر منڈی کا انتظام ایک قابل اور دیانتدار منتظم کے حوالے کیا۔ سُلطان نے ہر مقام پر اپنے جاسُوس مقرر کر رکھے تھے۔ اگر کوئی شخص نرخ یا تول میں ذرا سی بھی بددیانتی کرتا تو فوراً سُلطان کو اطلاع پہنچ جاتی اور مجرم کو سخت سزا دی جاتی۔ ہر محلّے کے لیے الگ الگ بنیئے مقرر کر دیئے گئے تھے جو

تمام اہلِ محلّہ کو سرکاری نرخ پر غلّہ بہم پہنچاتے تھے۔ کسی کو جائز ضرورت سے زیادہ غلّہ لینے کا حق نہ تھا اور ضرورت کو ٹھیک ٹھیک پُورا کرنے کی ذمہ داری خود حکومت نے لے رکھی تھی۔

سرکاری ذخیروں میں اجناس جمع رہتی تھیں اور بنجارے بھی غلّہ برابر منڈیوں میں پہنچاتے رہتے تھے۔ جونہی کسی منڈی میں غلّہ کم ہونے لگتا تو پاس کے سرکاری ذخیرے سے اُسے فوراً پُورا کر دیا جاتا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ خود شاہی ضرورت کی چیزیں بھی عام لوگوں کی طرح منڈیوں سے مقررہ نرخوں پر خریدی جاتی تھیں۔ گویا عوام، امراء اور بادشاہ میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا۔ کپڑے، گھی، دالوں، شکر اور دُوسری چیزوں کے نرخ مقرر کر دیئے گئے تھے۔ مُلتانی تاجروں کو بیس لاکھ روپے کی رقم سرکاری خزانے سے پیشگی دے دی گئی تھی کہ وہ دُور دُور سے ہر قسم کا کپڑا خرید کر سرکاری منڈیوں میں پہنچاتے رہیں۔ تمام تاجروں کے نام دفتر میں درج ہوتے تھے۔

اس انتظام کا نتیجہ یہ ہُوا کہ نہ قحط اور خشک سالی میں غلّے یا دُوسری خوردنی چیزوں کی کمی ہوئی اور نہ فراوانی اور بہتات کے زمانے میں نرخ بدلنے پڑے۔ ایک موقع پر منڈی کے منتظم نے خشک سالی کے مدِّنظر تجویز پیش کی کہ غلّے کے نرخ میں اضافہ کر دیا جائے۔ سلطان نے اُسے اکّیس ضرب تازیانہ کی سزا دی۔

مؤرّخوں نے لکھا ہے کہ راتب بندی کے اس نظام کو اس وجہ سے اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل ہوئی کہ منڈیوں کے لیے جو ضابطے مقرّر ہو چکے تھے، ان کی پابندی میں کسی سے رُو رعایت نہ برتی جاتی تھی، نیز جو منتظم اور کارکُن مقرّر کیے جاتے تھے، وہ بڑے دیانت دار ہوتے تھے اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں بہت مستعد تھے۔ حق یہ ہے کہ ضابطوں کے خلاف چلنے میں سُلطانی دار و گیر کا خوف رہتا تھا اور سُلطان کی یہ حالت تھی کہ قانون توڑنے والے کسی بھی شخص کو معاف نہ کرتا تھا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا امیر یا اس کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔



نقشہ
ایشیا و یورپ

مغرب مشرق سے شکست کھاتا ہے

سلطان اورخاں (۱۳۲۶-۱۳۵۹ء) کے زمانے میں عثمانی ترک یورپ پہنچ گئے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔ اہلِ یورپ نے دو تین مرتبہ بڑی فوج جمع کر کے مقابلہ کیا۔ پہلا زبردست معرکہ سلطان مراد اوّل کے ساتھ کسووا کے میدان میں پیش آیا۔ یورپ والوں نے شکست فاش کھائی۔ اس کے بعد دس سال اطمینان سے گزر گئے۔ سلطان بایزید یلدرم کے زمانے میں یورپ کے اندر پھر جوش و خروش کی لہر اُٹھی۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، پولینڈ، آسٹریا، ہنگری اور بلقانی علاقوں کے بڑے بڑے رئیسوں، بہادروں اور شہزادوں نے فیصلہ کیا کہ وہ سب مل کر ترکوں کو یورپ سے باہر نکال دیں گے۔ چنانچہ شاہِ ہنگری کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج تیار ہو گئی۔

سلطان بایزید چار سال سے ایشیائے کوچک کے انتظامات میں مصروف تھا اور اپنے یورپی علاقوں میں جانے کی اُسے فرصت ہی نہ ملی تھی۔ اہلِ یورپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور سلطنتِ عثمانیہ کے قصبوں کو جلاتے اور برباد کرتے آگے بڑھے۔ اصل میں اُن کے پیشِ نظر لڑائی نہ تھی، بلکہ ایک جوشِ انتقام تھا جس نے انھیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔ انھیں اپنے بہادروں کی شجاعت اور اپنی فوج کی کثرت پر بڑا ناز تھا۔ مشہور ہے کہ پیش قدمی کرتے ہُوئے ان کی نظریں اپنی تعداد کی زیادتی پر پڑتی تھیں تو پکار اُٹھتے تھے کہ اگر آسمان بھی ٹُوٹ پڑے تو ہم اپنے نیزوں کی نوکوں پر اسے اُٹھائے رکھیں گے اور زمین پر نہ گرنے دیں گے۔

بایزید کو اہلِ یورپ کے بھاری جتھے کی اطلاع ملی تو بجلی کی طرح تڑپ اُٹھا اور طوفان کی تیزی سے اپنے یورپی دارالحکومت ایڈریانوپل پہنچ گیا۔ اس اثنا میں نکوپوس کے ترک حاکم نے اہلِ یورپ کا زبردست مقابلہ کر کے بایزید کے لیے فوج

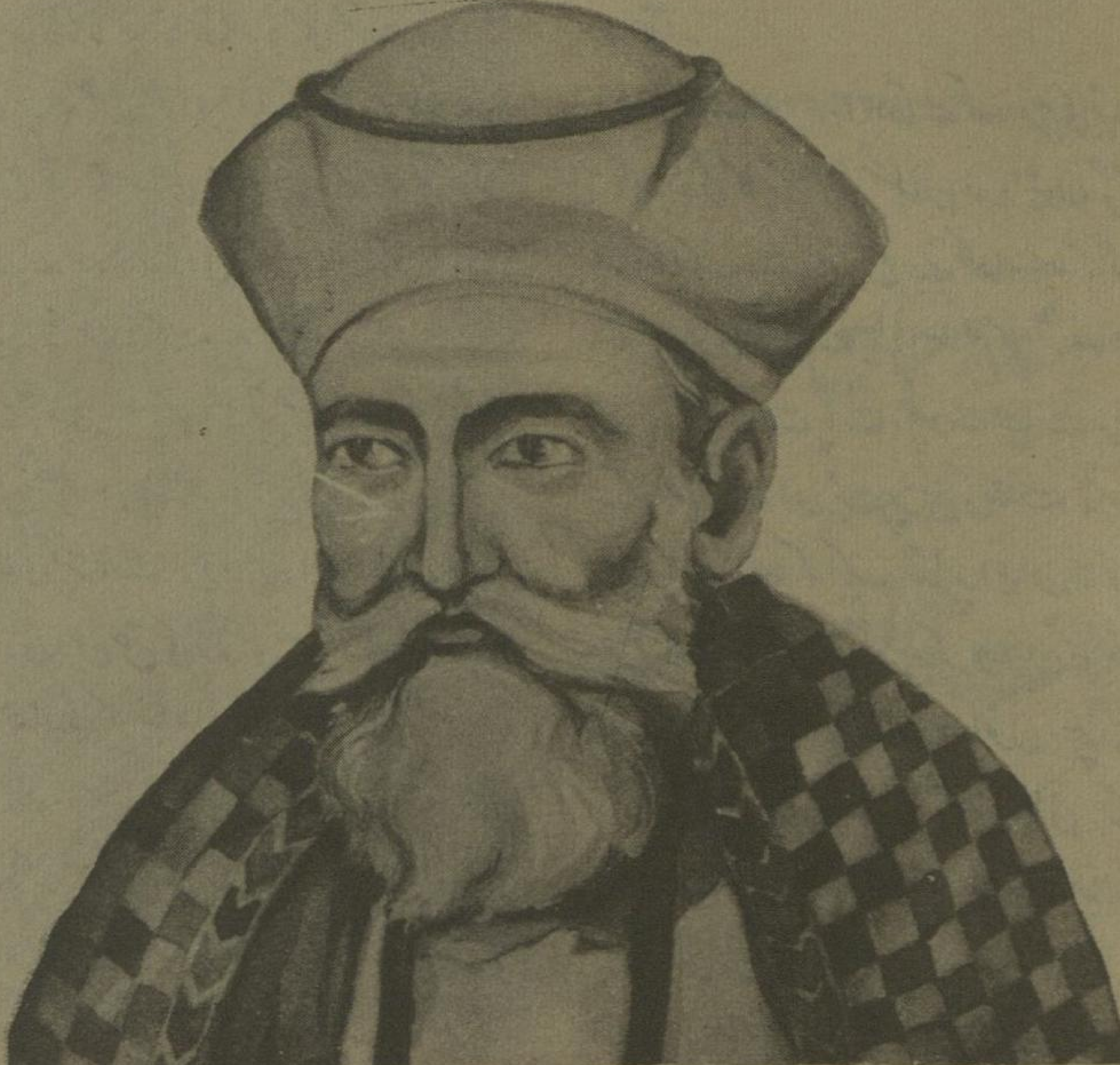
تیار کر لینے کی مہلت مہیا کر دی۔ اس نے کچھ فوج آگے بھیج دی اور خود پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔

اہلِ یورپ کو خبر ملی تو بڑے جوش کے ساتھ ایک دُوسرے سے آگے بڑھ بڑھ کر مقابلے کے دعوے کرنے لگے۔ شاہِ ہنگری کو ترکوں کے طریقِ جنگ کا علم تھا کہ وہ ابتدا میں بے قاعدہ دستوں کو آگے بھیجتے ہیں۔ اس طرح دشمن کی قوت یا صلاحیتِ جنگ کا پُورا اندازہ کر لیتے ہیں تو باقاعدہ فوج کا حملہ ہوتا ہے۔ شاہِ ہنگری نے ساتھیوں کو بہت روکا کہ بے قاعدہ فوج کے مقابلے میں اپنی قوت ضائع نہ کریں، مگر اس کی کون سُنتا تھا۔ ہر یورپی بہادر یہی کہتا تھا کہ اگر مجھے آگے رہنے کا موقع نہ ملا تو میری بہادری کی قدر و قیمت زائل ہو جائے گی۔

۲۵ ستمبر ۱۳۹۶ء کو نکوپولس سے چار میل جنوب میں لڑائی ہوئی۔ جیسا کہ شاہ ہنگری کا خیال تھا، یورپی بہادر اپنا سارا جوش بے قاعدہ ترک دستوں کے مقابلے میں صرف کر چکے تھے۔ بے قاعدہ دستے مقررہ منصُوبے کے مطابق اِدھر اُدھر بکھر گئے تو یورپی جیش آگے بڑھے۔ سامنے سلطان باقاعدہ فوج کی صف بندی کیے کھڑا تھا۔ اُدھر سلطان سے لڑائی شروع ہوئی، اِدھر بے قاعدہ دستوں نے ازسرِنو جمع ہو کر اہلِ یورپ کے عقب سے حملہ کر دیا۔ اس طرح چکّی کے دو پاٹوں میں بڑے بڑے دلیر اور جوانمرد چنوں کی طرح پس گئے، ہزاروں کھیت رہے، باقی گرفتار ہو گئے جن میں پچیس کے قریب شہزادے تھے۔

بایزید انھیں ایشیائے کوچک لے آیا۔ پھر کہا کہ اگر مجھے تم لوگوں کا ڈر ہوتا تو عہد و پیمان لیتا کہ دوبارہ میرے ساتھ جنگ نہ کرنا، لیکن میں تم سب کو دعوت عام دیتا ہوں کہ اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ نئے سرے سے فوجیں تیار کرو۔ راستے کے ہر شخص کو اپنے ساتھ ملاتے جاؤ۔ جب خوب تیار ہو جاؤ تو مجھے پیغام بھیج دینا۔ جہاں کہو گے تمھارا شوقِ جنگ پُورا کرنے کے لیے پہنچ جاؤں گا۔

ان لوگوں میں سے کوئی بایزید کے مقابلے پر پھر نہ آیا۔ نکوپولس کی لڑائی اس وجہ سے حد درجہ اہم ہے کہ اگرچہ اس کے بعد سلطنت عثمانیہ پچاس سال تک مصیبتوں میں پھنسی رہی، لیکن اہلِ یورپ کو اس اثنا میں ترکوں سے جنگ کی ہمت نہ ہوئی۔



ہندو دھرم اسلامی اثر قبول کرتا ہے

مختلف قوموں اور مذہبوں کو ایک دوسرے کے دوبہ پہلو رہنے سہنے کا موقع ملتا ہے تو جس میں قوت اور تاثیر زیادہ ہوتی ہے وہ دُوسروں پر اپنا اثر ڈالتا ہے اور یہ اثر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تھے تو ہندوؤں میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، مثلاً مُورتی پُوجا عام تھی، پروہتوں نے اپنے طور پر جو رسمیں جاری کر دی تھیں، ان کی پابندی پر بہت زور دیا جاتا تھا اور مذہب کی رُوح کے مطابق اپنی زندگی سنوارنے کا کسی کو خیال نہ تھا۔ ذات پات کے بندھنوں نے انسانوں کو سینکڑوں گروہوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اچھے اعمال اور اچھے اخلاق پر کسی کی نظر نہ تھی۔ بڑائی چھٹائی کسی خاص خاندان یا برادری میں پیدا ہونے پر موقوف تھی۔ چھُوت چھات کی وبا ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بعض مقامات میں تو یہ حالت تھی کہ جن لوگوں کو اُچھوت سمجھا جاتا تھا وہ ساٹھ ساٹھ گز تک برہمنوں سے دُور رہنے پر مجبُور تھے۔

اِسلام کی تعلیم بہت سادہ تھی۔ اس میں اُونچ نیچ کی کوئی تمیز نہ تھی۔ سب انسانوں کو برابر سمجھا جاتا تھا اور انسان کی برتری کا معیار یہ نہ تھا کہ وہ کس رنگ کا ہے، کس خاندان میں پیدا ہوا ہے یا کتنا دولت مند ہے۔ صرف پاکیزہ اخلاق اور نیک اعمال

کو بُرائی کی بُنیاد مانا جاتا تھا۔ باہمی محبت، رواداری
اور بے تعصبی پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ توحید کا عقیدہ
اسلام کی رُوح تھا۔ مسلمان بزرگوں نے جگہ جگہ مرکز
قائم کر لیے تھے اور وہ نرم دلی، شفقت اور خوش اخلاقی سے
اسلامی تعلیم کی اشاعت کر رہے تھے۔

آہستہ آہستہ اس کا اثر غیر مسلموں پر بھی پڑنے
لگا۔ ان میں کئی مُصلح (ریفارمر) پیدا ہوئے، جن کی
تعلیم میں اسلامی اثرات موجود ہیں اور صاف معلوم
ہوتا ہے کہ اسی دینِ حق کی روشنی میں انھوں نے اپنے
مذہب کی تعلیمات کو نیا لباس پہنایا تھا۔ ان مُصلحوں
میں سے رامانند، چیتنیا اور گرونانک کے نام خاص
طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

رامانند چودھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے اس
نے بھگتی کی تحریک چلائی۔ وہ ذات پات کے جھگڑوں
سے سخت بیزار تھا۔ سب کو یہی تعلیم دیتا تھا کہ ایک
خدا کی عبادت کرو، باہم محبت اور اتفاق سے رہو۔
تعصب اور تنگ نظری بہت بُری چیز ہے۔ چیتنیا
نے بھی چھوت چھات اور ذات پات کو بالکل چھوڑ
دیا تھا۔

گرونانک (۱۴۶۹-۱۵۳۹ء) سے سکھ دھرم کی بنیاد پڑی۔ گروجی
کی زندگی کا بڑا حصہ مسلمان درویشوں کی صحبت میں بسر
ہوا تھا۔ ایک ہندو مؤرخ نے لکھا ہے کہ گرونانک اور
نام دیو کی تعلیمات میں اسلام کا اثر صاف نمایاں ہے۔
یہ بزرگ ذات پات، چھوت چھات، بہت سے خداؤں
کے عقیدے اور بُت پرستی کی سخت مذمت کرتے تھے
اور کہتے تھے کہ ایک خدا پر ایمان لاؤ، عمل میں اخلاص
برتو اور پاکیزہ زندگی بسر کرو۔ ان کا بنیادی عقیدہ
یہ تھا کہ خدا ہندوؤں، مسلمانوں، چنڈالوں اور برہمنوں
سب کا مالک ہے۔ جو شخص سچائی کے راستے
کا طلب گار ہے اُسے چاہیے کہ ریت رسم اور ذات
پات کی زنجیر کو توڑ ڈالے۔

یہ پاکیزہ اثرات اسلام نے پیدا کیے، جن
سے آہستہ آہستہ ہندومت کی ساکن سطح میں بھی جنبش
ہوئی اور بعد میں جتنی اصلاحی تحریکیں بروئے کار آئیں
ان سب میں ان اثرات کا پرتو موجود تھا۔





ہندوستان میں مُغلیہ سلطنت قائم ہوتی ہے

ہندوستان میں مُغلوں کی سلطنت دُنیا کی چند بڑی بادشاہوں میں گنی جاتی ہے۔ اتنے وسیع اور زرخیز علاقے میں انتہائی جاہ و جلال کے ساتھ اپنا سکّہ چلانے کا موقع بہت کم خانوادوں کو ملا۔ ایسی شاندار یادگاریں بھی بہت کم بادشاہوں نے چھوڑیں، جیسا دہلی کا لال قلعہ، دیوان خاص اور دیوان عام یا آگرے کا تاج محل اور موتی مسجد یا لاہور و کشمیر کے شاندار باغ ہیں۔ مغل سوا تین سو سال تک ہندوستان کے جسم میں زندگی کی رُوح بنے رہے۔ یہاں کے چپّے چپّے پر اپنے نہ مٹنے والے نشان چھوڑ گئے۔ زمین کے بہت سے خطّوں کو جوڑ کر ایک عظیمُ الشان ملک بنایا۔ علم و فضل، تجارت و زراعت، صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن میں اسے عالمگیر شہرت عطا کی۔ اس سلطنت کی بُنیاد بابر نے رکھی تھی۔ (ولادت ۸۸۸ھ = ۱۴۸۳ء، وفات ۹۳۷ھ = ۱۵۳۰ء)

بابر نے پانی پت کی جنگ میں، جو اپریل ۱۵۲۶ء میں ہوئی، دہلی اور آگرے پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن آگرے کے پہلو میں راجپوت بپھرے بیٹھے تھے ان کا کانٹا نکالے بغیر اطمینان کا سانس لینا محال تھا اور تخت کے پائے مضبوطی سے نہ جم سکتے تھے راجپوتوں کا سردار رانا سانگا تھا، جو خود ہندوستان پر چھا جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس فوج اتنی زیادہ تھی کہ بابر کے لیے اس سے عہدہ برآ ہونا بہ ظاہر بہت مشکل نظر آتا تھا، بلکہ شکست کی حالت میں راجپوتانے سے کابل تک زندہ واپس جانا بھی ممکن نہ تھا۔

رانا سانگا نے بہت جلد سوا لاکھ راجپوتوں کو لڑنے مرنے کے لیے تیار کر لیا اور وہ آگرے کی جانب بڑھا۔ بابر کے ساتھ صرف تیرہ ہزار سپاہی تھے۔

آگرے سے تئیس میل پر سیکری کے قریب مارچ ۱۵۲۷ء میں جنگ ہوئی۔ سپاہ کی کمی نے بابر کے ساتھیوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اس نے حالات کا پورا اندازہ کر کے اپنے آدمیوں کے رُوبرُو ایک ایسی تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ تاثیر میں ڈوبا ہُوا تھا۔ اس نے کہا: "بہادرو! جو شخص اس دنیا میں آتا ہے، اس کے لیے موت سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں، وہ ضرور مرے گا۔ سوچو ذلّت کی زندگی سے عزّت کی موت کتنی بہتر ہے۔ ہم مسلمانوں پر خُدا کا یہ بہُت بڑا احسان ہے کہ اس کی راہ میں جان دیں تو شہید بنیں، فتح حاصل کریں تو غازی کہلائیں۔ آؤ سب یک دل اور یک زبان ہو کر حلف اُٹھائیں کہ جب تک دم میں دم ہے، میدان سے پیچھے نہ ہٹیں گے اور عزّت کی موت سے منہ نہ موڑیں گے۔

یہ تقریر سُنتے ہی سب کے حوصلے تازہ ہو گئے۔ لڑائی شروع ہوئی تو بابر کے ساتھی اس ہمّت و جوانمردی سے لڑے کہ دوپہر تک غنیم کے قدم اُکھڑنے لگے۔ پھر خود بابر سواروں کو لے کر بجلی کی طرح راجپوتوں پر گرا اور ان کے ٹڈی دل کو تتر بتر کر کے رکھ دیا۔ بہت سے راجپوت مارے گئے، البتّہ رانا سانگا جان بچا کر بھاگ گیا۔ اس فتح کی یادگار میں بابر کے پوتے اکبر نے مقام جنگ پر فتح پور آباد کیا تھا جو اب تک موجود ہے۔

راجپوتوں کو پھر سر اُٹھانے کا حوصلہ نہ ہُوا ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت مستحکم ہو گئی۔ اکبر کے عہد سے سلطنت کے پھیلنے کا آغاز ہُوا یہاں تک کہ وہ سائبان کی طرح پُورے ہندوستان پر چھا گئی۔

بابر اس فتح کے بعد ساڑھے تین سال زندہ رہا۔ بڑی عجیب شخصیت کا مالک تھا جفاکش ایسا کہ ایک ایک سو میل گھوڑے کی پیٹھ پر نکل جاتا اور ذرا دیر کے لیے بھی نہ رُکتا۔ رحم دل اِتنا کہ جانی دشمن بھی سامنے آجاتا تو اسے خوشی خوشی معاف کر دیتا تھا۔

رفاہِ عامہ کا سکّہ چلتا ہے

دُنیا میں ایسے بادشاہ بھی ہو گزرے ہیں جو عمر بھر تلواریں چلاتے رہے، بڑے بڑے علاقے فتح کیے اور عظیم الشّان سلطنتوں کی بنیاد رکھی مگر آج تاریخ کے صفحات سے باہر ان کے کسی بھی کارنامے کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ان کے برعکس ایسے بادشاہ بھی گزرے ہیں جنھوں نے اپنے عہدِ حکومت کا زیادہ حصّہ خدا کے بندوں کی راحت و آسائش اور فلاح و بہبود میں گزار دیا اور اس وجہ سے لازوال شہرت پائی۔ ان کے کارنامے اب تک ملکوں کے نظم و نسق کا جزو بنے ہوئے ہیں۔ شیر شاہ سُوری اس دُوسری قسم کے بادشاہوں میں سے تھا۔ (بادشاہی ۱۵۴۰-۱۵۴۵ء)۔

وہ ایک معمولی سردار کا بیٹا تھا۔ اپنی دانائی، دُور اندیشی اور جوانمردی سے ہندوستان کے تخت کا مالک بن گیا۔ اُس کی سلطنت شمالی ہند میں سندھ سے بنگال تک پھیلی ہُوئی تھی۔ راجپوتانہ بھی اس میں شامل تھا۔ اگرچہ صرف پانچ سال بادشاہ رہا، لیکن اس تھوڑی سی مُدّت میں بھی اِتنا کام کر گیا کہ دُوسروں کو شاید ایک سو سال میں بھی اس کی توفیق نہ ہوتی۔

شیر شاہ نے مالگذاری کے پُورے نظام کو نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ ہر فصل پر کاشت کیے ہوئے رقبے کی پیمائش ہوتی اور اس کے مطابق مالیہ تجویز کیا جاتا۔ مالیے کے قاعدے ایسے بنا دیئے کہ کوئی سرکاری کارکن کسی کاشتکار کو تنگ نہ کر سکے۔ کاشتکاروں کو حق دے دیا کہ چاہیں تو مالیہ نقد ادا کریں یا اس کے عوض غلّہ دے دیں۔ کاشتکاروں کو وہ سلطنت میں ریڑھ کی ہڈی قرار دیتا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے نظام مالگذاری میں اکبر نے کچھ ترمیمات کیں اور وہی نظام اب تک ہمارے ملک میں جاری ہے۔

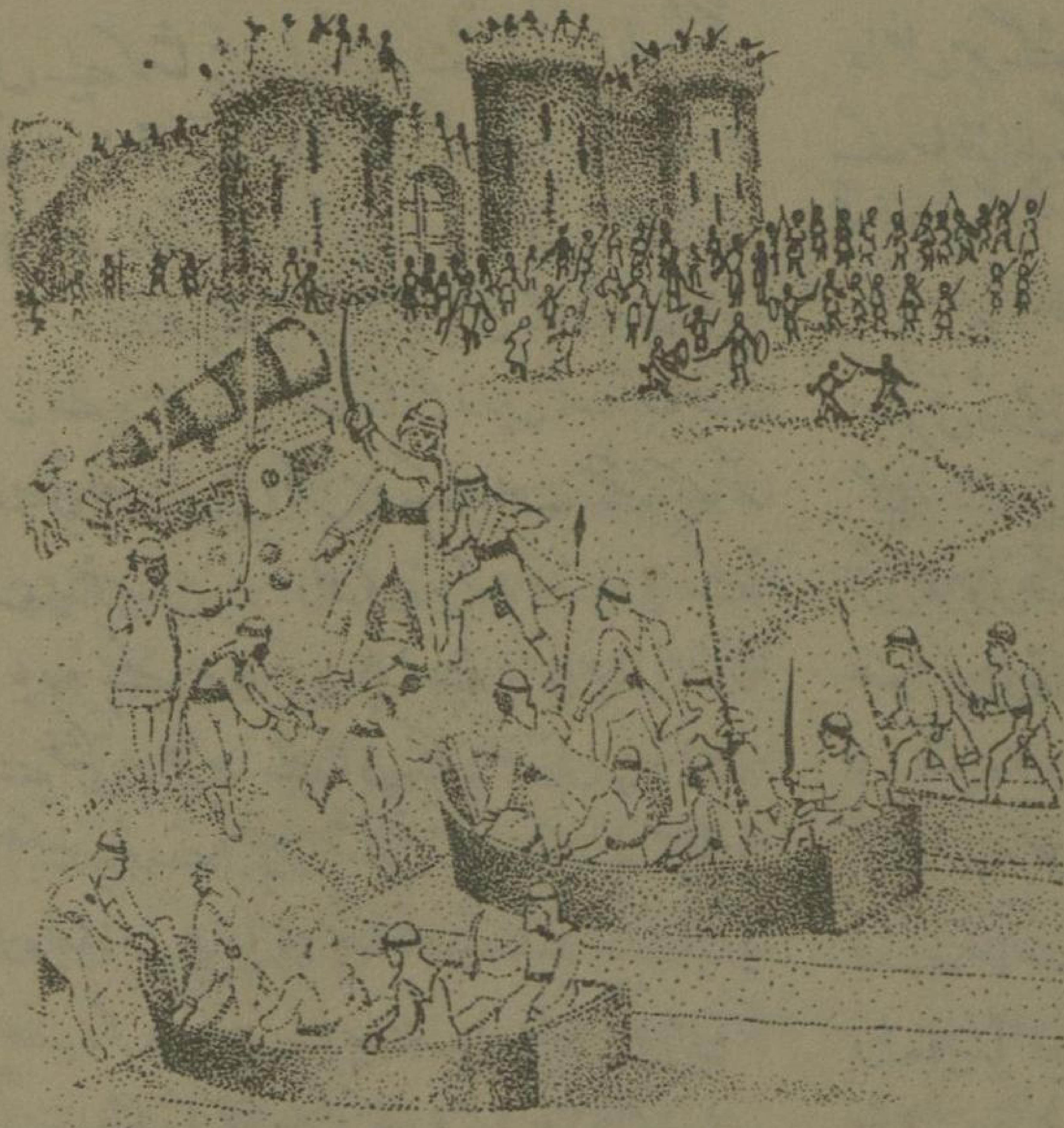
اس زمانے میں فوجی خدمات انجام دینے والوں کو سواروں کی تعداد کے مطابق جاگیریں دی جاتی تھیں۔ وہ لوگ جاگیروں سے فائدہ اُٹھاتے اور ضرورت کے وقت ادھر اُدھر سے گھوڑے جمع کر کے مقررہ تعداد پُوری کر دیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ فوجی خدمت کا کوئی اچھا طریقہ نہ تھا۔ شیر شاہ نے گھوڑوں کے داغ دینے کا طریقہ رائج کیا۔ داغ کے بغیر کسی گھوڑے یا اس کے سوار کو تنخواہ نہ ملتی تھی۔

ملک بھر میں امن قائم کر دیا۔ اگر کہیں چوری، ڈاکے یا قتل کی واردات ہو جاتی تو اس نواح کے تمام سربراہوں اور چودھریوں کو گرفتار کر لیا جاتا اور جب تک وہ اصل مجرموں کو پکڑوا نہ دیتے، رہائی نہ پاتے۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ وہ لوگ خود اپنے علاقوں کی پُوری حفاظت کرنے لگے۔

شیر شاہ نے پُورے ملک میں سڑکوں کا جال بچھا دیا، تاکہ مُسافروں اور سامان لانے، لے جانے والوں کو سہولت رہے۔ ان میں سے تین شاہراہیں بہت مشہور ہیں۔ ایک بنگال سے پنجاب کی شمالی حد تک، دُوسری آگرے سے چتوڑ تک اور تیسری لاہور سے مُلتان تک۔ ان شاہراہوں کے دونوں کناروں پر سایہ دار اور میوے دار درخت لگوائے۔ ہر پڑاؤ پر سرائیں تعمیر کرائیں۔

سراؤں میں پانی کے لیے کنویں تھے۔ ہندوؤں کی عبادت کے لیے مندر، مُسلمانوں کی عبادت کے لیے مسجدیں بنوائیں۔ انھی سراؤں میں ڈاک کی چوکیاں مقرّر کر دی تھیں۔ جگہ جگہ بھروسے کے وقائع نگار تھے، جو سلطنت کے ہر حصّے کی ضروری خبریں براہِ راست بادشاہ کو پہنچاتے تھے جس سے ہر قابلِ توجّہ واقعے کا بادشاہ کو جلد سے جلد علم ہو جاتا تھا





خشکی پر جہاز روانہ ہوتے ہیں

مشرقی رُومی سلطنت کا مرکز قسطنطنیہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے اتنا مستحکم تھا کہ اسے فتح کرنا ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ سُلطان محمّد عثمانی نے ۱۴۵۳ء میں اسے مسخر کیا اور "فاتح" کا پُر فخر لقب اُس کے نام کا جزو بن گیا۔ مسلمان اس سے پیشتر کم و بیش دس مرتبہ زبردست حملے کر چکے تھے۔ وہ شہر کی دیواروں تک بھی پہنچتے رہے اور اپنی مرضی کے مطابق شرطیں بھی منواتے رہے، لیکن شہر ان کے قبضے میں نہ آیا۔

قسطنطنیہ کے جنوب میں بحیرۂ مارمورا واقع ہے، پھر آبنائے باسفورس سے پانی کی ایک شاخ نکل کر چار میل اندر چلی گئی ہے جسے "شاخ زرّیں" کہتے ہیں۔ اس طرح قدرت نے اس کی تین طرفوں میں حفاظت کے ایسے انتظامات کر دیئے تھے کہ انھیں توڑنا آسان نہ تھا۔ خشکی کی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اِدھر یکے بعد دیگرے تین فصیلیں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ زبردست بیڑے کے ساتھ حملہ ممکن تھا، مگر اہلِ قسطنطنیہ نے شاخ زرّیں کے دہانے پر مضبوط فولادی زنجیریں اس ترکیب سے باندھ دی تھیں کہ کوئی اجنبی جہاز ان سے گزر کر اندر نہ جا سکتا تھا۔

سُلطان محمد فاتح پچاس ہزار سوار، بیس ہزار پیادے اور بھاری توپیں لے کر ۶ اپریل ۱۴۵۳ء کو قسطنطنیہ کے سامنے پہنچ گیا اور شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ فصیلوں کو توڑنے کے جتنے طریقے اس زمانے میں رائج تھے، وہ سب استعمال کیے، لیکن کامیابی کی کوئی صُورت پیدا نہ ہوئی۔ اس کے پاس بیڑا تھا جسے باسفورس کی سمت سے شاخ زریں میں پہنچانے کا کوئی بندوبست ہو سکتا اور شہر پر دو طرف سے حملہ ہو جاتا تو فتح کی اُمید تھی۔ خصوصاً

اس لیے کہ شاخِ زریں کی طرف فصیل نہ زیادہ اُونچی تھی اور نہ خندق مضبُوط تھی، لیکن شاخ زریں کے دہانے سے گزرنے کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔

سوچتے سوچتے ایک عجیب تجویز اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے باسفورس سے شاخ زریں تک ایک خندق کُھدوائی اور اس میں لکڑی کے صاف تختے بچھوا کر ان پر خوب چربی لگوا دی، تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ چکنے ہو جائیں۔ پھر اپنے اسّی جہاز باسفورس سے خشکی پر چڑھا لیے اور چکنے تختوں پر سے دھکیلتے ہُوئے انھیں شاخِ زریں کے اندر پہنچا دیا۔ ان جہازوں پر سپاہی بٹھا دیئے گئے اور توپیں بھی نصب کر دی گئیں۔ اچانک یہ بیڑا خشکی میں سے گزرتا ہُوا شاخ زریں کے اندر پہنچ گیا، اور گولوں کا مینہ برسنے لگا تو اہلِ شہر ہمت ہار بیٹھے۔ وہ بچاؤ کے لیے شاخ زریں کی طرف پلٹے تو خشکی کی جانب سے سُلطانی سپاہ نے فصیلیں توڑ کر اندر داخل ہونے کا راستہ صاف کر لیا۔

۲۹ مئی کی صُبح کو نماز کے بعد سُلطان نے عاجزی سے بارگاہِ الٰہی میں دُعائیں کیں۔ پھر فوج کے مختلف حصّے شہر میں داخل ہو گئے۔ خود سُلطان بھی دس ہزار سواروں کے ساتھ اندر گیا۔ ظہر کی نماز شہر میں ادا کی اور قسطنطنیہ کی فصیل پر ہلالی جھنڈا نصب ہو گیا۔

یہ واقعہ مختلف وجوہ سے بے حد اہم ہے۔ مشرقی رُومی سلطنت کا نشان ہمیشہ کے لئے مِٹ گیا، جسے یورپ کے اندر پیش قدمی کرنے والی ترکی فوجوں کے پہلو میں خنجر کی حیثیت حاصل تھی اور تھوڑی ہی مدّت میں فتح مند ترکوں کے پھریرے ویانا کی دیواروں تک پہنچ گئے۔ قسطنطنیہ مسیحیت کی جگہ اسلام کا مایۂ ناز مرکز بن گیا اور پانسو سال تک اُسے خلافت کی تختگاہ ہونے کا شرف حاصل رہا۔ ایشیا اور افریقہ مدّتِ دراز کے لیے یورپ کے خطرے سے محفوظ ہو گئے۔ "مشرق قریب" میں جنگی نقطۂ نگاہ سے جتنے مقامات اہم تھے، وہ سب مُسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ قسطنطنیہ اس سلسلے کا آخری مقام تھا۔ بحیرۂ اسود، آبنائے باسفورس، مارمورا، درّۂ دانیال، بحیرہ رُوم اور بحیرۂ قلزم سب مسلمانوں کے زیرِ اقتدار آ گئے۔

ترکی ایک عظیم الشان بیڑا تیار کرتا ہے

مشرق اور مغرب کے درمیان بحری تجارت صدیوں تک مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی۔ وُہی تھے جنھوں نے جان پر کھیل کر اتھاہ سمندروں کے سینے چیرے اور جہازوں کے لیے راستے بنائے۔ وہی تھے جنھوں نے سمندر کے راستے چین پہنچ کر مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملائے۔ ایک عرب ملّاح ہی تھا جس نے کولمبس کو "نئی دُنیا" کا راستہ دکھایا۔ ایک عرب ملاح ہی تھا جس نے واسکوڈی گاما کو افریقہ کے مشرقی ساحل سے ہندوستان پہنچایا۔

قومی اور انسانی خدمت کا کون سا دائرہ ہے جس میں وہ سب سے آگے نکل جانے کے لیے سرگرمِ عمل نہ ہوئے! خیرالدین باربروسا کو دیکھو، اس نے سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں کیسی کچھ شہرت پائی۔ اس وقت فرنگستان کے بحری قزّاقوں نے بحیرۂ رُوم کے شمالی ساحل پر جا بجا اڈے بنا رکھے تھے اور تجارتی جہازوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی یورپی حکمرانوں کی مدد سے شمالی افریقہ کی اسلامی آبادیوں پر بھی چھاپے مارجاتے تھے۔ خیرالدّین اور اس کے بھائی نے کسی خاص امداد کے بغیر تنہا ان کا مقابلہ کیا اور ان کی قوّت توڑ کر رکھ دی۔ مسلمانوں کو ہسپانیہ سے نکال دیا گیا تھا تو وہ یا ساحلی علاقوں میں مصیبتیں اُٹھا رہے تھے یا مختلف جزیروں میں پہنچ گئے تھے۔ یہاں ان کے لیے زندگی اجیرن ہو رہی تھی۔ خیرالدین ہی تھا جس نے ہمّت کی اور دشمنوں سے لڑ بھڑ کر ہزاروں مسلمانوں کو شمالی افریقہ پہنچایا، تاکہ وہ اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ جب سلیمان اعظم کو ایک عظیم الشان بیڑا بنانے کا خیال آیا، تو خیرالدین ہی کو اس مقصد کے لیے چُنا اور اسے "کپتان پاشا" کا خطاب عطا کیا۔

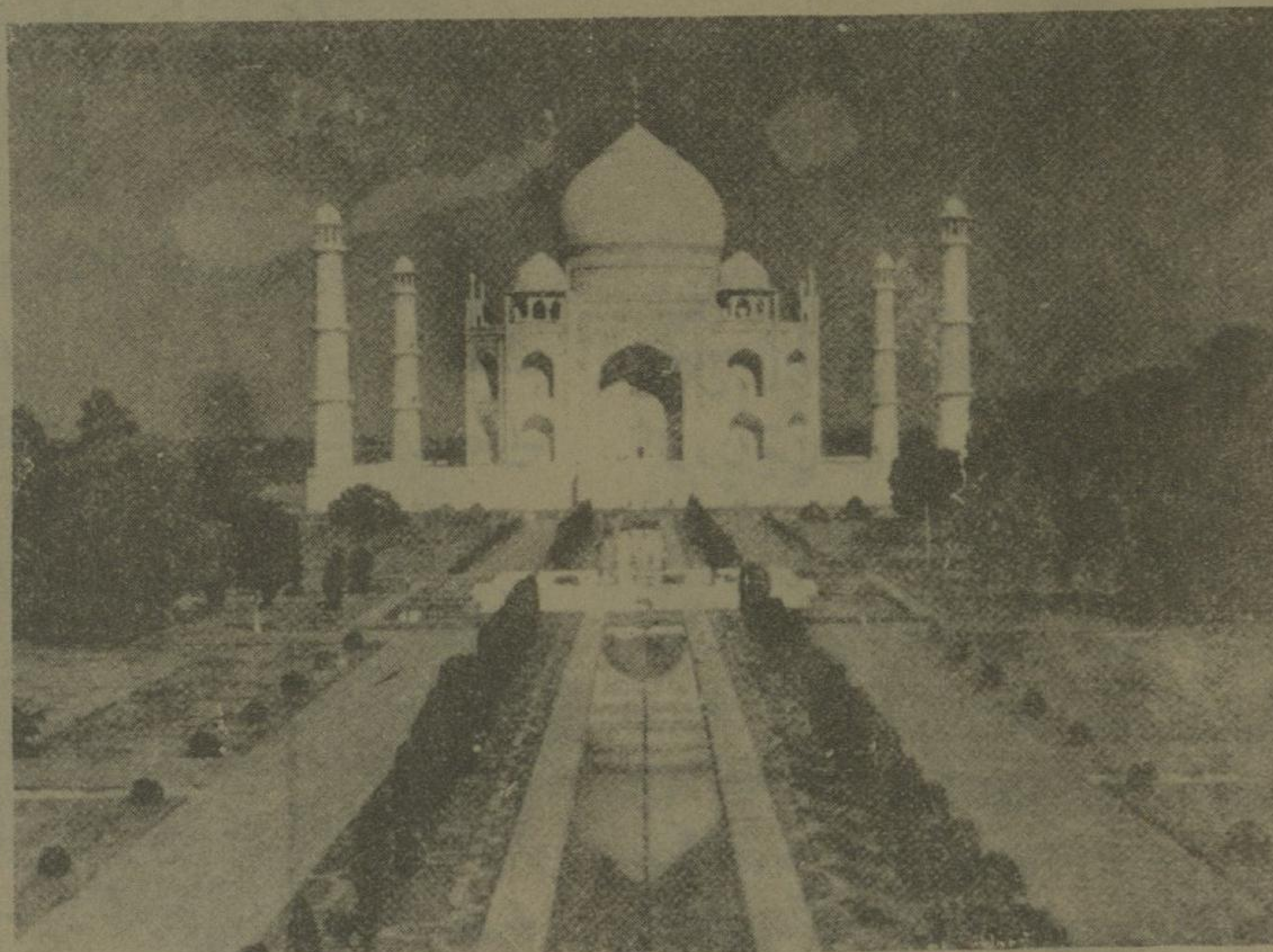
خیرُالدین کا اصلی نام خضر تھا، وہ ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے میں پیدا ہوُا۔ اس کے والد یعقوب نے چند کشتیاں بنا رکھی تھیں جن میں تجارتی مال لاد کر جا بجا پہنچاتا۔ والد کی وفات کے بعد خیرالدین اپنے تین بھائیوں کے ساتھ اُجرت پر کشتیاں ہی چلاتا رہا۔ پھر انھوں نے چھوٹے چھوٹے جہازوں کا بندوبست کر کے تونس میں سکونت اختیار کر لی جہاں فرنگستانی قزاقوں کے مقابلے میں غیر فانی شہرت حاصل کی۔ ۱۵۳۰ء میں سلطان سلیمان نے اسے قسطنطنیہ بُلالیا۔

چار سال کی محنت کے بعد اس نے اپنی نگرانی میں ایک بیڑا تیار کرایا اور اسے لے کر ۱۵۳۴ء میں آبناؤں سے گزرتا ہُوا بحیرۂ رُوم میں جا پہنچا۔ وہ آبنائے سینا تک بڑھا چلا گیا، لیکن کسی کو مقابلے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس زمانے میں

یورپ والے آندریہ دوریا کو بہت بڑا بحری کمانڈار مانتے تھے۔ چنانچہ کئی بادشاہوں نے ایکا کر کے ایک بیڑا دوریا کی کمان میں دے دیا کہ خیرالدّین کا مقابلہ کرے۔ اس وقت عثمانی فوجیں بلقان میں لڑ رہی تھیں۔ خیرُالدّین نے جب سُنا کہ دوریا مقابلے کے لیے نکلا ہے تو وہ ایک سو پینتیس جہازوں کا بیڑا لے کر بلاخطر بحیرۂ ایڈریاٹک میں داخل ہو گیا، جہاں دوریا دبکا بیٹھا تھا۔ خیرالدین نے فوج بلقانی ساحل پر اُتار دی۔ مگر دوریا کو مقابلے پر آنے کا حوصلہ نہ ہُوا۔

اس زمانے میں ترکی بیڑے کی دھاک ہر طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ ۱۵۳۹ء میں فرانس کے بادشاہ نے سلیمان سے امداد طلب کی۔ سلطان نے خیرالدّین کو بھیج دیا۔ وہ اٹلی کے ساحلی علاقوں پر گولے برساتا ہُوا مرسائی[۱] پہنچ گیا جو جنوبی فرانس کی مشہور بندرگاہ ہے۔ شاہِ فرانس نے حکم دے دیا کہ جب تک ترکی بیڑا مرسائی میں موجود ہے، کسی گرجے میں گھنٹہ نہ بجایا جائے۔ ۱۵۴۶ء میں خیرالدین نے وفات پائی۔ جنازہ اُٹھا تو سارے جہاز سلامی کی توپیں داغ رہے تھے۔ مُدّت تک یہ دستور رہا کہ جب ترکی بیڑا باہر جاتا یا باہر سے واپس آتا تو خیرالدّین کی قبر کے سامنے پہنچتے ہی سلامی کی توپیں سر کی جاتی تھیں۔

۱۔ یہ وہی مقام ہے جسے عام لوگ مارسیلز کہتے ہیں۔ صحیح تلفّظ مرسائی ہے جو سامی الاصل معلوم ہوتا ہے۔ مرسی یعنی بندرگاہ۔



دُنیا کا یگانہ مقبرہ بنتا ہے

تاج محل ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہ جہاں کی چہیتی بیگم کا مقبرہ ہے، جس میں وہ بعد ازاں خود بھی دفن ہوا۔ آج رُوئے زمین پر جتنی عمارتیں موجود ہیں، نقشے کی دل آویزی، عمارت کی خوبصورتی اور نزاکت، گُل کاری اور شان و شکوہ میں کوئی تاج کے مقابلے پر نہیں آسکتی اور جب سے دُنیا آباد ہوئی ہے ایسا مقبرہ آج تک بنایا نہیں جاسکا۔ جب تک تاج موجود ہے، آگرہ دُنیا بھر کے سیّاحوں کی زیارت گاہ بنا رہے گا۔

دیدہ ور دل، نے اس عمارت کی تعریف میں جو کچھ کہا ہے اسے جمع کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ کسی نے کہا کہ اس کے اُوپر کانچ کا سرپوش رکھ دینا چاہیئے۔ کسی نے کہا یہ مقبرہ نہیں، ایک مرمریں خواب ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ چاندنی رات میں اس خالص موتی کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سنگِ مرمر پانی سے زیادہ رواں دواں ہے اور وہاں ایک دم کے لیے ٹھہر جانا ہمیشگی سے زیادہ پائدار ہوتا ہے۔ یہ عمارت نہیں بلکہ ایک صاحبِ دل شہنشاہ کے عشق و محبّت نے اپنے راز کے چہرے سے پردہ اُٹھا دیا ہے اور پتھروں کو نوکِ مژگاں سے پرو کر پیوستہ کر دیا ہے۔

شاہ جہاں کی بیگم ممتاز محل نے دکن سے واپس ہوتے ہُوئے برہان پُور کے قریب انتقال کیا۔ (۱۰۴۰ھ = ۱۶۳۱ء) بادشاہ کے لیے یہ سانحہ اس درجہ غم افزا ثابت ہُوا کہ ایک ہی سال میں بال سفید ہو گئے۔ اپنا غم غلط کرنے کے لیے مقبرے کی تعمیر شروع کر دی۔

اور سترہ سال کی محنت و مشقّت کے بعد یہ نادرِ روزگار عمارت نہایت اعلیٰ سنگِ مرمر سے تیار ہوئی۔

ایک نہایت خوبصورت باغ کے وسط میں اُونچا چبوترہ ہے جس کے چاروں کونوں پر سنگ مرمر کے چار مینار کھڑے ہیں۔ اس چبوترے کے عین وسط میں مقبرے کی عمارت ہے جس نے ایک سو چھیاسی فٹ مربع جگہ گھیر رکھی ہے۔ مقبرے کے اُوپر اسّی فٹ اُونچا مرمریں گنبد ہے جس کی چوٹی پر خالص سونے کا درخشاں کلس چمک رہا ہے۔ اس گنبد کے گرد چار چھوٹے گنبد اور ہیں۔

اندر اور باہر در و دیوار پر عقیق، یشب، لاجورد اور دُوسرے قیمتی پتھروں کے پھول اور بیل بوٹے اس خوبصورتی سے دیواروں میں جڑے گئے ہیں، کہ موجُودہ زمانے کے کاریگر انھیں دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ پھولوں کی پنکھڑیوں میں رنگ رنگ کے نگینے پیوست ہیں اور ان کے جوڑ اس خوبی سے ملائے گئے ہیں کہ ناخن بھی پھیریں تو کہیں نہیں رُکتا۔ گویا اندر اور باہر کی پوری عمارت ایک سانچے میں ڈھلی ہے۔

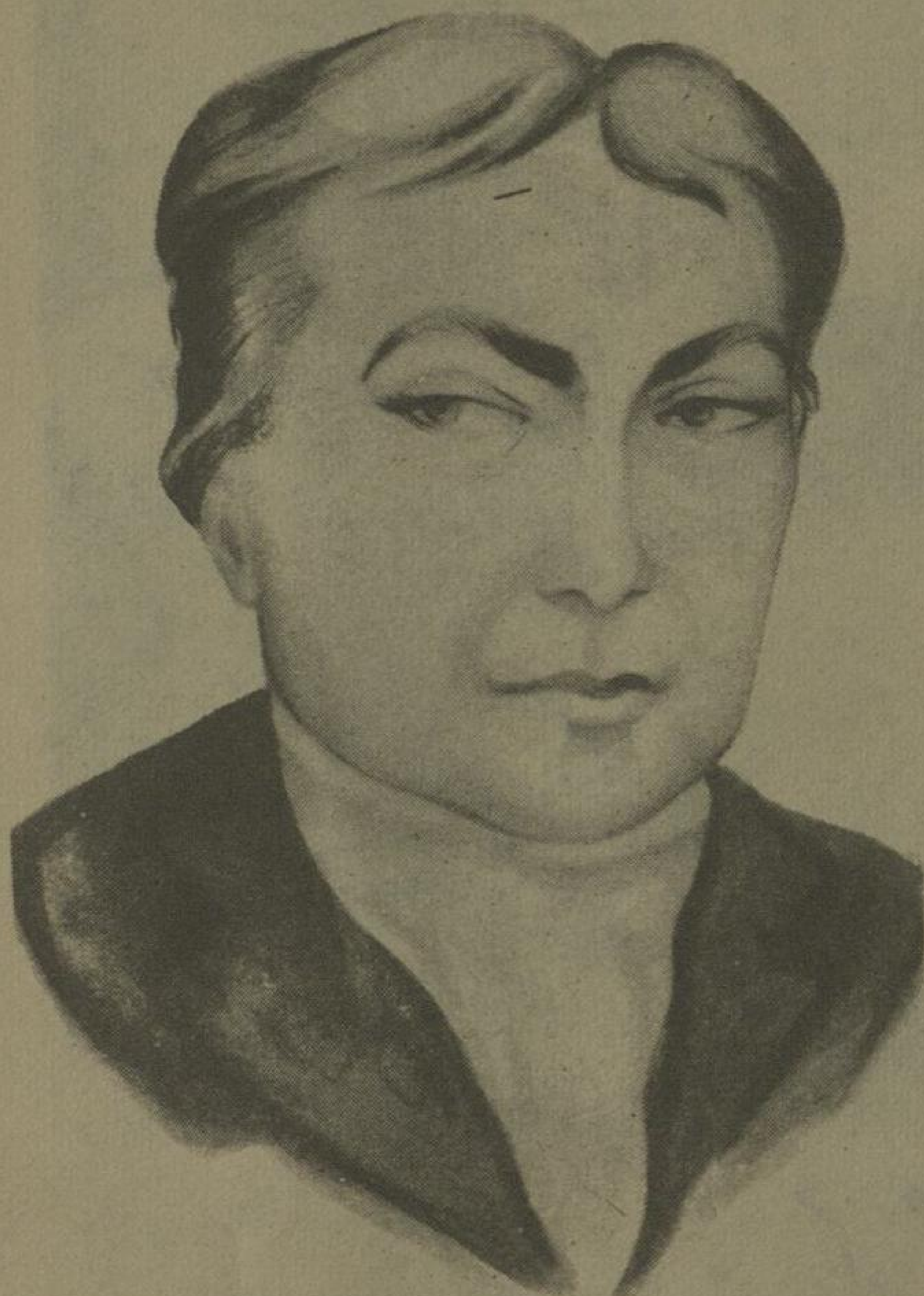
محرابوں اور دیواروں پر قرآن مجید کی آیتیں نہایت خوبصورتی سے کھُدی ہوئی ہیں اور ان میں سنگ مُوسیٰ کے حرُوف بٹھا دیے گئے ہیں۔

درمیانی ہال میں تعویذ کے گرد سنگِ مرمر کی جالی اتنی نفیس ہے کہ دیکھیں تو یقین نہیں آتا کہ اسے انسانی ہاتھوں نے بنایا ہوگا۔ اس کی باریک بیلیں، نازک سُرخ پھول، خوش وضع سبز پتّیاں، سنہری نقش و نگار۔ بس یُوں سمجھیے کہ انسان وہاں پہنچ کر حیرت کی تصویر بن جاتا ہے۔

ایسے مقبرے کا تصوّر بھی انسانی تخیّل کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا، پھر اس تصوّر کو سنگِ مرمر کا لباس پہنا کر محبت کا ایک جیتا جاگتا پیکر بنا کر کھڑا کر دینا یقیناً صنّاعی کا ایسا کمال تھا جو خُدا نے صرف شاہ جہاں کو عطا کیا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی کو یہ شرف نصیب نہ ہُوا۔

شاہجہان کا کارنامہ صرف تاج محل ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی کئی عمارتیں ایسی ہیں جن کے لیے دنیا بھر کے دیدہ ور تین صدیوں سے خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ مثلاً دہلی کی رفیع الشان جامع مسجد، لال قلعہ، قلعہ آگرہ کی موتی مسجد، لاہور کا شالامار باغ، کابل میں باغ بابر والی مسجد، جو مہم بلخ میں کامیابی حاصل کرنے پر یادگار کے طور پر بنائی گئی تھی۔ یہ مسجد خالص سنگ مرمر کی ایک نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ ان عمارات کے علاوہ تختِ طاؤس کی یاد تازہ کرو۔ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ ویسا تخت آج تک دُنیا کے کسی بادشاہ کو نصیب نہ ہُوا۔ ذرا تصوّر کرو جب لال قلعے کے دیوان خاص میں یا دیوان عام کی شاہی نشست گاہ میں بادشاہ تختِ طاؤس پر جلوس فرماتا ہوگا تو دیکھنے والوں پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہوگی۔

تاہم ان میں سے کوئی چیز بھی تاج محل کے برابر عظمت و شہرت حاصل نہ کر سکی۔ یہ مقبرہ جب بنا تھا اس وقت بھی یگانہ تھا، آج بھی یگانہ ہے اور آیندہ بھی ایسا مقبرہ بننے کی کوئی اُمید نہیں۔



چیچک کا عِلاج دریافت ہوتا ہے

چیچک بہت پُرانی بیماری ہے۔ تاریخوں میں بتایا گیا ہے کہ وبائی صُورت میں اس کا آغاز ۴۴۵ء میں ہوُا۔ ۵۶۹ء میں یہ وبا قسطنطنیہ پہنچی۔ اس سے کچھ مدّت بعد یمن کے حبشی حاکم ابرہہ نے مکّہ شریف پر حملہ کیا، لیکن اس کا لشکر مکّہ شریف کے قریب پہنچتے ہی، خدا کی قدرت سے تباہ ہوگیا اور اسے نامراد لوٹنا پڑا۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ابرہہ کے لشکر میں بھی چیچک کی وبا پھیل گئی تھی۔

بہرحال اس میں شُبہ نہیں کہ دسویں صدی عیسوی میں یہ وبا مشرق ادنیٰ اور مشرق اوسط میں عام ہو چکی تھی اور طبیب اس کے علاج سے عاجز تھے۔ اس موقع پر اسلام کے مشہور طبیب حکیم اُبوبکر محمدؒ بن زکریاؒ رازی نے چیچک کا کامیاب علاج تجویز کیا۔ اس مرض پر ایک مستقل کتاب لکھی جس میں مرض کے تمام پہلوؤں پر مفصّل بحث کی۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی تک مشرق میں حکیم محمد بن زکریا کے تجویز کیے ہُوئے علاج سے بے شمار آدمی صحت یاب ہوتے رہے۔ حکیم موصُوف کی یہ کتاب چھپ چُکی ہے اور آج بھی انسانیت کے اس محسن کی عظمت کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ طبّی دُنیا میں وہ پہلا شخص ہے جس نے چیچک کا علمی علاج دریافت کیا اور اس کا اعتراف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی کیا گیا ہے۔

اٹھارھویں صدی میں ایڈورڈ جینر نام ایک انگریز نے چیچک کا علاج دریافت کرنے کی طرف توجّہ کی۔ وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے پر غور کرنے اور اس کی تہ تک پہنچنے کا عادی تھا۔ علاج کی دریافت کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ گلاؤسٹر شائر کے لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ گئو تھن سیتلا چیچک کا تریاق ہے، اس لیے کہ جو لوگ گائیوں کا دُودھ دوہتے تھے، وہ عموماً چیچک کی بیماری سے بچے رہتے تھے۔ بس اس عقیدے کی بنا پر جینر چھان بین کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ گئو تھن سیتلا دو قسم کی ہوتی ہے اور ان میں سے صرف ایک قسم چیچک کو روکتی ہے۔

جینر نے ۱۷۹۶ء میں گئو تھن سیتلا سے مادہ لے کر اپنے بچے کو ٹیکا لگایا پھر دو مہینے بعد چیچک کا مادہ ٹیکے کے ذریعے سے بچّے کے جسم میں داخل کر دیا اور وہ بالکل تندرست رہا۔ بس اس تجربے کی بنا پر وہ ٹیکا ایجاد ہُوا جو گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں کروڑوں آدمیوں کی جانیں چیچک جیسی موذی وبا سے بچا سکا ہے۔ جینر کا یہ احسان دُنیا کبھی نہیں بُھلا سکتی، لیکن اس سے آٹھ سو سال پیشتر جس طبیب نے چیچک کو روکنے کی تدبیریں مکمّل کی تھیں، اس کی یاد بھی برابر تازہ رہنی چاہیئے۔



ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

دُنیا میں ایسے آدمی بہت کم ہوتے ہیں جن کے سامنے کوئی بلند مقصد ہو اور وہ اس کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دینے میں بھی تامّل نہ کریں۔ ایسے ہی آدمیوں سے قوموں کی زندگی کے چراغ روشن رہتے ہیں اور ایسے ہی آدمیوں سے ملکوں کی تاریخیں بنتی ہیں۔ ٹیپو سلطان شہید اسی صف کے ایک ممتاز مجاہد تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "شیر کی زندگی کا ایک دن گیدڑ کی زندگی کے ایک سو سال سے بہتر ہے۔" یہ مقولہ بالکل درست ہے۔ انسان کے لیے یہی زیبا ہے کہ شیر کی طرح زندگی بسر کرے۔ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے ہر خطرے کے سامنے چٹان کی طرح جم جائے۔ اپنا شکار آپ مارے اور اپنی ضرورتیں خود پوری کرے۔ گیدڑ کی زندگی کیا ہے؟ نہ کسی کے مقابلے کی ہمّت، نہ کسی سے ٹکر لینے کا حوصلہ۔ پتّا بھی کھڑکے تو دل کانپ اُٹھے۔ ہوا کا جھونکا آئے تو رُوح لرز جائے۔ شیر شکار مار کر جو کچھ چھوڑ جائے، اس سے پیٹ بھر لیتا ہے۔ ورنہ بھُوکا رہتا ہے۔

ٹیپو سلطان (۱۱۶۳-۱۲۱۳ھ = ۱۷۵۲-۱۷۹۹ء) کے والد حیدر علی نے بارھویں صدی ہجری کے اواخر (اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل) میں جنوبی ہند میں ایک بڑی سلطنت قائم کر لی تھی، جس کا صدر مقام سرنگاپٹم تھا اور جو سلطنت میسور کے نام سے مشہور تھی۔ حیدر علی پہلا شخص تھا جس نے بھانپ لیا تھا کہ جو فرنگی، تاجروں کے بھیس میں ہندوستان آئے ہیں اور اُنھوں نے مُلکی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا ہے، اگر انھیں قدم جما لینے کا پُورا موقع مل گیا تو پُورے ملک کے لیے ایک خوفناک خطرہ بن جائیں گے۔ حیدر علی نے فرنگیوں کے خطرہ کو مٹا دینے میں

کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ لڑ رہا تھا کہ خدا کی طرف سے بُلاوا آگیا اور وہ اپنے جگر بند کے لیے دو ورثے چھوڑ کر رُخصت ہو گیا: ایک تاج و تخت اور دُوسرا فرنگیوں کے خطرے کا انسداد۔ ٹیپو سلطان نے دونوں ورثے جوانمردی سے سنبھالے۔ تاج و تخت کی حفاظت اور فرنگیوں کی شکست و ریخت میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا، یہاں تک کہ اپنی قیمتی جان بھی اس بازی میں لگا دی۔

فرنگیوں سے اسے دو زبردست لڑائیاں پیش آئیں۔ اگر اُنھیں مرہٹوں اور نظام کی امداد نہ ملتی تو سلطان یقیناً ان کے اقتدار کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیتا، لیکن دونوں مرتبہ مرہٹوں اور نظام نے نہ صرف سُلطان سے، بلکہ ملک کے بہترین مقاصد سے غدّاری کی۔ آخری لڑائی میں فرنگیوں، مرہٹوں اور نظام نے سُلطان کے مرکزِ حکومت کا محاصرہ کر لیا۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو اس شیر دِل مجاہد نے میسور کی سلطنت اور ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑتے ہُوئے شہادت پائی۔ مرہٹوں اور نظام نے جن فرنگیوں کو مدد دے کر ٹیپو سُلطان کو شہید کرایا تھا، اُنھیں کے ہاتھوں وہ خود بھی برباد ہوئے اور قُدرت نے بدلے کا جو قانون مقرّر کر رکھا ہے، وہ پُورا ہو کر رہا۔

عزّت کی زندگی کے دو ہی راستے ہیں:
جواں مردوں کی طرح زندہ رہنا یا جواں مردوں کی طرح جان دے دینا۔ ٹیپو سُلطان نے اپنے اہلِ وطن کے سامنے ۱۷۹۹ء میں یہی نمونۂ عمل پیش کیا تھا۔ اس کی شہادت کے بعد فرنگی ہنستے کھیلتے پُورے ملک پر قابض ہو گئے، لیکن سلطان شہید نے آزادی کی جس آگ کا سامان کر دیا تھا، وہ برابر سُلگتی رہی۔ کبھی کبھی یہ آگ بھڑک بھی اُٹھتی تھی۔ آخر کار اس نے اجنبیوں کے اقتدار کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ گویا سلطان نے جو خواب دیکھا تھا، وہ ڈیڑھ سو سال کے بعد پُورا ہُوا۔ آج نظام اور مرہٹوں کا کوئی نام بھی نہیں لیتا، لیکن ٹیپو سلطان نے خونِ شہادت سے عزّت کی زندگی کا جو نقش جمایا تھا وہ پُوری آب و تاب سے چمک رہا ہے اور جب تک دُنیا باقی ہے برابر چمکتا رہے گا۔

کشمیر گلاب سنگھ کے ہاتھ بکتا ہے

پنجاب میں سکھوں کی حکومت کا شیرازہ رنجیت سنگھ کی موت کے ساتھ ہی بکھرنے لگا تھا۔ پانچ چھ سال تک سکھ سردار باہم لڑتے اور ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارتے رہے۔ آخر ایسی حالت پیدا ہوگئی کہ سپاہ قابو میں نہ رہی ۱۸۴۵ء میں جو لوگ انتظام کے مختار بنے تھے اُنھوں نے سپاہ کی سرکشی سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک عجیب تدبیر سوچی، یعنی اُسے برانگیختہ کرکے انگریزی علاقے پر حملہ کرادیا۔ اس طرح انگریزوں اور سکھوں کے درمیان پہلی جنگ چھڑی۔ تھوڑی ہی مدت میں سکھ شکست پر شکست کھاکر بدحال ہو گئے اور انگریزی سپاہ دریائے ستلج کو پار کرکے سکھوں کے علاقے میں داخل ہوگئی۔

اب سب پر پریشانی طاری ہوگئی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لڑائی بند کرانے کی تدبیر کیا ہوسکتی ہے۔ جموں کے حاکم گلاب سنگھ ڈوگرہ نے لڑائی میں کوئی حصہ نہ لیا تھا اور خفیہ خفیہ اپنا تعلق انگریزوں سے قائم کر رکھا تھا۔ اُسے بلایا گیا کہ انگریزوں سے صلح کی بات چیت کرے۔ آخر گلاب سنگھ کی کوشش سے فیصلہ ہوا کہ ستلج اور بیاس کا درمیانی علاقہ انگریزوں کے حوالے کردیا جائے۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ کروڑ کی رقم بطور تاوان ادا کی جائے خزانے میں اتنی رقم نہ تھی۔ سکھوں کی طرف سے جو لوگ مختار تھے، اُنھوں نے کہا کہ اڑسٹھ لاکھ روپے گلاب سنگھ کے ذمے واجب الادا ہیں، یہ اس سے لے لیے جائیں۔ باقی رقم قسطوں میں ادا کردی جائے گی۔ انگریز گورنر جنرل نے جواب دیا کہ ہم دربار اور اس کے کارندوں کے پرانے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ گورنر جنرل کے آدمیوں نے پہلے ہی سے خُفیہ خُفیہ گلاب سنگھ کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا۔ اس کے مطابق دربار سے کہا گیا کہ دریائے بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان جتنا پہاڑی علاقہ ہے، وہ ایک کروڑ روپے کے معاوضے میں انگریزوں کے حوالے کردیا جائے۔ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو سکھوں سے عہد نامہ ہوا اور ستلج و بیاس کے درمیانی علاقے کے علاوہ وہ پہاڑی علاقہ بھی لے لیا گیا جس میں بالائی ہزارہ، کشمیر، جموں، چمبہ وغیرہ شامل تھے۔ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزوں نے گلاب سنگھ کے ساتھ جموں، کشمیر اور بالائی ہزارہ کا سودا ایک کروڑ پر کرلیا۔ امرت سر میں اس عہد نامے پر دستخط ہوتے تو گلاب سنگھ نے گورنر جنرل کے رُوبرُو ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میں تو انگریزوں کا زرخرید غلام ہوں۔

لاکھوں بندگانِ خُدا کو بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کر دینے کے اس واقعے کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی. خود بعض انگریز بھی جن میں راستی یا غیرت کا کچھ احساس تھا، اقرار کرتے رہے کہ یہ سودا انگریزوں کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے. طُرفہ تر امر یہ ہے کہ گلاب سنگھ کو اپنے پاس سے کوئی رقم نہ دینی پڑی، وہ اس طرح کہ:

۱۔ سکھ دربار کا دعویٰ تھا کہ جمّوں کے صُوبیدار کی حیثیت سے اڑسٹھ لاکھ روپے گُلاب سنگھ کے ذمّے تھے ۔ اس میں شُبہ نہیں کہ جب سکھّوں نے انگریزوں سے لڑائی شروع کی اور گلاب سنگھ پر امداد کے لیے زور ڈالا تو وہ اڑسٹھ لاکھ روپے پیش کرنے پر آمادہ تھا۔

۲۔ ابتدا میں یہ طے ہوا تھا کہ دریائے راوی اور دریائے سندھ کے درمیان کا پُورا پہاڑی علاقہ گلاب سنگھ کو دے دیا جائے جس میں چمبہ بھی شامل تھا۔ پھر چمبہ اور اس کا علاقہ الگ کر لیا گیا۔ علاقے میں یہ کمی کی گئی تو تاوان کی رقم بھی ایک کروڑ سے گھٹا کر پچھتر لاکھ کر دی گئی۔

۳۔ گلاب سنگھ کے بھائی سوچیت سنگھ نے اپنی زندگی میں پندرہ لاکھ روپے کی رقم فیروزپور میں زمین میں دبا رکھی تھی وہ انگریزوں کے قبضے میں تھی۔ اُنھوں نے یہ پندرہ لاکھ روپے بھی تاوان میں شامل کر لیے۔ اس طرح گلاب سنگھ کو صرف دس لاکھ اشرفی ادا کرنی پڑی۔

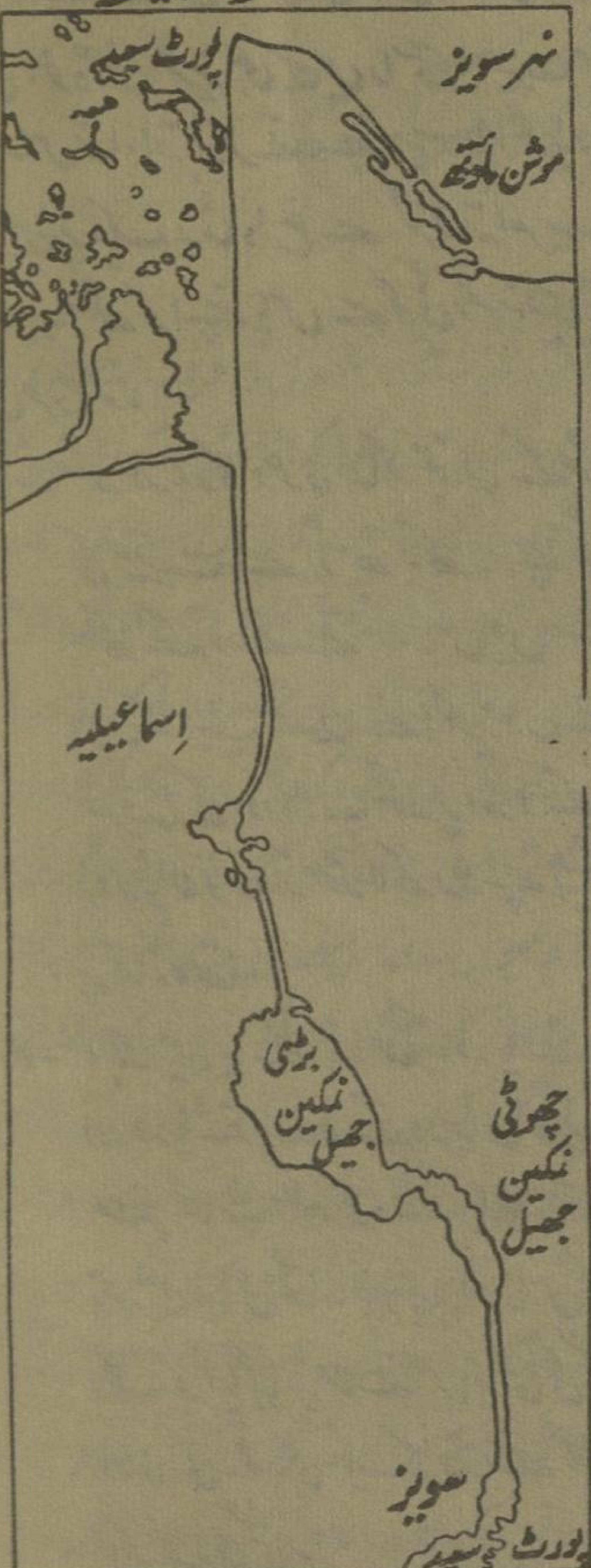
کشمیر کی فروخت کا واقعہ مختلف حیثیتوں سے بے حد اہم ہے۔ اوّل بڑے بڑے علاقوں کی فروخت کا ایسا کوئی واقعہ تاریخ میں نہیں ملتا۔ دُوسرے ان علاقوں کے باشندے ایک سو سال تک گلاب سنگھ اور اس کے جانشینوں کے خوف ناک ظلم و ستم کا نشانہ رہے۔ تیسرے گُلاب سنگھ ہی کے ایک جانشین نے پاک و ہند کی تقسیم کے وقت کشمیر و جمّوں کے بارے میں ایک ایسا افسوسناک قدم اُٹھایا کہ اس پر خونریز لڑائی شروع ہو گئی ۔ جو سوا سال جاری رہی ۔ پھر لڑائی بند ہوئی اور اصل جھگڑا انجمن اقوامِ متّحدہ میں پہنچا، لیکن اس کے تصفیے کی کوئی منصفانہ صُورت اب تک سامنے نہیں آئی اور پاک و ہند کی باہمی مفاہمت کے راستے میں جمّوں اور کشمیر کا مسئلہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

نہر سویز

تیار ہوتی ہے

دُنیا کی ایسی کوئی آبی شاہراہ پیش نہیں کی جا سکتی جس نے مشرق و مغرب کی تجارت، سیاست اور میل جول پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو، جتنا کہ نہر سویز نے ڈالا۔ بحیرۂ رُوم کو آبی راستے سے بحیرۂ قلزم کے ساتھ ملانے کے منصوبے بہت پُرانے تھے اور ان پر عمل بھی ہوتا رہا۔ ابتدائی زمانے میں ایسی کوشش کا جو اندازہ کیا جا سکا ہے وہ یہ ہے کہ دریائے نیل کے کسی حصّے سے ایک نہر نکال کر بحیرۂ قلزم تک پہنچا دی جاتی تھی۔ بحیرۂ روم سے کشتیاں دریا کے راستے اندر آتیں پھر نہر کے ذریعے سے بحیرۂ قلزم میں پہنچ جاتیں۔ ہارونُ الرّشید نے بھی ایک نہر کے ذریعے سے بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم کو ملانا چاہا تھا لیکن وہ اس وجہ سے رُک گیا کہ اس طرح موقع پا کر رومی بیڑا عرب کے ساحل تک پہنچ جائے گا اور وہ پاک سرزمین خطرے میں پڑ جائے گی جسے کافروں سے بچائے رکھنا ہر مُسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ جب پرتگیزوں نے راس اُمّید کا چکّر کاٹ کر ہندوستان اور مشرق بعید کا راستہ معلوم کر لیا اور اس سے وینس کی

نقشہ نہر سویز



بحری تجارت پر زد پڑی تو وینس کے انجینئروں نے بحیرۂ رُوم سے بحیرۂ قلزم تک ایک نہر نکالنے کی تجویز پیش کی تھی، لیکن سلطنتِ عثمانیہ نے اُسے منظور نہ کیا۔

انیسویں صدی کے وسط میں ایک فرانسیسی انجینئر ڈی لیسپ نے نہر کی اسکیم تیار کی۔ سعید

پاشا خدیوِ مصر سے لیسپ کے دوستانہ تعلّقات تھے۔ چنانچہ اس نے نہر کے لیے ایک کمپنی بنانے کی تجویز منظور کرالی جس کا سرمایہ بیس کروڑ فرانک رکھا گیا اور اُسے پانسو فرانک کے چار لاکھ حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جب لیسپ اس کمپنی کی منظوری حاصل کرنے کے لیے قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) پہنچا تو وہاں برطانوی سفیر نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اُسے اندیشہ تھا کہ اس نہر کے بن جانے سے برطانیہ کی بحری برتری کو نقصان پہنچے گا اور فرانسیسیوں کے لیے مشرق میں مداخلت کا دروازہ کھُل جائے گا، تاہم کمپنی کا کام جاری رہا۔ ۲۵ اپریل ۱۸۵۹ء کو پورٹ سعید کی طرف سے اس کی کھُدائی شروع ہوئی۔ دس سال میں نہر مکمل ہو گئی۔ ۱۶ نومبر ۱۸۶۹ء کو نہر کا افتتاح ہُوا۔ اس کے بڑے حِصّے دار تین تھے۔ فرانس، ترکی اور خدیوِ مصر۔ اسماعیل پاشا خدیوِ مصر کو مالی مشکلات پیش آئیں تو اس کے بہت سے حِصّے حکومت برطانیہ نے پونے چالیس لاکھ پونڈ کی رقم دے کر ۱۸۷۵ء میں خرید لیے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ان حِصّوں کی قیمت دو کروڑ پینتالیس لاکھ پونڈ سے زیادہ ہو گئی۔

نہر کے انتظام کے لیے کئی مرتبہ بین الاقوامی نمایندوں کے اجتماع ہُوئے جن میں ۱۸۸۸ء کا اجتماع خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس میں فیصلہ ہو گیا تھا کہ نہر تمام قوموں کے جہازوں کے لیے کھُلی رہے گی۔ ۲۹ نومبر کو اس سمجھوتے پر مختلف حکومتوں نے دستخط کر دیئے جن میں برطانیہ، فرانس، رُوس، ترکی اور اٹلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نہر کی تعمیر اور توسیع پر کل اٹھاسی کروڑ اٹھائیس لاکھ چھیانوے ہزار فرانک خرچ ہُوئے۔ یہ ایک سو ایک میل لمبی ہے اور چوڑائی ایک سو چھیانوے فٹ دس انچ سے کم کہیں نہیں۔ اس کی گہرائی ۳۴ فیٹ ہے۔ اس میں سے جہاز کے گزرنے کا عام وقت گیارہ گھنٹے اور اکتیس منٹ رکھا گیا ہے۔ اس نہر نے یورپ اور جنوبی و مغربی ایشیا کو ایک دُوسرے کے بہت قریب کر دیا ہے۔ راس اُمید کے راستے بہت چکّر پڑتا تھا۔

۱۹۵۶ء سے پیشتر نہر سویز پر برطانوی حکومت کا تسلّط تھا اور اس کی حفاظت کے لیے انگریزی فوج نہر سویز کے علاقے میں رہتی تھی۔ جب برطانوی فوج نہر سویز کے حلقے سے نکل گئی اور حکومت مصر کو اسوان بند کی تعمیر کے لیے برطانیہ اور امریکہ نے مناسب مالی امداد دینے سے انکار کر دیا تو حکومت مصر نے ۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء کو نہر سویز کو قومی ملکیت بنا لینے کا اعلان کر دیا اور سارا انتظام خود سنبھال لیا۔ اس پر کشمکش شروع ہوئی جس نے نومبر ۱۹۵۶ء میں جنگ کی صُورت اختیار کر لی۔ اہلِ مصر کی پامردی اور انجمن اقوام متّحدہ کے بیچ بچاؤ سے جنگ بند ہوئی اور برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کو اپنی اپنی فوجیں ہٹانی پڑیں۔ اب نہر کا سارا انتظام اور نگہداشت مصر کی قومی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔



دولتِ سعودیہ کی بُنیاد پڑتی ہے

دولتِ سعودیہ کا بانی عبدالعزیز گیارہ سال کا تھا جب اس کے والد عبدالرحمٰن نے امیر حائل کے مقابلے میں آخری مرتبہ شکست کھائی۔ آبائی سلطنت چھِن گئی اور اسے بال بچّوں سمیت ریاض سے نکلنا پڑا، جو ساٹھ سال سے خاندان سعودیہ کی امارت کا مرکز چلا آتا تھا۔ چھِنی ہُوئی متاع کے دوبارہ حاصل ہونے کی بظاہر کوئی اُمید نہ تھی، بلکہ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جلاوطنی کے دن کیونکر گزریں گے۔

یہ لوگ کویت میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں عبدالعزیز کی عمر اکیس سال کی ہوئی تو اس نے حصولِ امارت کے لیے ایک منصُوبہ تیّار کیا اور خاص رفیقوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ صحرائی علاقے میں نکل گیا، جہاں سر پہ آسمان کے سوا کوئی شامیانہ اور پاؤں کے نیچے ریت کے سوا کوئی فرش نہ تھا۔ کئی مہینے گزر گئے اور والدین کو اس کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی۔ رمضان ۱۳۱۹ھ (دسمبر ۱۹۰۱ء) کا مہینہ آ گیا جس میں اس نے منصوبے پر عمل کی تیاری مکمّل کر لی۔ اس اثنا میں والد کی طرف سے پیغام پہنچا کہ واپس آ جاؤ۔ عبدالعزیز نے قاصد کو جواب دیا کہ واپس جاؤ اور والد کی خدمت میں عرض کرو کہ میں نے جان کی بازی لگا دی ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ ہمارا ملک غیروں کے قبضے میں رہے اور ہمارا خاندان جلاوطنی کی ٹھوکریں کھائے۔ میرے لیے دو ہی راستے ہیں، کامیابی یا موت، تیسرا کوئی نہیں۔ فتح و شکست خدا کے ہاتھ میں ہے۔

عیدالفطر کی نماز کے بعد وہ چُھپتا چُھپاتا ریاض کی جانب روانہ ہُوا۔ جب شہر چھ سات میل رہ گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک گروہ کو وہاں ٹھہرا دیا۔ سواریاں اس کے حوالے کیں اور کہہ دیا کہ اگر چوبیس گھنٹے تک ہماری طرف سے کوئی خبر نہ ملے تو کویت چلے جانا اور میرے والد سے کہہ دینا کہ میں مارا گیا یا قید ہو گیا ہوں۔

آگے کھجوروں کے گھنے باغ تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ اور طے کیا تو صرف دس آدمی چُن لیے۔ باقی ساتھیوں سے کہا کہ یہاں انتظار کرو، صُبح تک ہماری طرف سے کوئی پیغام نہ آئے تو سمجھ لینا کہ ہم اپنا فرض ادا کرتے ہوئے مارے گئے ہیں اور تم واپس چلے جانا۔

ذرا اندھیرا ہوگیا تو دس ساتھیوں کو لے کر شہر کے اندر پہنچا جس کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہوا تو گھر والوں نے پہچان لیا اور کہا: "خدا کے لیے واپس چلے جائیے آپ کیوں جان خطرے میں ڈال کر یہاں آگئے ہیں؟" عبدالعزیز نے جواب دیا کہ میں جو ارادہ کر کے آیا ہوں، اسے ضرور پورا کروں گا۔ اب واپسی کا سوال بے محل ہے۔ چُپ رہو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔

اس نے معلوم کر لیا کہ امیر حائل کی طرف سے جو حاکم مقرر ہے وہ رات قلعے میں گزارتا ہے اور صبح کے وقت اپنے مکان میں آتا ہے، جو قلعے کے عین سامنے تھا اور جس مکان میں عبدالعزیز پہنچا تھا اس سے زیادہ دُور نہ تھا۔ وہ چھت پر سے ہوتا ہوا حاکم کے مکان میں پہنچا۔ عورتوں، نوکروں چاکروں کو ایک کوٹھری میں بند کیا۔ رات بھر یہ دس جوانمرد نفل ادا کرتے، دُعائیں مانگتے اور قرآن پڑھتے رہے۔ صبح کی نماز کے بعد مکان کی اس شہ نشین میں بیٹھ گئے، جس کے سامنے لکڑی کی جالی لگی ہوئی تھی اور قلعے کا دروازہ صاف نظر آتا تھا۔

پَو پھٹی، دروازہ کُھلا، حاکم باہر نکلا اور سامنے جو سپاہی کھڑے تھے، ان سے باتوں میں لگ گیا۔

یکایک یہ دس آدمی اُٹھے اور انتہائی تیزی سے حاکم پر جا گرے۔ عبدالعزیز سب سے آگے تھا۔ چند منٹ تک سب لوگ ہکّا بکّا کھڑے رہے۔ حاکم نے بھاگ کر قلعے میں گھُسنا چاہا اور ہر طرف سے ان دس جانبازوں پر گولیوں کی بارش شروع ہو گئی، لیکن خطرے کے بھنور میں پہنچ کر کسے خیال ہو سکتا تھا کہ کون جیتا اور کون مرتا ہے۔ حاکم مارا گیا۔ عبدالعزیز نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں منادی کرا دی گئی کہ خاندان سعُود نے اپنی ملکیت سنبھال لی ہے۔ سب لوگ مبارک باد کے لیے آنے لگے۔ بے مثال بہادری کے اس کارنامے نے ان عربوں کو حیرت میں ڈال دیا، جن کے لیے جانبازی ہمیشہ بچّوں کا کھیل رہی۔ نجد کا بچہ بچہ عبدالعزیز پر جان چھڑکنے کو سب سے بڑا فخر سمجھنے لگا۔

ریاض ۱۳ جنوری ۱۹۰۲ء کو فتح ہوا تھا۔ پھر عبدالعزیز کو آبائی حکومت واپس لینے میں جو جانفشانیاں کرنی پڑیں، وہ تاریخ عرب کا سنہری باب ہیں۔ علاقوں پر علاقے فتح ہوتے گئے، یہاں تک کہ دولت سعودیہ کے نام سے وہ سلطنت قائم ہوگئی جس سے بڑی سلطنت عرب میں سات سو سال سے دیکھی نہیں گئی تھی۔ یُوں فتح ریاض تاریخ کا ایک بڑا اہم واقعہ بن گیا۔





PHOTO FROM BETTMANN ARCHIVE

ڈائنامیٹ سے اہلِ علم فائدہ اُٹھاتے ہیں

دُنیا میں ایسے آدمی بہت کم ہیں کہ جن ایجادات سے انسانوں کے لیے موت و ہلاکت سامانوں میں اضافہ ہوا، لیکن جب وہ مرے تو ا زندگی کا پُورا سرمایہ نیک کاموں میں لگا گئے انھیں میں سے سویڈن کا ایک شخص ایلفرڈ برا نوبیل بھی تھا، جس نے اپنے انعامات کی ر عالمگیر شہرت پائی۔

نوبیل ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کو آبدوز سرنگوں اور بھک سے اُڑ جانے والے مادّوں کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی۔ ساری عمر انھی کی تحقیقات میں گزار دی۔ نوبیل کا بھائی بھی مشہور انجینئر اور سائنس داں تھا۔ خود نوبیل پیدائشی کمزور تھا۔ عمر بھر بیمار ہی سا رہا، خصوصاً سر کے درد سے تو اسے کبھی نجات نہ ملی۔ ماں کو اس سے بڑی محبّت تھی۔ اسے یقین تھا کہ میرا یہ بیٹا بہت بڑا آدمی بنے گا۔ جب نوبیل بیمار ہو کر پلنگ پر پڑ جاتا تو ماں پاس بیٹھ کر اسے کتابیں سُناتی رہتی۔ ہوش سنبھالا تو اسے بھی باپ کی طرح آتش گیر مادوں کی تحقیقات کا شوق پیدا ہو گیا۔ انجینیئری سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ وہ امریکہ چلا گیا۔ وہاں سُنا کہ ایک شخص نے ایسا انجن ایجاد کیا ہے جو سُورج کی گرمی سے چلتا ہے اور اسے ایک کشتی میں لگایا جائے گا۔ نوبیل بھی اس شخص کا رفیقِ کار بن گیا۔ کشتی تجربے کے لیے دریا میں ڈالی گئی تو اچانک ایسا طوفان آیا کہ وہ غرق ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی انجن کے موجد اور نوبیل کی امیدیں بھی ڈُوب گئیں۔

اس کے بعد نوبیل نے زندگی کے دو نصب العین مقرر کر لیے۔ اوّل یہ کہ آتش گیر مادوں کی ایجاد سے دَولت کمائے، دُوسرے اس دولت کو ایسے کاموں میں لگا دے جن سے سائنس دانوں کو نئے نئے تجربات میں مدد مل سکے۔ ایسا نہ ہو کہ مالی تنگی کے باعث وہ اپنے خداداد جوہروں سے کام نہ لے سکیں۔

چنانچہ اس نے کئی ایجادیں کیں، جن میں سب سے زیادہ شہرت ڈائنامیٹ نے حاصل کی۔ اس نے ڈائنامیٹ کو رجسٹرڈ کرا کے جگہ جگہ کارخانے قائم کیے اور بڑا سرمایہ پیدا کر لیا۔ اگرچہ بیماری اس کا پیچھا نہ چھوڑتی تھی، تاہم وہ اس حالت میں بھی نئے نئے تجربے کرتا رہا۔ اکثر دیکھا گیا کہ سر سے پٹی بندھی ہوئی ہے اور وہ برابر سرگرمی سے اپنا کام کر رہا ہے۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو وفات پائی۔ اس نے وصیت کر دی تھی کہ میری جائداد فروخت کر کے پورا سرمایہ بنک میں جمع کر دیا جائے اور اس کے منافع سے ہر سال پانچ انعام ان لوگوں کو دیے جائیں جو طبیعیات، کیمسٹری، طبابت، ادب اور امن عالم کے لیے بہترین خدمات انجام دیں۔ ۱۹۰۱ سے انعامات کا سلسلہ شروع ہوا اور اب تک بدستور جاری ہے۔

انعامات کی مقداریں منافع کی رقم کے مطابق تھوڑی سی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ عام اندازہ یہ ہے کہ کوئی انعام پاکستانی سکے کے مطابق ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہوتا۔ مذکورہ بالا پانچ شعبوں میں بہترین کام کرنے والوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ کی رقم مل جائے تو وہ اطمینان سے اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔ کوئی سائنس دان اور موجد ایسا نہیں گزرا جس نے علم و امن کے لیے کام کرنے والوں کی امداد اور حوصلہ افزائی کا ایسا شاندار انتظام کیا ہو، جیسا نوبیل نے کر دیا ہے۔ انعامات کا یہ سلسلہ بیسویں صدی کی ابتدا سے جاری ہے اور جب تک نوبیل کا سرمایہ باقی ہے، یہ سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔

غور کیجیے کہ ساٹھ سال ہونے کو آئے ہیں۔ ہر سال کم و بیش ساڑھے سات لاکھ کی رقم نوبیل کے جمع کرائے ہوئے سرمائے سے مل رہی ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ بعض شعبوں میں کوئی قابل آدمی نہ مل سکا جو اپنی شاندار خدمات کی بنا پر انعام کا مستحق قرار پاتا۔ دوسری جنگ عظیم میں تین سال تک (۱۹۴۰ - ۱۹۴۲ء) انعامات ملتوی رہے۔



PHOTO FROM EUROPEAN

جنگی مجرموں پر مقدمہ چلتا ہے

جنگ کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ مختلف قومیں اپنی نادانی سے اسے باہمی اُلجھنوں کے حل کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھتی رہیں۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی تو یہی نظر آیا کہ ایک اُلجھن کی جگہ دس نئی اُلجھنیں پیدا ہوگئیں اور حالات نے پہلے سے زیادہ نازک صُورت اختیار کر لی۔ اگر کسی وقت جنگ کے سوا چارہ نہ رہے تو فریقین میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ اس کا دائرہ جہاں تک ہو سکے محدُود رکھیں۔ غیر مصافی آبادی کو کوئی نقصان نہ پُہنچے، ان کے گھر بار تباہ نہ ہوں، کاروبار پر زد نہ پڑے، لیکن ہٹلر نے ۱۹۳۹ء میں جو جنگ شروع کی، اس نے ابتدا ہی سے نہایت خوفناک شکل اختیار کر لی۔ اس میں کسی بھی فرد کی کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ جس جس مقام سے جرمن فوجیں گزریں، ایک قیامت برپا ہوگئی،، بلکہ مفتوحہ علاقوں کے مختلف لوگوں پر ایسی سختیاں کی گئیں جن کے ذکر ہی سے دِل کانپ اُٹھتا ہے، اسی لیے اتحادی ملکوں کے نمائندوں نے ۱۳ر جنوری ۱۹۴۲ء کو اعلان کر دیا تھا کہ جو لوگ تحقیقات کے بعد جنگ کے سلسلے میں مختلف جرائم کے ذمہ دار پائے جائیں گے اُنھیں قانون کے مطابق سزائیں دی جائیں گی۔

۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کو جنگی جرائم کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا گیا۔ جب ہٹلر نے خودکشی کر لی اور جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے تو بعض بڑے بڑے جنگی لیڈر مر چکے تھے، جو باقی تھے انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اُن کے تمام کاموں کی خوب چھان بین کی گئی۔ جب پُوری شہادتیں دستیاب ہوگئیں تو چار ججوں کی ایک عدالت مقرر کر کے جرمنی کے مشہور مقام نیورمبرگ میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۴۵ء سے مقدمہ شروع ہوُا۔ عدالت کے اجلاس آٹھ مہینے جاری رہے۔ اس اثنا میں دو سو گواہ

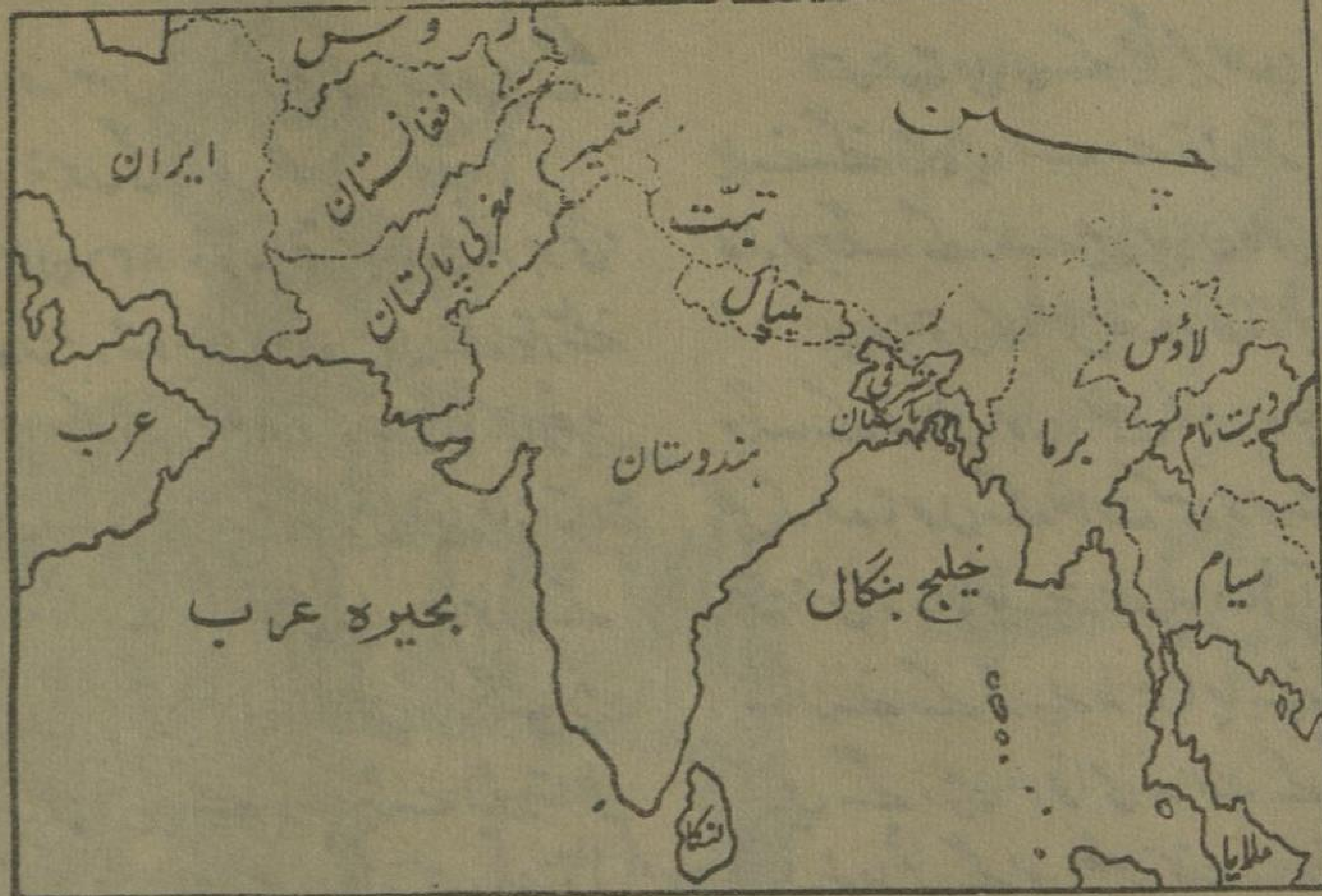
پیش ہوتے اور انھوں نے جو گواہیاں دیں وہ پچاس لاکھ الفاظ سے کم نہ ہوں گی۔

۲۹ رجون ۱۹۴۶ء کو عدالتی تحقیقات ختم ہو گئی۔ پھر ججوں نے تمام دستاویزوں اور گواہیوں کے انبار سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جو یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء کو سنایا گیا۔ چار جرم قائم کیے گئے تھے، یعنی نازی سازش، جارحانہ اقدامات، جنگی جرائم، انسانیت سوز افعال۔ بارہ ملزموں کے لیے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ ان میں گوئرنگ، ربن ٹروپ، کائیٹل وغیرہ جیسے بڑے بڑے لیڈر شامل تھے۔ بعض کو عمر قید یا بیس بیس سال، پندرہ پندرہ سال، دس دس سال قید کی سزا سنائی گئی اور صرف تین کو رہا کیا گیا۔ اول الذکر گروہ کو بتاریخ ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء پھانسی دے دی گئی۔ گوئرنگ نے پھانسی پانے سے پیشتر ہی خودکشی کر لی۔ ایک نازی لیڈر جس کا نام رابرٹ لی تھا، عدالتی فیصلے سے پہلے ہی خودکشی کر چکا تھا۔

اسی طرح جاپان کے جنگی مجرموں پر بھی مقدمے چلائے گئے، جن میں سب سے قابلِ ذکر شخص توجو تھا، جو جنگ کے زمانے میں جاپان کا وزیرِ اعظم تھا۔

ان سزاؤں کا اصل مقصد یہ تھا کہ جو لوگ آئندہ جنگ کے خواہاں ہوں انھیں کان ہو جائیں۔ وہ سمجھ لیں کہ عہد ناموں کے خلاف کسی کو موت و ہلاکت کا تختۂ مشق نہ بنانا چاہیے اور غیر مصافی آبادی کو اندھا دھند تباہ کرنے کے درپے نہ ہونا چاہیے۔ جو لوگ ایسا کریں گے، بین الاقوامی عدالت کے روبرو مجرم ٹھہرائے جائیں گے اور انھیں سخت سے سخت سزائیں ملیں گی۔ گویا یہ سزائیں بھی جنگ یا اس کی ہولناکیوں کو روکنے کے لیے ضروری سمجھی گئیں۔ جنگی مجرموں کے خلاف باقاعدہ مقدمہ چلا کر انھیں سزائیں دلانے کا یہ پہلا واقعہ ہے، اس لیے نیورمبرگ سے بین الاقوامی ضابطوں میں ایک نئے ضابطے کا اضافہ ہوا۔





جنوبی ایشیا میں ترقی کی سکیمیں جاری ہوتی ہیں

دُوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایشیا کے جن ملکوں کو آزادی ملی، انھیں کئی مشکل مسئلے درپیش تھے، مثلاً محکومی کے زمانے میں ان کے قدرتی وسائل سے پُورا فائدہ نہ اُٹھایا گیا تھا اور وہ صنعتی اعتبار سے بہُت پس ماندہ تھے۔ اس وجہ سے وہاں کے باشندوں کا معیارِ معیشت خاصا پست تھا۔ ۱۹۵۰ء کے شروع میں دولتِ مشترکہ کے وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس کولمبو میں ہوئی، جس میں دوسرے مسائل کے علاوہ اس مسئلے پر بھی غور کیا گیا۔ سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کا بنیادی مسئلہ اقتصادی ہے۔ اس لیے پہلا اور حددرجہ ضروری کام یہ ہے کہ ان علاقوں کے باشندوں کا معیارِ معیشت بڑھانے کی خاص کوشش کی جائے۔ پھر سڈنی (آسٹریلیا) کے اجلاس میں طے ہُوا کہ جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ملکوں سے ترقی کے منصوبے تیار کرائے جائیں جو چھ سال (۱۹۵۱ء – ۱۹۵۷ء) پر پھیلے ہوئے ہوں، اس طرح انھیں ایک خاص ترتیب سے پُورا کیا جا سکے۔ اسّی لاکھ پونڈ کی رقم فنّی امداد کے لیے منظور کر لی گئی۔

نقشے تیار ہو گئے تو وہی امدادِ باہمی کے اس وسیع منصوبے کی بُنیاد بن گئے جو "کولمبو پلان" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس منصوبے پر یکم جولائی ۱۹۵۱ء سے عمل شروع ہو گیا۔ چھ سال میں پُورے خرچ کا اندازہ ایک ارب چھیاسی کروڑ اسی لاکھ پونڈ کیا گیا تھا۔ اس میں ایک ارب تین کروڑ پونڈ کی رقم (۵۵ فیصد) "کولمبو پلان" کے ملکوں کو خود فراہم کرنی تھی۔ باقی تراسی کروڑ اسی لاکھ (۴۵ فی صد) کی رقم باہر سے قرض لے کر صرف کرنی تھی۔

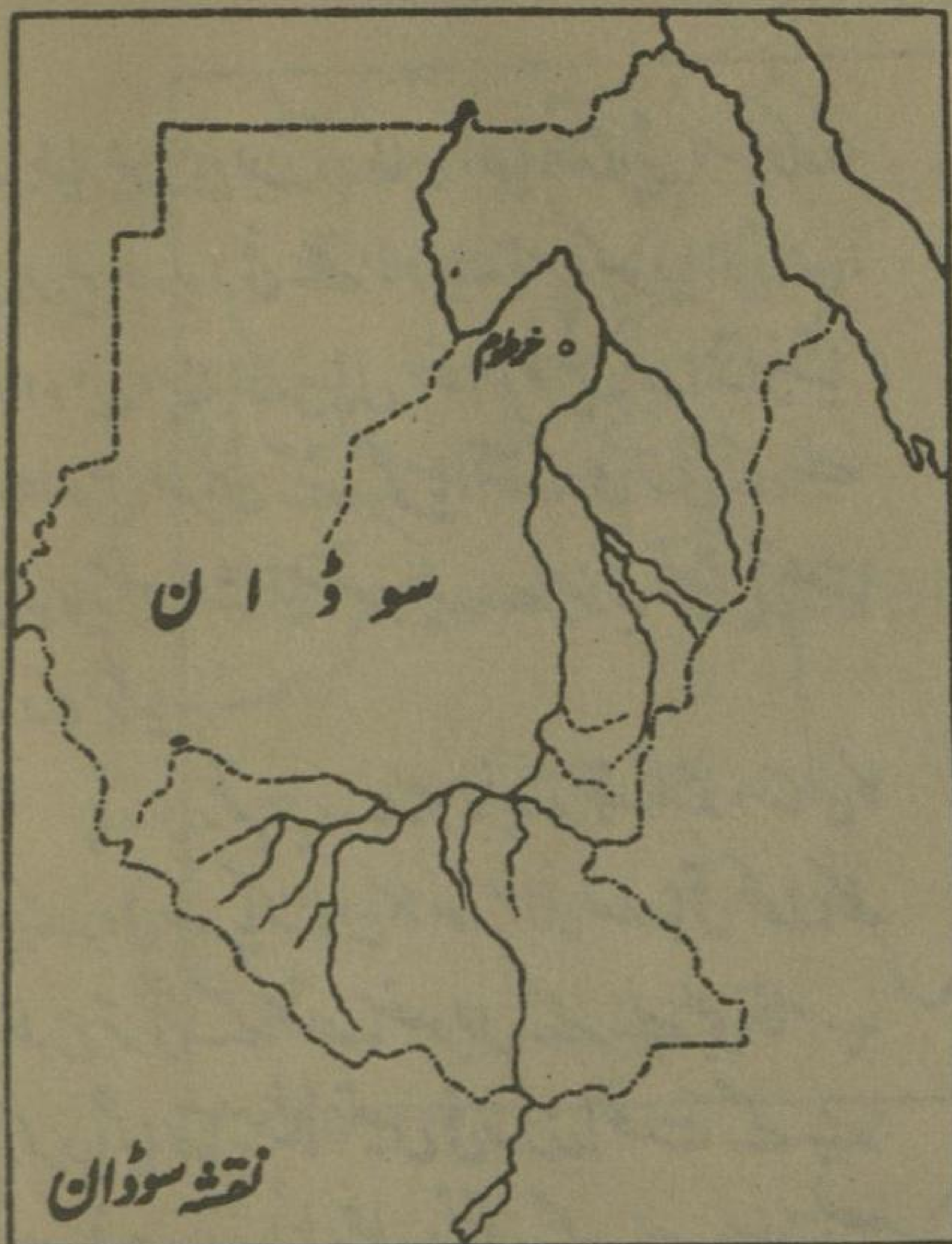
دولتِ مشترکہ کی ایک مشاورتی کمیٹی بن گئی تھی جس کے ابتدائی رُکن پاکستان، ہندوستان، سیلون، کینیڈا،

آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، برطانیہ، ملایا، سنگاپور، سراوک، شمالی بورنیو اور برونی تھے۔ ویت نام، کمبوڈیا، لاؤس، ۱۹۵۰ء میں، برما اور نیپال ۱۹۵۲ء میں اور انڈونیشیا ۱۹۵۳ء میں ممبر بن گئے۔ گویا اقتصادی ترقی کے لیے تعاون کا یہ عظیم الشان منصوبہ پورے جنوبی و مشرقی ایشیا پر حاوی ہوگیا۔

پوری رقم میں سے ۳/ فیصد حصّہ ہندوستان کا تھا، پندرہ فی صد پاکستان کا اور ۱۲ فی صد باقی ملکوں کا۔ اسی طرح ترقّی کے مختلف منصوبوں کے لیے بھی تناسب مقرر کردیا گیا تھا۔ مثلاً بتیس فی صد زراعت کے لیے، تینتیس فی صد وسائلِ حمل و نقل کے لیے، سات فیصد بجلی وغیرہ کے لیے، گیارہ فیصد صنعت و حرفت اور معدنیات کے لیے، سترہ فیصد شہری ترقی کے منصوبوں کے لیے۔

پاکستان نے ترقّی کے منصوبوں کا جو نقشہ مشاورتی کمیٹی کے روبرو پیش کیا تھا اس کے خرچ کا اندازہ اٹھائیس کروڑ پونڈ یا دو ارب ساٹھ کروڑ روپے تھا۔ زراعت کو اس لیے خاص اہمیت دی گئی کہ جنوبی و مشرقی ایشیا کے دُوسرے ملکوں کی طرح ہمارے ملک کی بھی اسّی فیصد آبادی زراعت پیشہ ہے۔ مُدّعا یہ تھا کہ آب پاشی کے نئے منصوبے مکمّل کیے جائیں۔ زمین کو سیم سے بچایا جائے۔ بہتر بیج مہیا کیے جائیں اور جہاں جہاں ممکن ہو مشینوں سے کھیتی باڑی کرائی جائے۔ ۱۹۵۱ء میں اندازہ کیا گیا تھا کہ ترقی زراعت کے منصوبے مکمل ہوجائیں گے تو ملک کی پیداوار میں تقریباً اکتیس فی صد کا اضافہ ہوجائے گا۔

غرض کولمبو پلان دو وجہ سے دورِ حاضر کا نہایت اہم واقعہ ہے: اوّل ترقی کے ایسے منصوبے جنوبی و مشرقی ایشیا کے ملکوں نے کبھی نہ دیکھے تھے، دُوسرے اتنے ملکوں نے مِل جُل کر ایسے منصوبوں کو پُورا کرنے کا ذمہ کبھی نہ اُٹھایا تھا۔ یہ منصوبہ مذکورہ بالا ملکوں کے درمیان دوستی اور ہمدردی کے مضبوط رشتے پیدا کرنے کا بھی موجب بن گیا۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیئے کہ جو ملک مالی اور فنّی نقطۂ نگاہ سے پس ماندہ ہیں، وہ اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتے جب تک انھیں دونوں قسم کی امداد نہ ملے گی، یعنی ایسے آدمیوں کی خدمات بھی حاصل ہونی چاہییں جو ماہرینِ فن ہوں اور جس حد تک ممکن ہو، ابتدا میں مالی امداد کا بھی بندوبست ہونا چاہیئے۔ پس ماندہ ملک ابتدائی مرحلوں سے گزر جائیں گے تو پھر انھیں زیادہ امداد کی ضرورت نہ رہے گی۔ وہ اپنی ہمت اور کوشش سے قدم آگے بڑھانے کے قابل ہوجائیں گے۔



نقشہ سوڈان

سوڈان کو خود مختاری ملتی ہے

یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو سوڈان کی آزادی کا اعلان ہؤا۔ مرکزی حکومت کی سرکاری عمارتوں سے مصری اور برطانوی جھنڈے اُتر گئے اور ان کی جگہ قومی پرچم اُڑنے لگا۔ اگر پہلے دَور کو نظر انداز کر دیا جائے جس پر ستر بہتر برس گزر چکے ہیں، تو بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر تھوڑی مدت میں اور جتنی آسانی کے ساتھ سوڈان نے آزادی حاصل کی ہے، اس طرح شاید ہی کسی ملک کو آزادی ملی ہو۔

سوڈان میں آزادی کی پہلی تحریک سید محمد احمد نے جاری کی تھی جو عام طور پر "مہدی سوڈانی" کے لقب سے مشہور ہیں اور بہت بڑے عالم دین اور نہایت عابد و زاہد بزرگ تھے۔ سوڈان اس زمانے میں مصر کے زیر نگیں تھا اور مصر برطانیہ کے ماتحت۔ نظام حکومت بھی اچھا نہ تھا اور جو حاکم انگریزوں کی طرف سے مقرر ہو کر آتے تھے وہ بھی اچھے ثابت نہ ہوتے تھے۔ اس وجہ سے سوڈانی سخت تکلیفوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ سید محمد احمد نے ۱۸۸۱ء میں آزادی کے لیے پہلا قدم اُٹھایا اور تھوڑی ہی مدت میں پورا سوڈان مصریوں سے آزاد کرا لیا۔ انھوں نے سوڈانیوں کے مذہبی اور قبائلی امتیازات ختم کر کے ان میں یک جہتی کی رُوح پیدا کر دی۔ وہ مصر میں بھی اسی قسم کی اصلاحی تحریک جاری کرنا چاہتے تھے، لیکن ۱۸۸۵ء میں ان کی ناگہانی وفات نے تمام خوشگوار امیدیں ختم کر دیں۔ ان کے تمام رفیق درویش کہلاتے تھے اور ان کی حکومت درویشوں کی حکومت مشہور تھی۔

خلیفہ عبداللہ جانشین ہوئے، لیکن وہ سید محمد احمد کا قائم کیا ہؤا معیار برقرار نہ رکھ سکے۔

۱۸۹۸ء میں انگریزوں اور مصریوں نے سوڈان کو دوبارہ فتح کر لیا۔ پھر چالیس پینتالیس سال تک اس طرح سکوت چھایا رہا گویا آزادی کی رُوح گہری نیند سو گئی ہے۔

۱۹۴۲ء میں نئے تعلیم یافتہ گروہ کے اندر

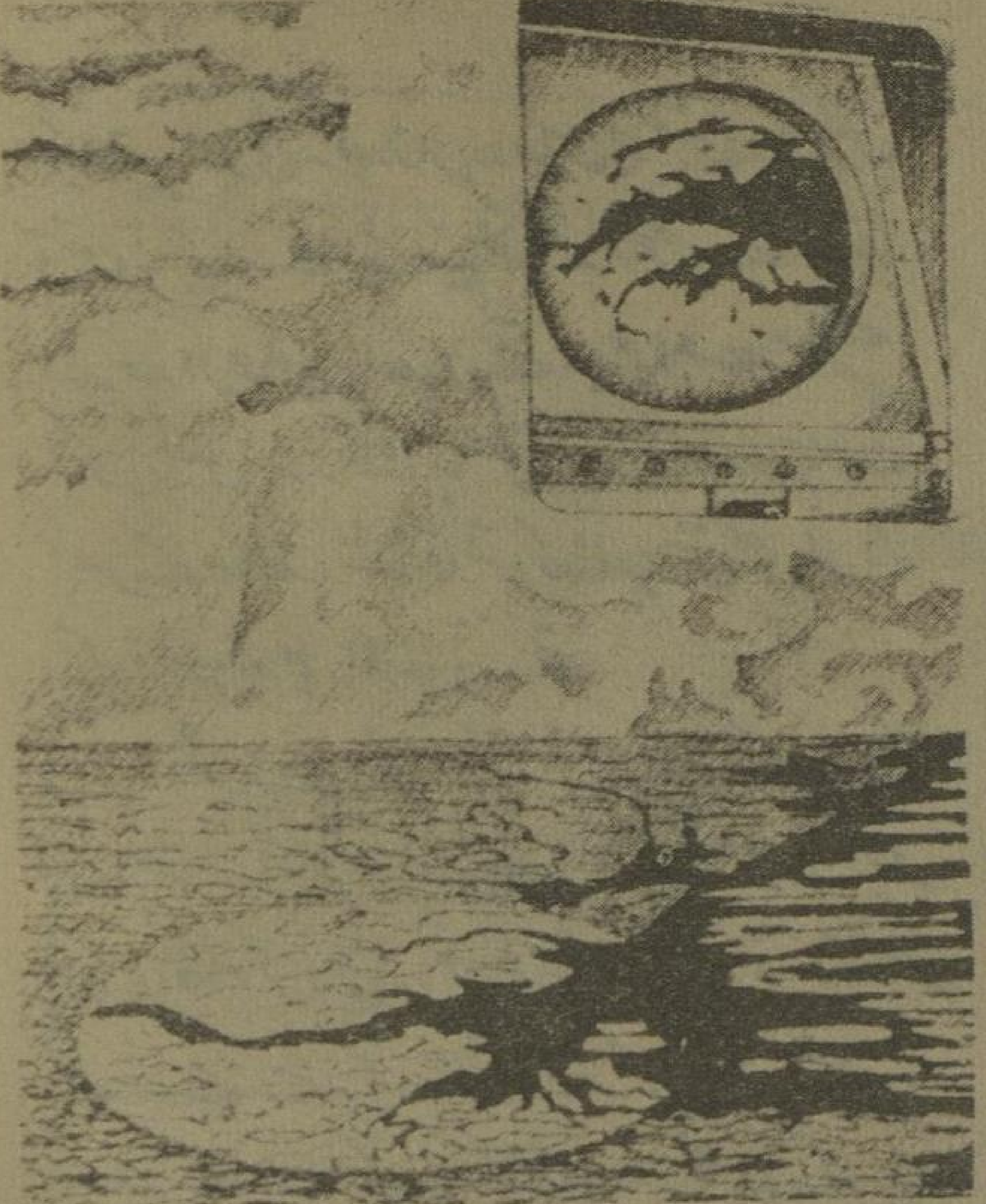
حرکت پیدا ہوئی۔ بعدازاں دو سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں۔ ایک کے لیڈر سید محمد احمد مرحوم کے فرزند سید عبدالرحمان المہدی تھے۔ یہ جماعت مصر سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہتی تھی۔ دوسری جماعت مصر کے ساتھ رشتہ قائم رکھنا چاہتی تھی اور اس کے لیڈر سید علی المرغانی تھے۔

انگریزوں نے عوام کو مطمئن رکھنے کے لیے پہلے ایک مشاورتی کونسل بنائی اور اس کی شاخیں صوبوں میں بھی قائم کر دیں۔ اس طرح کام نہ چلا تو آرڈیننس کے ذریعے سے ایک قانون ساز مجلس اور مجلس عاملہ کا انتظام کر دیا۔ قانون ساز مجلس کے لیے انتخابات ہوئے تو سید عبدالرحمٰن المہدی کی جماعت زیادہ نشستیں لے گئی۔

اب ایک عجیب دور شروع ہوا۔ انگریز خودمختاری کے حامی تھے اور مصر سے تعلق کو پسند نہ کرتے تھے۔ مصر کے ساتھ گفتگو شروع ہوتی اور آزادی کا معاملہ سامنے آتا تو گفتگو ختم ہو جاتی۔ گویا مصر کی اس روش نے انگریزوں کو اپنی خواہش پوری کر لینے کا موقع دے دیا۔ ممکن ہے انھیں خیال ہو کہ سوڈان مصر سے الگ رہے گا تو انگریزی اقتدار زیادہ دیر تک باقی رکھا جا سکے گا۔ ۱۹۵۱ء میں مصر نے ۱۹۳۶ء کے معاہدے اور مشترکہ حکومت کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ انگریزی حکومت نے یک طرفہ تنسیخ کو ناجائز قرار دیا، لیکن اس طرح سوڈان کے لیے جداگانہ کارروائی کی کھلی گنجائش پیدا ہو گئی۔ اسی سال سوڈان کی اسمبلی نے دستور میں ترمیم کے لیے ایک کمیشن بنا دیا۔ اس کمیشن نے بہت سا کام مکمل کر لیا، البتہ مصر کی سیادت کے مسئلے پر اختلافات پیدا ہو گئے۔

مجوزہ دستور کا خلاصہ یہ تھا کہ سوڈان کو آزادی حاصل ہوگی۔ پارلیمنٹ کے دو ایوان ہوں گے، ایک کا نام سینٹ اور دوسرے کا نام ایوان نمائندگان رکھا گیا۔ سینٹ کے ممبر تیس اور ایوان نمائندگان کے ممبر پچانوے منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں شاہ فاروق معزول ہو گیا اور جنرل نجیب برسر کار آیا، جسے سوڈان میں غیر معمولی ہردلعزیزی حاصل تھی۔ اس پر ان سوڈانیوں کے حوصلے بڑھ گئے جو مصر سے تعلق قائم رکھنے کے حق میں تھے۔ نجیب نے فیصلہ کر دیا کہ سوڈان کو آزادی کا حق حاصل ہے۔ ۱۲ر فروری ۱۹۵۳ء کو مصر اور برطانیہ کے اتفاق سے یہ طے پایا کہ زیادہ سے زیادہ تین سال کے عبوری دور میں پہلا نظام ختم کر دیا جائے اور آزاد نظام اس کی جگہ لے لے۔

اب انتخابات ہوئے تو سید اسماعیل الازہری کی جماعت الحزب الوطنیۃ الاتحادیہ (نیشنل یونینسٹ پارٹی) کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور سید موصوف ہی نے وزارت بنائی۔ یکم مارچ ۱۹۵۴ء کو پارلیمنٹ کے دوسرے اجلاس کے وقت ایک ناگوار حادثہ پیش آیا یعنی مظاہروں میں کچھ آدمی مارے گئے۔ اس وقت تک سوڈان کی فضا مصر کے حق میں تھی۔ ۱۴ر نومبر ۱۹۵۴ء کو مصری سیاست سے نجیب نکل گیا تو سوڈان کی روش بدل گئی۔ پہلے یہ طے ہوا کہ مستقبل کا فیصلہ رائے عامہ کے ذریعے سے کیا جائے۔ ساتھ ہی دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہو جائے اور اس اثنا میں تمام جماعتوں کی ملی جلی حکومت انتظام سنبھالے، پھر قرار پایا کہ پارلیمنٹ آخری فیصلہ صادر کر دے اور وہی دستور ساز اسمبلی کا کام کرے۔ سید اسماعیل الازہری نے ملی جلی حکومت بنائی اور پارلیمنٹ نے ۱۹ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو سوڈان کی آزادی کا فیصلہ کر دیا۔ یکم جنوری کو آزادی کا اعلان ہوا اور گورنر کا کام پانچ سوڈانی ممبروں کے سپریم کمیشن یعنی مجلس اعلیٰ نے سنبھال لیا۔



جادُو کی آنکھ ایجاد ہوتی ہے

"راڈر" ہمارے زمانے کی نہایت اہم ایجاد ہے۔ اس سے دُور دُور کی چیزیں دیکھی جا سکتی ہیں اور ان کا درمیانی فاصلہ جلد سے جلد معلوم کیا جا سکتا ہے۔ سخت کُہر یا گھنگھور گھٹا یا رات کی تاریکی، غرض کوئی شے راڈر کے مشاہدے کو نہیں روک سکتی۔ اسی لیے راڈر کو عام طور پر جادُو کی آنکھ کہا جاتا ہے۔

دُوسری عالمگیر جنگ میں جرمنوں نے ایسے ہوائی جہاز تیار کر لیے تھے، جو برقی لہروں کی مدد سے چلتے تھے۔ وہ نہایت تیزی سے آتے اور برطانیہ کی آبادیوں پر اندھا دُھند بم برسا کر تباہی پھیلاتے۔ اسی طرح بلجیم سے راکٹ بموں کی بارش ہوتی رہی۔ اب برطانیہ کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح ان جہازوں اور بموں کا پتا وقت سے پہلے لگا لینے کی کوئی تدبیر ہاتھ آنی چاہیے، تاکہ ان کی روک تھام کا مناسب بندوبست ہو سکے، نیز لوگوں کو حفاظت کے لیے خبردار کیا جا سکے۔ انگریز سائنس دانوں نے سوچ بچار اور تجربوں کے بعد راڈر ایجاد کیا، جو تین تین چار چار سو میل کے دائرے میں ہر ہوائی جہاز کی خبر آناً فاناً دے سکتا ہے۔

آپ نے ریڈیو کا آلۂ ترسیل (ٹرانسمٹر) تو دیکھا ہوگا۔ یہ آواز کو برقی لہروں کے ذریعے دُور دُور پہنچا دیتا ہے۔ راڈر کی مشین نہایت تیز رفتار اور زوردار شعاعوں کو چاروں طرف فضا میں بکھیرتی اور منتشر کرتی ہے اور جب چاہیں ہم ان شعاعوں کو ایک شعلے کی صُورت میں ایک خاص سمت میں بھی بھیج سکتے ہیں۔ انھیں کوئی شے روک نہیں سکتی، لیکن جب یہ کسی ٹھوس چیز سے ٹکراتی ہیں تو پلک جھپکنے میں واپس آ کر اس چیز کی تصویر مشین کے ساتھ لگے ہُوئے ایک خاص پردے پر نمایاں کر دیتی ہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ وہ چیز کتنے فاصلے پر ہے تو یہ جان لینا چنداں مشکل نہیں۔ شعاعوں کے مشین سے نکلنے اور تصویر لے کر واپس آنے کا وقت مشین چلانے والے کو معلوم ہوتا ہے۔ شعاعوں کی رفتار بھی اس پر آشکارا ہوتی ہے۔ پس وہ ایک لمحہ

میں شے کے فاصلے کا اندازہ کر لیتا ہے۔ غرض راڈر کی ایجاد کے بعد جرمنوں کے جہازوں یا راکٹ ہوں کا مقابلہ کامیابی سے کیا جانے لگا۔

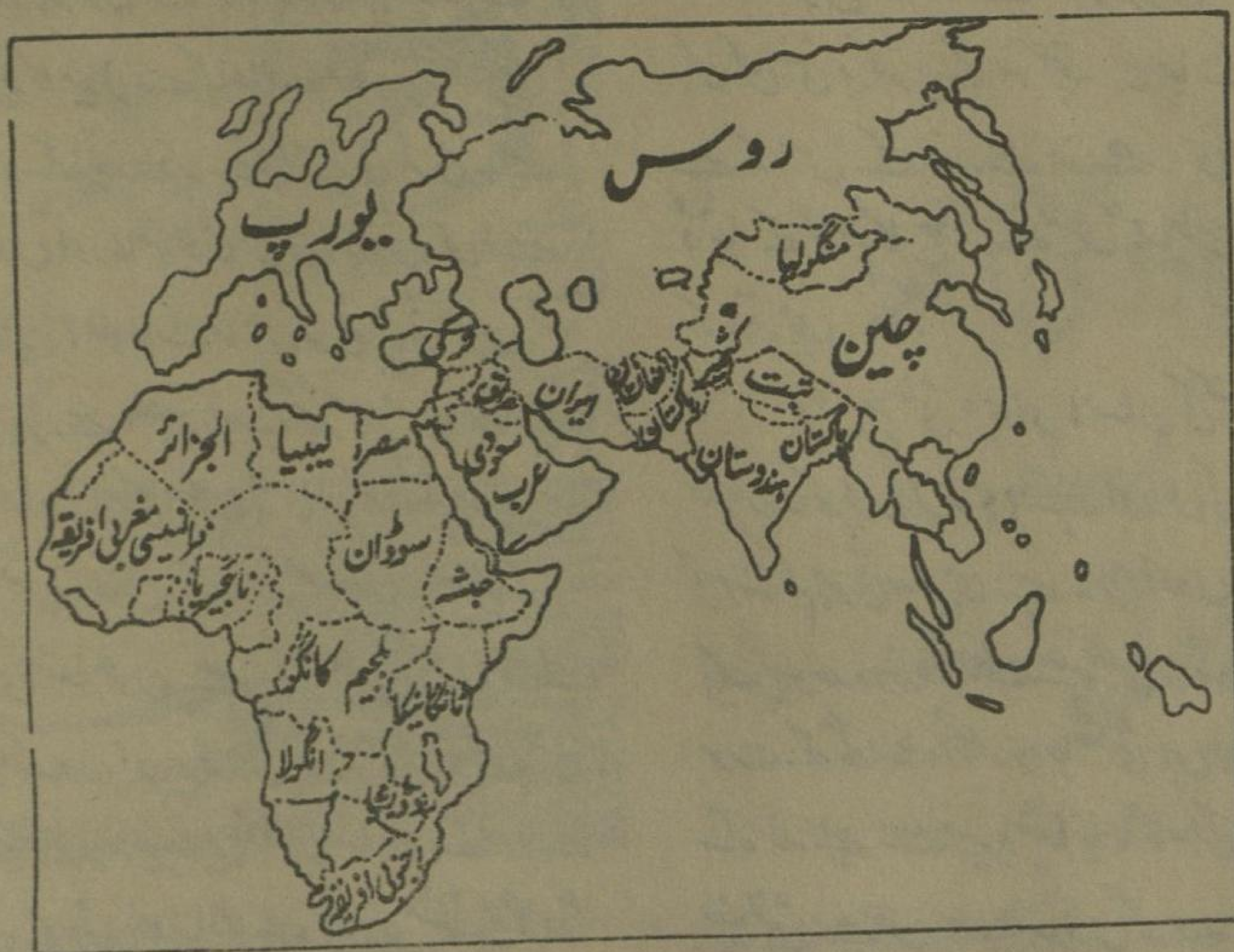
ایجاد کے بعد راڈر نے بڑی ترقی کر لی۔ پہلے ہوائی جہازوں اور عام بحری جہازوں کو راستے کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنی پڑتی تھیں۔ اب راڈر کے ذریعے انھیں سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے، اس لیے حادثوں کا امکان بڑی حد تک کم ہو گیا ہے۔

سائنس دانوں نے یہ بات بھی بہت جلد معلوم کر لی کہ جن طلسمی شعاعوں سے راڈر میں کام لیا جاتا ہے، وہ بعض جانوروں اور پرندوں سے بھی خود بخود نکلتی رہتی ہیں۔ یہ جانور اندھیرے میں انھیں شعاعوں کے ذریعے راستے کی رکاوٹوں کا پتا لگا لیتے ہیں۔ مثلاً چمگادڑ کو دیکھو۔ وہ رات کے وقت اُڑتا ہے تو کبھی دیوار یا بجلی کے کھمبے سے نہیں ٹکراتا۔ یہی شعاعیں قبل از وقت رکاوٹ کے بارے میں اسے خبردار کر دیتی ہیں۔ اسی اصول کو سامنے رکھ کر سائنس دانوں نے ایک ایسی چھڑی بنائی ہے، جو اندھوں کے لیے ہمدرد رہنما کا کام دیتی ہے۔ اندھا اس چھڑی کو ہاتھ میں لیے جا رہا ہو، جب رکاوٹ سامنے آئے گی تو چھڑی میں گھنٹی بجنے لگے گی اور اندھے کو آگاہ کر دے گی کہ اسے ایک طرف ہو جانا چاہیے۔ لطف یہ کہ جب تک اندھا سامنے کی رکاوٹ سے بالکل محفوظ نہ ہو جائے گا، گھنٹی بجتی رہے گی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ راڈر کل انسانوں کے لیے کن کن نئی برکتوں کا سرچشمہ بن جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے ذریعے اندھے اسی طرح بے تکلف دُنیا کے کام کاج کرنے لگیں جس طرح آنکھوں والے کرتے ہیں۔

غرض ہر نئی ایجاد انسان کی کسی نہ کسی اہم ضرورت کو پورا کر رہی ہے اور اس کی بے بسی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایجادوں کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو حد درجہ خطرناک ہے جس سے وسیع آبادیاں موت کے گھاٹ اُتاری جا سکتی ہیں جیسا کہ ایٹم بم کے ذریعے سے ہیروشیما یا ناگاساکی میں ہُوا۔ دوسرا نفع بخش ہے جس سے انسانوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے لیے صرف راڈر ہی کی مثال دیکھ لیجیے۔

اگر راڈر ایجاد نہ ہوتا تو دشمنوں کے اچانک حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لینے کی کیا صُورت تھی؟ یا ہوائی جہازوں کو خطرات سے کیوں کر آگاہی حاصل ہو سکتی تھی؟ پھر اس کے دُوسرے فائدوں کو پیش نظر لائیے۔ اس کی وجہ سے اندھوں کو کیسا اچھا سہارا مل گیا؟ ابھی خدا جانے یہ ایجاد اور کون کون سے فوائد کا دروازہ کھولے گی۔ خدا کرے کہ تمام ایجادیں اِنسانوں کے فائدے کے لیے استعمال ہوں، نقصان کے لیے کام میں نہ لائی جائیں۔



ایشیا اور افریقہ متحد ہوتے ہیں

دُنیا کی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ یہ ہے کہ ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو انڈونیشیا کے مشہور شہر بندوگ میں ایشیا اور افریقہ کے انتیس آزاد یا قریباً آزاد ملکوں کے نمائندے جمع ہوئے اور اُنھوں نے سات روز کے غور و فکر کے بعد اپنے اقتصادی، ثقافتی اور دُوسرے مسائل مِل جل کر حل کرنے کی تجویزیں سوچیں۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جمعیت اقوام بنی تھی جس میں معاملات کی باگ ڈور فرانس و برطانیہ کے ہاتھ میں رہی۔ دُوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر مجلس اقوام کی بُنیاد رکھی گئی جس کے لیے امریکہ نے سب سے بڑھ کر کام کیا اور جس میں اب تک امریکہ ہی کا اثر و رسُوخ سب سے زیادہ ہے، لیکن ایشیا اور افریقہ کے آزاد ملکوں کا اتحاد ان برّاعظموں کی ہزارہا سالہ سرگزشت کا پہلا واقعہ تھا۔

اس کانفرنس کے لیے پاکستان، ہندوستان برما، سیلون اور انڈونیشیا کے بڑے وزیروں نے دعوت دی تھی اور ان پانچ ملکوں کے علاوہ افغانستان کمبودیا، جمہوریہ چین، مصر، حبشہ، گولڈ کوسٹ، ایران عراق، جاپان، شرق اُردن، لاؤس، لبنان، لائبیریا، لیبیا، نیپال، فلپینز، دولت عربیّہ سعودیّہ، سودان، شام، تھائی لینڈ، ترکی، جمہوریہ ویت نام اور یمن کے نمائندے شریک ہُوئے۔ ابتدائی اجلاس کے بعد مختلف مسائل کے لیے الگ الگ کمیٹیاں بنا دی گئی تھیں۔ ۲۴ اپریل کو ان سب کمیٹیوں کی تیار کردہ تجاویز ایک مُصدّقہ اعلان کی شکل میں شائع کر دی گئیں۔ کانفرنس کا مقصُود اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایشیا اور افریقہ کے

تمام ملکوں کے درمیان، اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی تعاون کے رشتے مضبوط ہو جائیں اور وہ اتحاد و اتفاق سے امنِ عالم کی خدمت انجام دیں۔ بڑی طاقتوں کے محکوم نہ بنے رہیں اور جن ملکوں کو ابھی تک آزادی کی نعمت نہیں ملی یا وہ پس ماندہ ہیں، ان کی دست گیری اور امداد میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔

اس کانفرنس کا جو پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یہ ہے کہ اگرچہ ماضی میں مختلف ملکوں کو بعض بڑی طاقتوں سے تکلیفیں پہنچ چکی تھیں، لیکن کسی کے خلاف رنج و ملال کا اظہار نہ کیا گیا۔ سب یہی چاہتے تھے کہ تمام ملکوں اور قوموں کے درمیان محبت اور برادری کے رابطے استوار ہو جائیں۔ خواہ وہ مشرق میں رہتی ہوں یا مغرب میں۔ جمہوریہ انڈونیشیا کے محترم صدر نے کانفرنس کے اختتام پر جو تقریر کی، اس میں اس عظیم الشان اجتماع کے نصب العین کا نقشہ نہایت اچھے انداز میں پیش کر دیا۔ موصوف نے فرمایا:۔

"ہمیں ماضی کے متعلق اپنے دلوں میں تلخی نہ لانی چاہیئے، بلکہ مستقبل پر نظریں جمانی چاہئیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ خدائے پاک کی نعمتوں میں سے زندگی اور آزادی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ ہم پر واضح رہنا چاہیئے کہ جب تک قومیں یا ان کے کچھ حصے آزادی سے محروم ہیں، پورے عالمِ انسانیت کی عزّت و حُرمت میں کمی رہے گی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان کا بلند ترین نصب العین یہ ہے کہ اپنے ہم جنسوں کو خوف اور ملال کی زنجیروں سے نجات دلائے، یعنی ان جسمانی، رُوحانی اور ذہنی بندھنوں کو توڑے، جن کے باعث عالمِ انسانیت کی بہت بڑی اکثریت طویل مدّت سے پُوری نشو و نما حاصل نہیں کر سکی۔ بھائیو اور بہنو، ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم ایشیائیوں اور افریقیوں کا متحد ہو جانا لازم ہے"

اِنسان دُوسرے جہانوں کا رُخ کرتا ہے!



زمین اپنے پُورے پھیلاؤ کے باوجود انسان کے لیے تنگ ہو رہی ہے۔ اُس نے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کیں، سمندر کھنگال ڈالے، برفستانوں میں گشت لگائے اور اب وہ دُوسرے جہانوں کا رُخ کر رہا ہے۔ ایٹم کا راز معلُوم ہُوا تو قوت کا ایک نیا خزانہ ہاتھ لگا۔ لہٰذا اب ایٹمی راکٹ تیار کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔

جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے، ہوائی جہاز صرف ہوا میں کام دے سکتا ہے اور ہوا زمین سے دس میل کی بلندی پر ہی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔ وہاں ہوائی جہاز کے پر بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ وہاں سے خلا کے دروازے کُھل جاتے ہیں جس میں سفر کرنے کا بہترین ذریعہ راکٹ ہے۔

راکٹ کہنے کو تو پُرانی ایجاد ہے لیکن اُس کے لیے نئے ایندھن دریافت کرنے اور اُس کی رفتار بڑھانے کا کام موجودہ صدی میں شُروع ہُوا۔ پہلے رُوس کے ایک سائنس داں نے اُس کے متعلق ایک کتاب لکھی۔ پھر آسٹریا، جرمنی، برطانیہ، فرانس، امریکہ اور دُوسرے مُلکوں کے سائنس دانوں نے تجربے کیے۔ جگہ جگہ سوسائٹیاں اور ادارے بھی بن گئے۔ بالآخر امریکہ میں دُنیا کا سب سے بڑا اور سب سے طاقت ور راکٹ "سیٹرن پنجم" بنایا گیا، جس نے انسان کو چاند پر پہنچا دیا۔

خلائی سفر یُوں تو بڑا ولولہ انگیز معلُوم ہوتا ہے، لیکن اس میں بعض سخت دُشواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ پہلی مشکل تو یہ ہے کہ راکٹ میں اتنی قوت پیدا کی جائے جس سے وہ زمین کے دائرۂ کشش سے باہر نِکل جائے۔ صرف اُسی صُورت میں وہ کسی دُوسرے جہان کا رُخ کر سکتا ہے۔

ایک جرمن سائنس داں نے ثابت کیا کہ اگر کوئی راکٹ زمین سے سات میل فی سیکنڈ یا تقریباً پچیس ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرے تو کششِ ثقل کو شکست دے کر کسی دُوسرے جہان پر جا سکتا ہے۔ "سیٹرن پنجم" نامی راکٹ نے یہ ممکن کر دکھایا اور یوں انسان کی قدیم خواہش پُوری ہُوئی اور وہ چاند پر پہنچا۔

چونکہ خلا میں وہ فضائی دباؤ باقی نہیں رہتا، جس کے ہم زمین پر عادی ہیں اور نہ وہاں سانس لینے کے لیے آکسیجن گیس ہی موجود ہے، اس لیے سائنس دانوں نے خلائی مُسافروں کے لیے خاص طرز کا ایک لباس بنایا، جسے "پریشر سُوٹ" کہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ آکسیجن گیس کی بوتلیں لگائیں۔ اس

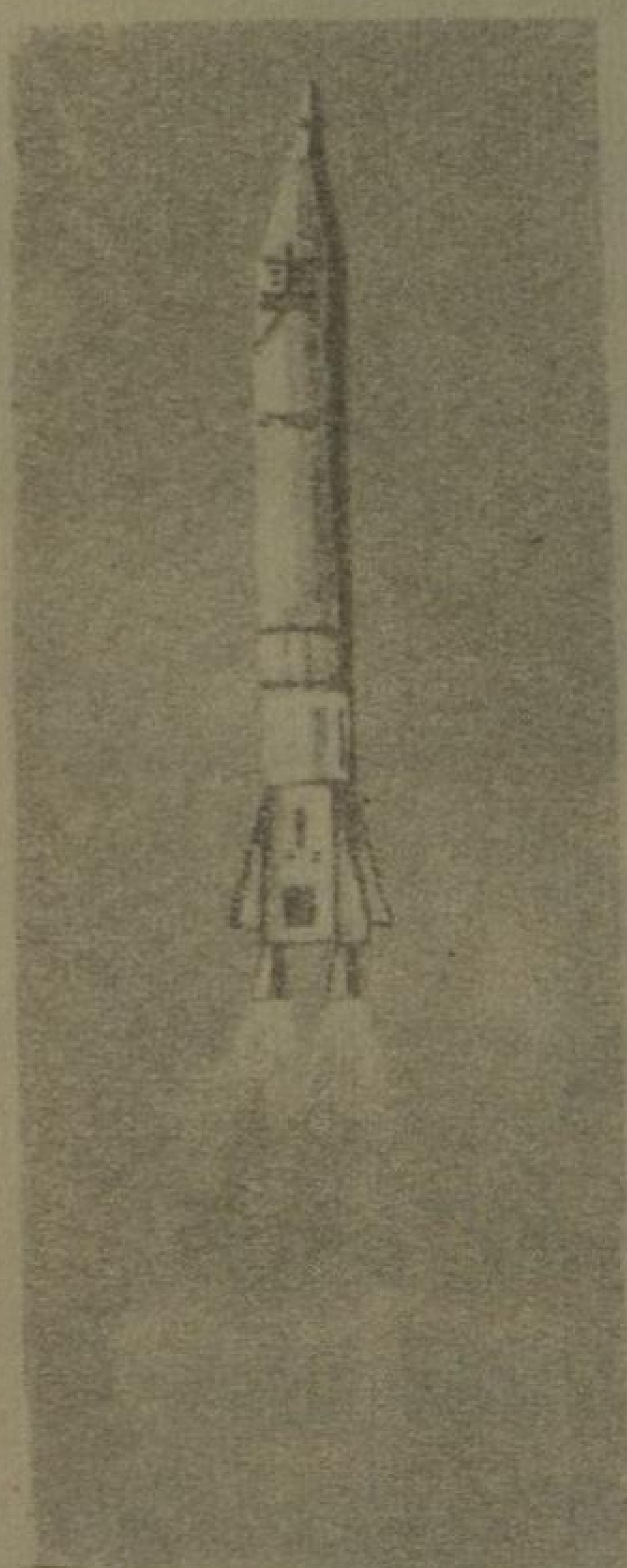
طرح یہ دُشواری بھی دُور ہوگئی۔

خلا میں ایک اور خطرہ شہابیوں سے لاحق رہتا ہے جو دن رات ہر وقت ہماری زمین پر گرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شہاب خلائی جہاز سے ٹکرا جائے تو تباہی یقینی ہے۔ لیکن سائنس دانوں نے یہ خطرہ مول لیا اور وہ بچتے بچاتے چاند پر پہنچ ہی گئے۔

انسان کی اس عظیم کامیابی میں مصنوعی سیّاروں کا بڑا حصّہ ہے جنھوں نے ہمیں خلا کے متعلق نہایت مفید معلومات مہیا کیں۔ سب سے پہلے رُوسی سائنس دانوں نے ۴ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو ایک سیّارہ چھوڑا جو "سپُوتنک" کے نام سے مشہور ہُوا۔ اس کے بعد رُوس اور امریکہ دونوں ملکوں نے بہت سے سیّارے چھوڑے اور بہت سے راکٹ خلا میں بھیجے۔ جانباز لوگوں نے بلند پروازی اور خلا میں زیادہ سے زیادہ مدّت تک ٹھہرنے کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ خود کار آلات نے چاند اور دُوسرے سیّاروں کے متعلق مُفید معلومات فراہم کیں۔

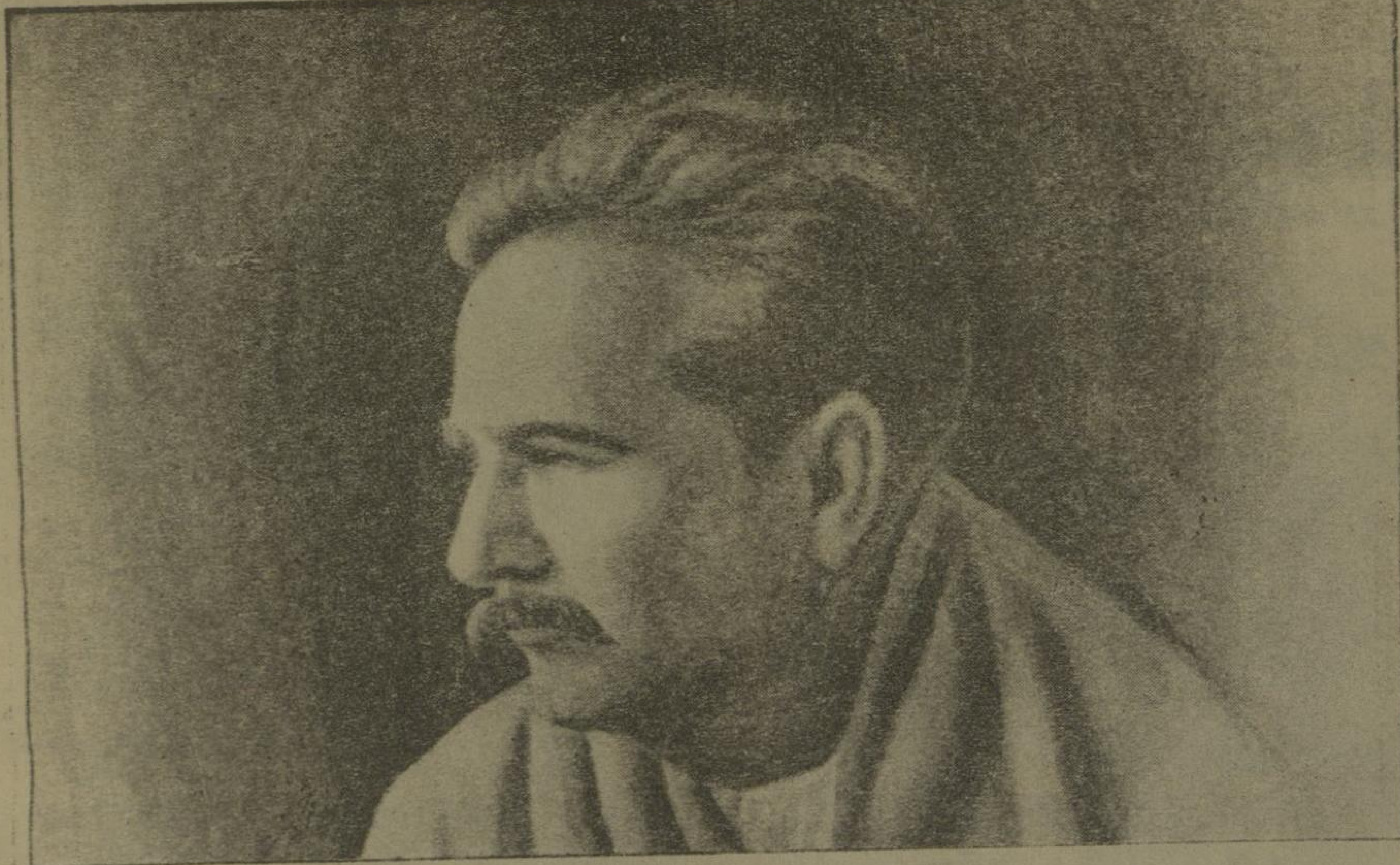
جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ راکٹ انسان کو چاند کی سیر کرا سکتا ہے، تو تین امریکی خلا باز نیل آرمسٹرانگ، مائیکل کولنز اور ایڈون ایلڈرین ۱۶ر جولائی ۱۹۶۹ء کو اپالو۔۱۱ نامی منصُوبے کے تحت چاند کی طرف روانہ ہُوئے۔ ۲۱ر جولائی کو دو خلا باز چاند پر اُترے اور وہاں سے کچھ قمری نمونے اور تصویریں لے کر زمین پر واپس آگئے۔

اِسی طرح اپالو۔۱۲ منصوبے کے تحت تین اور خلا باز چند ماہ بعد چاند کی طرف گئے اور اس کے کچھ اور نمونے لے کر زمین پر واپس آگئے۔ اپالو منصوبے کے تحت چاند کے ایسے ہی اور سفر بھی کیے جائیں گے۔ اس کے بعد مرّیخ اور زُہرہ ہماری منزل بنیں گے۔



نظامِ شمسی میں یہ دونوں سیّارے ہمارے پڑوسی ہیں۔ میری نر اور دُوسرے خلائی جہازوں کے ذریعے سائنس دان اُن کے بہت سے حالات معلوم بھی کر چکے ہیں۔ نظامِ شمسی کی سیر کرنے کے بعد بہت ممکن ہے، انسان سیّاروں کے کسی اور نظام کا رُخ کرے۔





پاکستان کا نصب العین پیش ہوتا ہے

آل انڈیا مسلم لیگ کا جو اجلاس ۱۹۳۰ء میں بمقام الٰہ آباد ہوا، وہ اس وجہ سے ہمیشہ یاد رہنے والا اجلاس ہے، کہ اسی کے خطبۂ صدارت میں علامہ اقبالؒ نے پہلی مرتبہ ایک آزاد اسلامی ریاست کی صدا بلند کی تھی اور مسلمانوں کے سامنے ایک ایسا نصبُ العین پیش کیا تھا جسے پُورا کر لینے پر ان کے مستقبل کی کامیابی موقوف تھی۔ یقیناً اسی خطبے کو پاکستان کا بنیادی پتھر قرار دینا چاہیئے۔

اس زمانے میں ہندوستان کے حالات مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے بڑے ناخوشگوار اور حد درجہ تشویش ناک تھے۔ یہاں وہ نظام جاری تھا، جس میں مختلف قوموں کے لیے اپنے مخصوص نظریات کے مطابق آزادانہ نشوونما کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ جو قومیں تعداد میں تھوڑی تھیں ان کی آزادی خطرے میں پڑی ہوئی تھی۔

مسلمان اگرچہ ہر لحاظ سے ایک جُداگانہ قوم تھے لیکن پُورے ہندوستان میں وہ زیادہ سے زیادہ ایک چوتھائی تھے۔ ہندوستان متحد رہتا تو ایک چوتھائی آبادی کے لیے اپنی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کیا صُورت تھی۔ اُنھوں نے مقاصدِ آزادی کو پیش نظر رکھ کر اکثریت کے ساتھ سمجھوتے کی جتنی کوششیں کیں وہ سب ایک ایک کر کے ناکام ہو چُکی تھیں۔ وطن کی آزادی کا مطالبہ پیش تھا، جس کے لیے مُسلمان بیش بہا قربانیاں کر چُکے تھے۔ تاہم اگر مسلمانوں کی آزادی کا کوئی بندوبست نہ ہوتا تو کروڑوں مسلمانوں کا مستقبل ختم ہو جاتا اور دُنیا بھر میں اتنے مسلمان کہیں آباد نہ تھے، جتنے ہندوستان میں آباد تھے۔ صُورتِ حال ایسی تھی کہ نہ تو مسلمان آزادی سے بے پروا ہو سکتے تھے اور نہ جانتے بُوجھتے ہُوئے تباہی کے غار میں گر سکتے

تھے۔ اس نازک موقع پر تیں رہنمائی کی ضرورت تھی، اس پر سب کی آنکھیں جمی ہوئی تھیں۔ عین اس وقت خدا نے علامہ اقبالؒ کی زبان پر وہ کلمہ جاری کیا جو آگے چل کر یہاں کے مسلمانوں کی تقدیر کا فیصلہ بننے والا تھا۔

علامہ مرحوم نے خطبۂ صدارت میں حالات کا نقشہ بڑے ہی اچھے انداز میں پیش کیا۔ مسلمان لیڈر اس وقت تک اپنے قومی مسئلے کے حل کی جتنی تجویزیں پیش کر چکے تھے، علامہ نے ان سب کی تعریف کی ساتھ ہی فرمایا کہ جس حد تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو ان تجویزوں سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔

"میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد مملکت قائم کر دی جائے۔ ملک کو خود اختیاری حکومت زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمالی و مغربی ہند میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقے کے مسلمانوں کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے"۔

پھر فرمایا:۔

"ہندوستان دُنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صُورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ مِل جائے۔ مسلمانانِ ہند کے زندہ اور جاندار طبقے میں.... اگر یُوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو اس طرح نہ صرف ہندوستان بلکہ پُورے ایشیا کی گتھیاں سُلجھ جائیں گی"۔

اُس زمانے میں مختلف لوگوں نے سمجھا کہ یہ ایک شاعر کا خواب ہے اور مسلمان اکابر اکثریت کے ساتھ سمجھوتے کی کوششوں میں برابر لگے رہے۔ لیکن آخر سب کو اسی نقطے پر آنا پڑا، جہاں علامہ اقبالؒ ۱۹۳۰ء میں پہنچ چکے تھے اور جسے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تقدیر قرار دے چکے تھے۔ دس سال بعد علامہ مرحوم ہی کی صدائے حق مسلمانوں کی قومی زندگی کا ترانہ بن گئی۔



انسان کوہِ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچتا ہے

انسان نے جب سے رُوئے زمین پر قدم رکھا ہے، وہ کائنات کی تسخیر میں لگا ہُوا ہے۔ اس نے خدا کی دی ہوئی عقل و ہمت سے کام لے کر جو عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے وہ انسانیت کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہیں۔ اس نے سمندروں کے سینے چیرے، پہاڑوں کی دیواریں پھاندیں، چھان بین کی مشعل لے کر برفستانوں میں پہنچا، زمان و مکان کی حدیں ختم کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اب اس کی نظریں خلا کی بلندی پر جمی ہوئی ہیں۔ غرض تسخیر کائنات کا سلسلہ جاری ہے اور جب تک قدرت نے اسے زندگی کی مہلت عطا کر رکھی ہے، یہ سلسلہ بدستور جاری رہے گا

ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی "ایورسٹ" دُنیا کی سب سے بلند چوٹی ہے۔ اگر اسے زمین پر پھیلا دیا جائے تو لمبائی میں پانچ میل سے زیادہ جگہ گھیرے گی۔ اس چوٹی پر پہنچنے کے لیے ۱۹۲۱ء سے مہموں کا آغاز ہُوا۔ ہر مہم میں قیمتی معلومات حاصل ہوتی رہیں۔ مئی ۱۹۲۲ء میں انسانی قدم پچیس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ گئے تھے مگر آگے سفر جاری نہ رہ سکا۔ کچھ دیر ستانے کے بعد پھر بعض من چلے لوگ اس عزم کے ساتھ روانہ ہُوئے کہ وہ چوٹی پر پہنچ کر دم لیں گے۔ وہ ستائیس ہزار فٹ پر پہنچ کر رُک گئے۔ آخر انھیں بھی لَوٹنا پڑا۔ واپسی کے سفر میں کچھ جانیں بھی تحقیقات کی نذر ہو گئیں۔ ایورسٹ کی سنسان خاموشی میں انسانی قدموں کی جو ہلکی سی آہٹ سُنی گئی تھی وہ آنسوؤں پر ختم ہو گئی۔

۱۹۲۴ء میں پھر ایک مہم تیار ہوئی۔ اس مہم

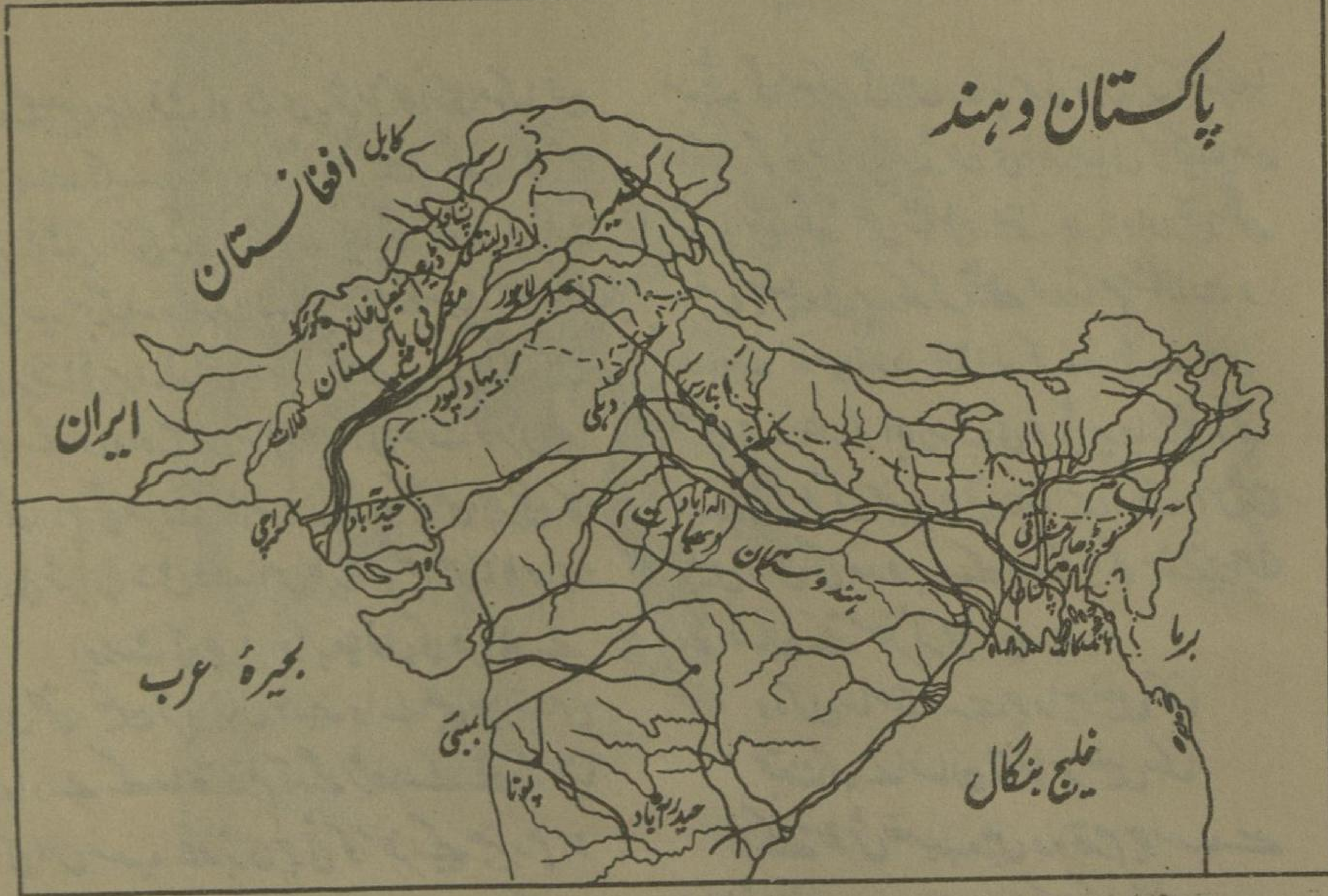
نے چھبیس ہزار فٹ کی بلندی پر پڑاؤ کا انتظام کیا۔ ان میں سے ایک روز دو بہادر اُوپر چڑھنے لگے اور اٹھائیس ہزار فٹ پر پہنچ گئے۔ یکایک ایک کا گلا کھر کے باعث خراب ہوگیا۔ دوسرا رات کو بھلا چنگا سویا، صبح اٹھا تو برفستانی ہوا نے اس کی بینائی چھین لی۔ وہ لوگ واپس ہوئے تو دو اور آدمی منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہو گئے۔ چوٹی صرف آٹھ سو فٹ دُور رہ گئی تھی، پھر اُن کا کوئی سُراغ نہ مل سکا۔ اس طرح یہ مہم بھی ناکام رہی۔

ایورسٹ کی چوٹی برابر جانوں کی قُربانی لے رہی تھی، لیکن قربانیاں دینے والے بھی ہر مرتبہ اس ارادے کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے تھے کہ دُنیا کی اس سب سے بڑی چوٹی کو مسخر کیے بغیر دم نہ لیں گے۔ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۶ء میں اور اس کے بعد بھی کئی مہمیں ایورسٹ کو فتح کرنے کے لیے گئیں۔ آخر ۱۹۵۳ء میں ایک مہم کرنل سر جان ہنٹ[1] کی سرکردگی میں روانہ ہوئی، جس میں آسٹریلیا کا ایک کوہ پیما ایڈمنڈ ہلاری[2] اور نیپال کا ایک بہادر شرپا تن سنگھ[3] بھی شامل تھے۔ ہلاری اور تن سنگھ جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر نکلے اور تمام مشکلات و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے ۲۹ر مئی ۱۹۵۳ء کو ایورسٹ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ کچھ دیر وہاں گزار کر بخیر و عافیت واپس آگئے۔ اس طرح بتیس سال کی جد و جہد کے بعد دُنیا کی بلند ترین چوٹی کو انسان نے مسخر کر لیا۔ سچ ہے:

وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

کتنے خوش نصیب ہیں وہ قدم جو سب سے پہلے دُنیا کی سب سے بلند پہاڑی کی چوٹی پر پہنچے، اور کتنے باہمّت ہیں وہ انسان جنھوں نے سب سے پہلے اس کی فضا میں سانس لیا۔

۱- Sir John Hunt ۲- Edmund Hillary ۳- Sherpa Tansing



ہندوستان آزاد ہوتا ہے

ہندوستان پر انگریزی حکومت کا آغاز ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی سے ہوا اور قریباً نوّے سال میں پورا ملک انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ ان کی کامیابی کا خاص راز یہ تھا کہ وہ دیسی حکمرانوں کے پردے میں قدم آگے بڑھاتے رہے۔ کبھی انھیں آپس میں لڑا دیتے اور ایک کے طرف دار بن کر دوسرے کو ختم کرتے پھر اپنے ساتھی کو بے بس بنا کر رکھ دیتے۔ لیکن اسی زمانے سے جوانمردوں نے انگریزی حکومت کے خلاف کوششیں شروع کر دی تھیں۔ میر قاسم، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے کارنامے سب پر آشکارا ہیں۔

جب فرمانرواؤں کے دلوں میں جہادِ آزادی کا جوش و ولولہ سرد پڑ گیا تو عوام نے قدم آگے بڑھایا۔ اس سلسلے میں سید احمد شہید اور ان کے رفیقوں نے جو قربانیاں کیں وہ ہماری تاریخ کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ ہزاروں نے لڑتے ہوئے شہادت پائی، بے شمار لوگوں نے قیدیں کاٹیں، جائدادیں ضبط کرائیں، انڈیمان کے سنسان جزیرے میں زندگی کے دن پورے کیے، لیکن جب تک انگریز ہندوستان سے نکل نہ گئے، سید صاحب کی جماعت بڑی تھی یا چھوٹی، ہندوستان کے اندر اور باہر آزادی کے لیے سرگرم عمل رہی۔

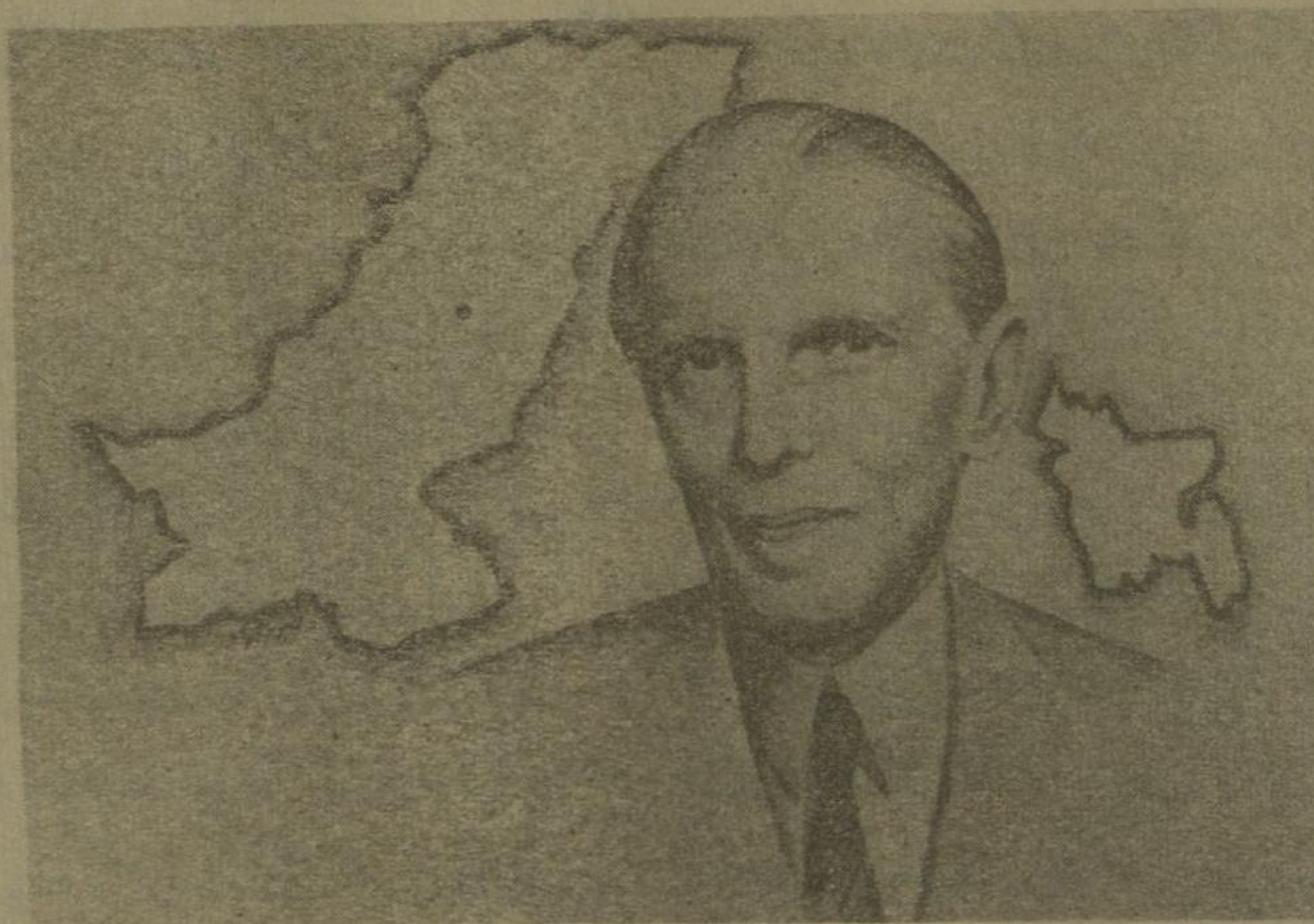
۱۸۵۷ء کا جہاد بھی آزادی ہی کے لیے تھا، جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے بڑی سرگرمی سے حصّہ لیا، اگرچہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کے انجام پر انگریزوں کا عتاب بھی سب سے بڑھ کر مسلمانوں پر ہی نازل ہوا اور انھیں جو جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا، اس

کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔ مسلمان ایک ہزار سال یہاں حکمران رہ چکے تھے۔ کیا ان کے پاس بڑی بڑی جائدادیں اور بیش قیمت سرمائے نہ تھے؟ وہ کہاں گئے؟ اس دولت کو کون کھا گیا؟ اپنے مال کو کوئی بھی ریت کے ذرّوں کی طرح نہیں بکھیرتا، لیکن مسلمانوں کے کانوں میں جب وطن کو آزاد کرانے کی صدا پہنچی تو وہ ہر چیز سے بے پروا ہو کر ادائے فرض کے لیے میدان عمل میں نکل آئے، یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ بحیثیت قوم ہندوستان میں سب سے زیادہ مفلس رہ گئے۔ ان کی قربانیاں ملک کی آزادی کے لیے تھیں۔

۱۸۸۵ء میں کانگرس کی بنیاد رکھی گئی جس نے آخری دَور میں ملکی آزادی کے لیے بہت کام کیا، لیکن جب تک مسلمان میدان عمل میں نہ آئے کانگرس کی حیثیت ایک بے روح جسد کے سوا کچھ نہ تھی۔ وہ پینتیس سال تک محض قرار دادیں منظور کرتی رہی۔ ۱۹۱۹ء میں ترکِ موالات کی تحریک جاری ہوئی اور مسلمانوں کا جوشِ جہاد بروئے کار آیا تو کانگرس ملک کی سب سے بڑی اور طاقتور عوامی جماعت بن گئی۔ اگرچہ مسلمان ملک کی کل آبادی کی صرف ایک چوتھائی تھے، لیکن خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں میں جو لوگ قید ہوئے ان میں سے اسّی فیصد مسلمان تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں آزادی کے لیے قربانیوں کا ولولہ کتنا زیادہ تھا۔

ترکِ موالات کے بعد بھی تحریکِ آزادی کے راستے میں کئی نشیب و فراز آئے، مد و جزر کی کئی حالتیں اس پر طاری ہوئیں، لیکن کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ انگریز آہستہ آہستہ اختیارات چھوڑتے گئے اور ملکی مطالبے میں زیادہ سے زیادہ قوّت پیدا ہوتی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ بدیسی حکومت فقط ایک ہوّا ہوتی ہے۔ یہ ہوّا دلوں پر مسلّط رہتا ہے تو کسی کو اُٹھنے کا خیال بھی نہیں آتا۔ وہم زائل ہو جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیند سے یکایک آنکھیں کھُل گئیں۔ جب آنکھیں کھُل جائیں تو انھیں کسی تدبیر سے بھی دوبارہ بند نہیں کیا جا سکتا۔

آخر انگریزوں کو مستقبل کے متعلق ایک واضح فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ جانتے تھے کہ کروڑوں کی آبادی پر کوئی بھی پہرے نہیں بٹھا سکتا۔ اُٹھے ہوئے طوفانِ آزادی کو روک دینا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ انھوں نے آزادی کی تاریخ مقرر کر دی اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اس طرح دو آزاد ملک، پاکستان اور بھارت وجود میں آئے۔ یہ مسرّت و شادمانی کا نادر موقع تھا، مگر افسوس کہ آخری دَور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے معاملات کا تصفیہ نہ ہونے کے باعث سخت ناخوشگوار حالات پیدا ہو گئے اور مسرّت و شادمانی کی صبح کا دامن آگ اور خون کے دھبّوں سے داغدار ہو گیا۔



سب سے بڑا اِسلامی مُلک وجُود میں آتا ہے

پاکستان کی تحریک مسلم لیگ کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ مسلم لیگ کی بنیاد ۱۹۰۶ء میں رکھی گئی تھی۔ اس کی زندگی کے تین دَور ہیں۔ پہلے دَور میں وہ مسلمانوں کی جُداگانہ قومی ہستی منوانے کے لیے کوشاں رہی اور مسلمانوں کے لیے جُداگانہ انتخاب منظور کرایا۔ اسی بنا پر ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک سمجھوتہ ہُوا جو "میثاقِ لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہے۔

دُوسرے دَور میں مسلم لیگ کی کوشش یہ رہی کہ کانگرس کے ساتھ ایسا سمجھوتا ہو جائے جس میں مسلمانوں کے جُداگانہ قومی حقوق کے لیے کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ اس سمجھوتے سے بالکل ناامیدی ہوگئی تو مسلم لیگ نے قائداعظم کی سرکردگی میں آزاد اسلامی حکومت کا نعرہ بلند کیا اور وہ اپنی زندگی کے تیسرے دَور میں داخل ہوگئی۔

آزاد حکومت کی قرارداد مسلم لیگ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس لاہور میں منظور کی تھی۔ اس وقت سے اسلامی سیاست کا رُخ بدلا اور مسلمانوں نے ملی جلی حکومت بنانے کا خیال ترک کر کے اپنی الگ مستقل حکومت کے لیے جدوجہد شروع کی۔

مسلمانوں کو ایک روشن نصب العین مل گیا تھا۔ قائداعظم تحریک کے علمدار تھے جن کے خلوص، تدبر اور عزم و ہمت کی اس ملک کا ذرہ ذرہ گواہی دے رہا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں انگریزوں کو بھی یقین ہوگیا کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ مسلمانوں کو مطمئن کیے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔ یہ تحریک پاکستان کی کامیابی کا پہلا سنگِ میل تھا۔

اب حکومت اور کانگرس کی طرف سے یہ کوششیں ہونے لگیں کہ کسی طرح مسلم لیگ کو راضی کر کے تقسیم

کو روکا جائے۔ مسلمانوں کی طرف سے تنہا قائدِ اعظم ترجمانی فرما رہے تھے۔ انھوں نے ہر موقع پر یہی کہا کہ مسلمان کسی طبقے کا کوئی حق چھیننا نہیں چاہتے۔ انھیں خدا نے ایک مستقل قوم کی حیثیت عطا کی ہے۔ اس حیثیت کو تسلیم کرو، ملک کو دو حصّوں میں بانٹ دو، ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور دوسرے میں غیر مسلموں کی۔ دونوں حصّوں کی اقلیتوں کے تمام حقوق پُوری طرح محفوظ ہو جانے چاہییں۔

آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ ملک بھر کی قانون ساز مجلسوں کے انتخابات نئے سرے سے ہوں اور جو نمایندے چُنے جائیں، اُن کی مرضی کے مطابق ملک کے آیندہ نظام کا فیصلہ کر دیا جائے۔ انتخابات کا مقصد یہ تھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے اثر و اقتدار کی حقیقی حیثیت واضح ہو جائے۔ ۱۹۴۶ء میں انتخابات ہُوئے۔ مسلمانوں کی بہت زیادہ نشستیں لیگ کے قبضے میں آگئیں اور غیر مسلموں کی اکثر نشستوں پر کانگرس قابض ہو گئی۔ ان میں سے دس فیصد نمائندے دستور ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہونے تھے۔ غیر مسلموں کی کل نشستیں دو سو دس تھیں، جن میں سے دو سو ایک کانگرس کو ملیں۔ مسلمانوں کی کل نشستیں اٹھتر تھیں، ان میں سے تہتر لیگ کے حصّے میں آئیں۔ یہ اس حقیقت کا آخری ثبوت تھا کہ ملک کے مستقبل کا فیصلہ صرف لیگ اور کانگرس کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ تیسری کسی جماعت کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا جا سکتا۔

جب واضح ہو گیا کہ مسلم لیگ تقسیم ملک کے سوا راضی نہ ہو گی تو مخالفوں نے یہ فتنہ اُٹھایا کہ پنجاب اور بنگال کے جن اضلاع میں غیر مسلموں کی تعداد زیادہ ہے انھیں الگ کر کے ہندوستان میں شامل کر دیا جائے۔ حکومت نے یہ مطالبہ مان لیا۔ دراصل وہ تقسیم کو روکنا چاہتی تھی۔ اب مسلم لیگ کے سامنے دو راستے تھے: ایک یہ کہ تقسیم کا مطالبہ چھوڑ کر ملی جُلی حکومت بنانے پر راضی ہو جائے۔ دُوسرا یہ کہ جتنے اسلامی خطّے کو آزاد کرایا جا سکتا تھا، آزاد کرا لیا جائے۔ لیگ نے غور و فکر کے بعد دُوسرا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس کے مطابق ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو ملک کی تقسیم کے متعلق حکومت کا اعلان جاری ہو گیا۔

۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو انگریزی حکومت کا دور ختم ہو گیا اور متحدہ ہندوستان کی جگہ دو آزاد حکومتیں وجود میں آگئیں، ایک پاکستان، دوسری ہندوستان۔ حد بندی کے کمیشن نے ۱۷ راگست کو اپنا فیصلہ سُنایا اور کم از کم ایسی سات تحصیلیں ہندوستان کے حوالے کر دیں جن میں مسلمانوں کی تعداد سب قوموں سے زیادہ تھی اور ان کی حدیں مغربی پاکستان سے ملی ہوئی تھیں۔ اس غلط فیصلے اور بعض مفسد گروہوں کی فتنہ انگیزی سے قتل و غارت کا ایک ایسا افسوس ناک دَور شروع ہو گیا جس نے آزادی کی شادمانیوں کو آنسوؤں اور آہوں میں تبدیل کر دیا۔ لاکھوں انسانوں کو ان کے آبائی وطن سے اُٹھا کر پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا، تاکہ اس نئی حکومت کی مشکلات زیادہ سے زیادہ بڑھ جائیں۔ اس غم نے قائدِ اعظم کی صحت برباد کر دی، تاہم جو قدم اٹھ چکا تھا، اس کا پیچھے ہٹنا غیر ممکن تھا۔ قائدِ اعظم کی ہمت اور عام پاکستانیوں کے صبر و استقامت سے تمام مشکلوں پر قابو پا لیا گیا اور وہ جمہوری ریاست ایک روشن حقیقت بن گئی جو اس دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت ہے۔



اِنڈونیشیا خُود مُختار ہوتا ہے

انڈونیشیا کا پہلا نام جزائر شرق الہند تھا، اس لیے کہ یہ کم و بیش تین ہزار چھوٹے بڑے جزیروں کا مجموعہ ہے جو ہندوستان کے جنوب مشرق میں واقع ہیں۔ یہ علاقہ کم و بیش تین ہزار میل لمبا، ایک ہزار تین سو میل چوڑا ہے۔ رقبہ سات لاکھ نوّے ہزار میل کے قریب اور آبادی آٹھ کروڑ سے اُوپر ہے۔ جاوا، سماٹرا اور بورنیو بڑے بڑے جزیرے ہیں۔ انڈونیشیا کی زمین بڑی زرخیز اور کھیتی باڑی کے لیے بہت موزوں ہے۔ گنّا یہاں بکثرت پیدا ہوتا ہے اور کھانڈ بہت بنتی ہے، یہاں تک کہ ایک زمانے میں عام لوگوں نے یہاں کی کھانڈ کا نام ہی جاوا رکھ دیا تھا۔ معدنیات سے بھی یہ ملک مالا مال ہے اور مسالوں کے لیے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ ابتدا میں ہندوستان اور ملایا سے لوگ آ کر ان جزیروں میں آباد ہوتے رہے۔ اسلام کا ظہور ہوا تو عرب تاجروں نے جگہ جگہ تجارتی کوٹھیاں بنالیں۔ ان کے ذریعے اسلام کی تبلیغ ہوئی اور بہت بڑی آبادی مسلمان ہوگئی۔

یورپی قوموں میں سے پہلے پہل پرتگیز مسالوں کی تجارت کے لیے انڈونیشیا پہنچے پھر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پُوری تجارت سنبھال لی اور وہ انڈونیشیا پر قابض ہوگئی۔ ۱۷۹۸ء میں کمپنی ٹُوٹی تو ہالینڈ کی حکومت نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۹۴۲ء تک ولندیزی یہاں حکمران رہے ویسے برائے نام ان کی حکمرانی کا سلسلہ ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔

آزادی کی تحریک تو ملک میں پہلے سے موجُود تھی۔ دوسری جنگ عالمگیر میں جرمنی ہالینڈ پر قابض ہو گیا اور ملکۂ ہالینڈ، انگلستان جا بیٹھی تو اس نے ۷ دسمبر ۱۹۴۲ء کو اعلان کر دیا کہ آیندہ کے لیے ہالینڈ کے تمام مقبوضہ علاقوں کو وہی درجہ حاصل ہوگا جو ہالینڈ کو حاصل ہے۔ اس طرح انڈونیشیا

کی سیاسی آزادی تسلیم کر لی گئی۔ جب جاپان نے شرق الہند کے بڑے جزیروں پر قبضہ جما لیا تو اس نے یہاں کے لوگوں میں ہتھیار تقسیم کر دیے اور آزادی کا یقین بھی دلا دیا۔ مقصود یہ تھا کہ وہ جاپان کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھائیں، بلکہ اس کے مقاصد کو ہر ممکن ذریعے سے تقویت پہنچاتے رہیں۔

جنگ کے خاتمے پر ملکہ ہالینڈ واپس وطن پہنچ گئی اور حکومت کا نقشہ نئے سرے سے درست ہوا تو حکومت ہالینڈ کی نیت بدل گئی، لیکن جو لوگ آزادی کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے اور اب لڑنے مرنے کو تیار تھے، اُنھیں دھوکا دینا آسان نہ تھا، لہٰذا ۱۹۴۶ء میں ہالینڈ اور اہل انڈونیشیا کے درمیان ایک سمجھوتا ہوا جس کے مطابق ۱۹۴۹ء تک انڈونیشیا میں متحدہ ریاستوں کا نظام جاری کر دینے کا فیصلہ ہو گیا۔ تاہم ہالینڈ کی کوشش یہ تھی کہ مختلف ٹکڑوں میں جداگانہ حکومتیں قائم کرا کے اُنھیں براہِ راست اپنے ساتھ وابستہ کر لے اور تمام علاقوں کو متحد نہ ہونے دے۔

مُدت تک گفتگو جاری رہی، لیکن فریقین کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۴۹ء کو ولندیزی فوجیں مختلف مرکزوں سے نکلیں اور ملک پر از سرِ نو قبضہ کر لینے کی مہم شروع ہوئی۔ انڈونیشیا کے طالبانِ آزادی بھی لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے، بارے یکم اگست کو انجمن اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی کہ دُنیا کا امن خطرے میں پڑ گیا ہے، اس لیے جنگ فوراً بند کی جائے۔ تین آدمیوں کی ایک کمیٹی ثالثی کے لیے مقرر کر دی گئی، جو بلجیم آسٹریلیا اور جمہوریہ امریکہ کے نمایندوں پر مشتمل تھی۔

۲۳ر اگست سے ۲ر نومبر ۱۹۴۹ء تک حکومت ہالینڈ اور اہل انڈونیشیا کے نمایندوں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ آخرکار فیصلہ ہو گیا اور ۲۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہالینڈ نے تمام اختیارات ریاست ہائے متحدہ انڈونیشیا کے حوالے کر دیے۔ یُوں آزادی کی مہم کامیابی کی منزل پر پہنچ گئی۔ پہلے نظامِ حکومت وفاقی رکھا گیا تھا، پھر اسے وحدانی بنا دیا گیا۔ ۱۴ر اگست ۱۹۵۰ء کو عارضی دستور منظور ہوا۔ ۲۸ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو انڈونیشیا انجمن اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔ اب جمہوریہ انڈونیشیا بھی برّاعظم ایشیا کی ایک بڑی جمہوریت ہے۔



دُنیا کو ساتواں برِّاعظم مِلتا ہے

جب ہم سنتے ہیں کہ امریکہ پندرھویں صدی میں دریافت ہُوا تھا تو سوچتے ہیں کہ نئے برِّاعظم کا نام لوگوں کے کانوں میں پہلے پہل پہنچا ہوگا تو ان کے دلوں کی کیفیت کیا ہوتی ہوگی، لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ خود ہماری آنکھوں کے سامنے ایک بہت بڑا برِّاعظم دریافت ہو رہا ہے یا کہیئے کہ اس کے حالات تاریکی سے روشنی میں آ رہے ہیں اور اس دریافت کے ساتھ ہمیں کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہوتی، حالانکہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دریافت دُنیا کے عام حالات پر کتنا گہرا اثر ڈالے گی۔

یہ ساتواں برِّاعظم وہ ہے جو قطب جنوبی کو گھیرے ہُوئے ہے۔ بیسویں صدی میں اس کی چھان بین کے لیے جو مہمیں بھیجی گئیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ برِّاعظم رقبے میں کم از کم پچاس لاکھ مربع میل ہوگا۔ یاد رہے کہ یورپ کا رقبہ صرف ساڑھے سینتیس لاکھ مربع میل ہے۔ گویا نیا برِّاعظم ایشیا، امریکہ اور افریقہ کے بعد رقبے میں چوتھے درجے پر ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے تمام حصّوں کا پتا لگایا جائے تو یہ پچاس لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ نکلے۔ ۱۹۴۷ء تک امریکہ نے اس کی صرف چار لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل زمینوں کا نقشہ تیار کیا تھا۔

اس پر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں میل تک برف ہی برف چلی جاتی ہے برف کے پہاڑ، برف کے دریا، برف کے سیکڑوں میل لمبے سلسلے اور برفستانی جانور، وہیل مچھلیاں، قطبی ریچھ، دریائی بچھڑے۔ قطب شمالی کی طرح یہاں بھی چھ مہینے کا دن ہوتا ہے اور چھ مہینے کی رات۔ جب دن ہوتا ہے تو افق پر ہلکی سی تاریکی نمودار ہوتی ہے کہ دن بیت گیا اور اب رات آنے والی ہے اور جب رات ہوتی ہے تو خفیف سی روشنی کی جھلک یہ بتا دیتی ہے کہ دن نکل آیا اور رات ختم ہوئی۔

اس برِّاعظم کی دریافت کا سلسلہ اٹھارھویں صدی ہی میں شروع ہو گیا تھا، لیکن باقاعدہ مہمیں ۱۹۰۱ء سے جانے لگیں۔ جنوری ۱۹۱۲ء میں اسکاٹ قطب جنوبی پر جا پہنچا، لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس سے پیشتر ناروے کا ایک من چلا آدمی وہاں اپنے ملک کا جھنڈا گاڑ چکا تھا۔ واپسی میں اسکاٹ اور اس کے ساتھی برفستانی ہواؤں ایسے پھنسے

کہ ایک رات کو خیموں میں لیٹے لیٹے ان کے جسم اکڑ گئے۔ اسی طرح اور لوگوں نے بھی علم و اکتشاف کی راہ میں جانیں دیں، مگر مہموں کا سلسلہ نہ رُکا۔ اب تو ایسے سامان ہاتھ آگئے ہیں کہ ان کی مدد سے بہت سی مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ مثلاً معلوم ہوا تھا کہ وہیلوں کی کھاڑی کا نقشہ بدل رہا ہے اور اس کا دہانہ کسی روز برف کے باعث بند ہو جائے گا۔ ۱۹۴۷ء میں امریکہ سے جو مہم گئی اس کے ساتھ برف کاٹنے والا جہاز بھی تھا جس کی مدد سے دہانے کی دونوں طرفوں سے برف کا بہت بڑا حصّہ کاٹ کر اسے چوڑا کر دیا گیا۔ برف کی یہ تہیں بیس فٹ سے پچاس فٹ تک موٹی تھیں۔ اس مہم نے یہ پتا بھی لگایا کہ پہلے جس مقام کو قطب جنوبی کا مرکزی نقطہ سمجھا گیا تھا، وہ صحیح نہ تھا۔ اصل نقطہ اس سے ڈیڑھ سو میل شمال مغرب میں ہے۔ اب بڑے بڑے ہوائی جہازوں سے بھی اِکتشاف میں مدد لی جارہی ہے۔

قطب شمالی اور قطب جنوبی میں بہت فرق ہے۔ مثلاً قطب شمال کے برفستانوں میں کم و بیش ایک لاکھ انسان رہتے ہیں۔ وہاں بہت سے جانور پائے جاتے ہیں اور ایسے جنگلات موجود ہیں، جن کی لکڑی بہت قیمتی ہوتی ہے۔ قطب جنوبی میں نہ ایسی کوئی آبادی ہے، نہ وہیل مچھلی اور دریائی بچھڑے یا ریچھ کے سوا کوئی جانور ہے اور نہ درخت ہیں۔ البتہ ایسے سلسلہ ہائے کوہ ضرور ملتے ہیں جن کی اونچائی پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار فٹ ہے۔ پہاڑ انھیں صرف اُونچائی کے سبب سے کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ پہاڑ نہ ہوں، محض برف کے تودے ہی ہوں۔

آج کل اس برّ اعظم کی چھان بین کے لیے بہت سی قوموں کے سائنسداں پہنچے ہُوئے ہیں اور مِل جُل کر کام کر رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ ضروری باتیں دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو عین ممکن ہے کہ قطب جنوبی کا برفستانی برّ اعظم بھی اسی طرح آہستہ آہستہ آباد ہو جائے جس طرح امریکہ، آسٹریلیا اور دُوسرے بے شمار جزیرے گزشتہ تین چار صدیوں میں آباد ہُوئے ہیں۔

سو بڑے آدمی

با تصویر

- محمد صلی اللہ علیہ وسلم
- ابراہیم علیہ السلام
- ارسطو
- افلاطون
- ابن خلدون
- ابوبکر صدیق رض
- البیرونی
- ابن بطوطہ
- امیر خسرو رح
- اکبر بادشاہ
- ابوالفضل
- اورنگ زیب
- الزبتھ (ملکہ)
- انیس
- ایڈیسن
- آئن سٹائن
- اقبال رح
- آئزن ہاور
- بدھ (مہاتما)
- بقراط
- بنجمن فرینکلن
- بو علی سینا
- ٹالسٹائی
- جون آف آرک
- جمال الدین افغانی
- چرچل
- حسین بن علی رض
- حافظ (خواجہ)
- خدیجۃ الکبریٰ رض
- خالد بن ولید رض
- داتا گنج بخش
- دانتے
- ڈارون
- رازی رح
- رومی رح
- ریمبراں
- روسو
- رائٹ برادران
- روزویلٹ
- رضا شاہ پہلوی
- زرتشت
- سکندرِ اعظم
- سقراط
- سعدی رح
- سید احمد خاں
- شارلیمین
- شیکسپیئر
- شیر شاہ سوری
- شاہ جہان
- شا۔ برنارڈ
- صلاح الدین ایوبی رح
- عیسیٰ علیہ السلام
- عمر رض
- عثمان رض
- علی رض
- عائشہ رض
- عمر بن عبدالعزیز رض
- عبدالرحمٰن الاوّل
- عبدالقادر جیلانی رح
- غزالی رح
- غالب
- فاطمہ کبریٰ رض
- فلورنس نائیٹنگیل
- فیریڈے
- قبلائی خاں
- کنفیوشس
- کولمبس
- کارنیگی
- گلیلیو
- گوئٹے
- لوتھر۔ مارٹن
- لیونارڈو۔ ڈونچی
- لوئی پاسچر
- لنکن
- لینن
- موسیٰ علیہ السلام
- معاویہ۔ امیر
- محمد بن قاسم رض
- مامون رشید
- محمد فاتح
- محمود غزنوی رح
- معین الدین چشتی رح
- مارکو پولو
- محمد علی (مولانا)
- مادام کیوری
- مصطفیٰ کمال
- محمد علی جناح
- نیرو
- نظام الدین اولیا رح
- نیوٹن
- نور جہاں
- نپولین بوناپارٹ
- والٹیر
- واشنگٹن
- ولیم کیکسٹن
- ولسن
- ویلز۔ ایچ۔ جی
- ہومر
- ہنی بال
- ہیوگو

بہ اشتراک

موسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن

لاہور ، نیویارک

فیروز سنز لمیٹڈ